دلّی اور طب یونانی

مصنف

حکیم سید ظل الرحمن

ادارہ مطبوعات سلیمانی

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

132440

ناشر	حافظ طلحہ وحید سلیمانی
مطبع	اے این اے پرنٹرز
طبع اول	(بھارت) ۱۹۹۵ء
طبع دوم	(پاکستان) اگست ۱۹۹۷ء
تعداد	۵۰۰

فہرست

چلم عبدالوحید سلیمانی ادارہ مطبوعات سلیمانی کو میں
اپنی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کے حقوق اشاعت
چلم حافظ طاہر محمود بٹ کے توسط سے دے رہا ہوں۔
پاکستان میں صرف وہی میری کتابوں کو شائع کرنے کے
مجاز ہیں۔ اگر کوئی اور ادارہ شائع کرے تو یہ
قانوناً اس ادارے کو گرفت کے مجاز ہیں۔

سید [illegible]

10.7.92

حرف آغاز

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں قایم اردو اکادمیوں میں دلّی کی اردو اکادمی اس لیے زیادہ ہی زیرِ بحث رہتی ہے کہ وہ دارالخلافہ دلّی میں سرگرم عمل ہے اور ایک طرح سے ایک ماڈل کے طور پر کام کرنے کی کوشش میں لگی ہے۔ اس اکادمی کا دائرہ کار خاصا متنوع اور وسیع ہے۔ اس کے بنیادی مقاصد میں دلّی شہر کی ادبی تاریخ کے احوال کو، اس کی ثقافتی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر میسر اور دستیاب تاریخی اور دستاویزی مواد کو مرتب کرنے اور اسے کتابی صورت میں محفوظ کرنے کی سرگرمی خاص طور سے شامل ہے۔

اردو اکادمی کا اپنا ایک انتظامی ڈھانچہ اور دستور بھی ہے۔ دلّی کے وزیرِ اعلیٰ اس کے چیرمین ہیں جو زبان و ادب میں اعتبار کے درجے کو پہنچے ہوئے اصحاب کو اکادمی کی گورننگ کونسل کے لیے دو سال کے لیے نامزد کرتے ہیں۔ انہی نامزد افراد پر مشتمل اکادمی کی مختلف کمیٹیاں ہیں جو متعلقہ امور کے بارے میں فیصلے کرتی ہیں۔

اکادمی دلّی کی ادبی، ثقافتی اور سماجی زندگی سے اپنی گہری دلچسپی کے ساتھ ساتھ ملک گیر زاویے سے بھی کام کرتی ہے اور اپنی مختلف سرگرمیوں میں پوری اُردو دُنیا اور تخلیق کاروں سے اپنا قریبی رشتہ اور تعلق قایم رکھتی ہے۔

کل ہند نوعیت کے مشاعرے، سیمینار، انعام و اعزاز اور 'ایوانِ اردو' اور 'اُمنگ' جیسے مقبول ماہ ناموں اور اہم عصری موضوعات پر کتابوں کی مسلسل اشاعت نے دلّی کی اُردو اکادمی کو زبان و ادب کی ترویج میں مصروف ایک بے حد فعال اور متحرک اکادمی بنا دیا ہے۔

● دلّی کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں اطبا کا ایک اہم کردار رہا ہے صحت مند اور بیماریوں سے پاک معاشرے کا خواب انسانی آنکھ کا دیکھا ہوا ایک پرانا خواب ہے جس کی تعبیر پانے کے لیے اس نے علاج معالجے کی دیکھی اَن دیکھی بے شمار راہیں اور مسافتیں طے کی ہیں۔ اس انسانی سفر میں جن کے قدموں نے رفاقتوں کا حق ادا کیا ان کے ذکر و فکر سے ہماری بہت سی کتابوں کے ورق خالی ہیں۔

وہ دن ہمارے حافظوں میں محفوظ ہیں جب اطباء وقت اپنے آراستہ مطب میں نبض دیکھنے، نسخے تجویز کرنے اور مریض کو بیماری سے نجات دلانے کے حیرت انگیز کارنامے انجام دیتے تھے طب ان کے لیے ذریعہ معاش نہیں تھی وہ ذریعہ عزت تھی. مریض کی نبض پر کسی حاذق طبیب کی انگلیوں کا رکھا جانا مرض سے نجات کی ضمانت بن جاتا تھا، بیماروں کو شفا بخشنے والے یہ اطباء ہماری سماجی اور تہذیبی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتے تھے کہ یہ اپنے عہد کے سب سے باعزت شہری بھی تھے. سماجی زندگی میں اُن کی مسیحائی زندگی کی ہر سطح پر قبول کی جاتی تھی اور انھیں عزت اور اعزاز کی مسندوں پر بٹھایا جاتا تھا کہ وہ سب بے لوث اور بے غرض ہوکر اپنے علم سے پورے معاشرے کو فیض پہونچاتے تھے.

دلی قدیم اور جدید زمانوں میں طب یونانی کا ایک اہم مرکز رہی ہے یہاں اپنے وقت کے سب سے معتبر اور مقبول اطباء عیسیٰ نفسی کرتے رہے ہیں. انھوں نے دلی کی تہذیبی زندگی میں اپنا ایک افسانوی کردار ادا کیا ہے. یہ پہلو بھی دلچسپ ہے کہ ہمارے ماضی قریب تک پڑھے لکھے گھرانوں اور طبقوں میں طب سے واقفیت بڑی حد تک شخصیت کا ایک حصہ تھی، غالب اس کی ایک اچھی مثال ہے. اطباء دلی کے تہذیبی زندگی میں ان کے افسانوی کردار کو بھی اس کتاب میں موضوع بنایا گیا ہے یہ کتاب نہ صرف دلی کے اہم طبی گھرانوں اور سلسلوں کا تفصیلی احاطہ کرتی ہے یہ حکیم محمد اجمل خاں شیدا دہلوی سے حکیم عبدالحمید دہلوی تک طب یونانی کے سفر اور اس میں ہونے والے تغیرات اور تجربات کا ذکر بھی کرتی ہے. طب یونانی کی یہ دونوں اپنے دور میں داستان بن جانے والی شخصیتیں اس کتاب کا خصوصی موضوع بھی ہیں. اس لیے بھی کہ مرحوم حکیم محمد اجمل خاں اور محترم حکیم عبدالحمید دہلوی نے طب یونانی کو نئے آفاق سے ہمکنار کیا. امراض اور ان کی تشخیص کے نئے باب لکھے. اکادمی اِن عہد ساز شخصیات کے کارناموں اور دلی اور طب یونانی کے گہرے تہذیبی رشتوں کی وضاحت کی خاطر یہ کتاب شائع کر رہی ہے. حکیم ظل الرحمن صاحب نے دلی اور طب یونانی جیسے وسیع موضوع کو بڑی تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے اور ایسے نوادر گوشے بھی سامنے آئے ہیں جن پر مزید لکھنے، بحث کرنے کی گنجائش ہے. بہر حال اردو اکادمی اپنی اس پیش کش کو دلی کے عہد ساز اطباء کے نام معنون کرتی ہے.

زبیر رضوی

تقدمہ

دلی کا شمار ہندوستان کے قدیم ترین اور تاریخی شہروں میں ہے۔ اسے ہمیشہ مرکزی مقام کا درجہ حاصل رہا ــــ پندرہ سو برس قبل مسیح راجہ جدھشٹر نے پانڈوں کی ایک بڑی سلطنت قایم کر کے جمنا کے مغربی کنارہ پر اپنی راجدھانی بنائی اور اس کا نام اندر پرست رکھا۔ جدھشٹر کا خاندان تیس پشت تک حکمراں رہا۔ اس کے بعد دوسرا خاندان نے پانچ سو برس حکومت کی۔ پھر گوتم بنسی برسر اقتدار آئے۔ بنسی خاندان کے ایک امیر سروپ دت نے اپنے راجہ دیلو (۳۲۸ ق م) کے نام پر دلی شہر بسایا۔ ۷۳۱ء میں تنوار خاندان کے اننگ پال اول نے دلی کی از سر نو تعمیر کی۔ آگے چل کر ۱۰۵۲ء میں اسی خاندان کے اننگ پال دوم نے پھر دلی کو آباد کیا۔ اور وہ شمالی ہندوستان کے ایک خاص علاقہ کی راجدھانی بنی رہی۔

۱۰۰۱ء سے ۱۱۹۱ء تک اگرچہ ہندوستان میں غزنی حکومت کا دور دورہ تھا۔ لیکن ہندوستان میں مسلم حکومت کا آغاز شہاب الدین غوری کے ہاتھوں ۱۱۹۱ء میں ہوا۔ اس کے بعد یہاں غلام خاندان کی پہلی باقاعدہ مسلم سلطنت قایم ہوئی۔ سلطان قطب الدین ایبک ۱۲۰۵ء میں سر برآرائے سلطنت ہوا اور دہلی پایہ تخت قرار پایا۔ مؤرخین اور سیاحوں کے بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگتی ہے کہ محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملہ کرنے کے وقت تک دلی کی بہت اہمیت نہ تھی۔ نئی قایم شدہ سلطنت نے نہ صرف دلی کو رونق و شادابی بخشی بلکہ ہندوستان کو فوجی اعتبار سے اس

قدرطاقتوراور تمدنی وتہذیبی لحاظ سے اس درجہ آراستہ کیاکہ اس زمانہ کے نہایت متمدن اور ترقی یافتہ ممالک میں اس کا شمار ہوا۔سلاطین نے مملکت کی سرحدوں ہی کو وسیع نہیں کیا۔ایک مہذب سیاسی نظام قائم کرنے پر توجہ دی۔ترقی کی نئی سمتیں تلاش کیں اور دوسرے ممالک بالخصوص وسط ایشیا اور جزیرۃ العرب سے سیاسی وتجارتی روابط کے ساتھ علمی وفنی رشتے بڑھائے۔

ہندوستان اور ممالک عربیہ کے تہذیبی،تمدنی اور تجارتی روابط کاسلسلہ زمانہ دراز سے قائم تھا۔ان کے تجارتی قافلوں کی ایک دوسرے ملک میں آزادانہ نقل وحرکت رہتی تھی۔ان کے ذریعہ علمی وفنی معلومات کے تبادلہ کا عمل بھی انجام پا تا تھا۔ظہوراسلام کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔مسلمانوں کی آمد یہاں پہلی صدی ہجری سے شروع ہوگئی تھی اور سندھ اور مالابار میں ان کی آبادیاں قائم ہوگئی تھی۔مسلم فاتحین کے ساتھ جو ہزاروں افراد یہاں آئے ان میں سے بہت سے اسی خاک کے ہو رہے۔ لیکن شہاب الدین غوری کے بعد جس کی مملکت کی سرحدیں آج کے ہندوستان سے کہیں زیادہ وسیع تھیں۔اس ملک سے مسلمانوں کے محبت وتعلق کے نئے رشتہ کی بنیادیں استوار ہوئیں۔مسلم حکومت تقریباً آٹھ سو برس قائم رہی۔یہ حکومت کسی ایک خاندان تک محدود نہیں تھی۔غلاموں کے بعد خلجی پھر تغلق، سید، لودھی اور آخر میں مغل حکمراں ہوئے ان سب کا پایہ تخت کم وبیش دہلی تھا۔ دلی نے سلطنتوں کے عروج وزوال کا جو نقشہ دیکھا ہے اور اس کو جو سیاسی اہمیت حاصل رہی ہے اس سے قطع نظر یہ شہر ارباب کمال اور مشاہیر علم وفن کا مسکن رہا ہے۔بڑے بڑے علما صوفیا اور اطبا کو اس سے نسبت ہے حکومت کے مستقر کے ساتھ تہذیب وتمدن کا آفتاب بھی وہاں ضوفشاں رہا۔اسی طرح علوم ومعارف نے ایسا فروغ پایا کہ پورا ملک ان کی ضیا باریوں سے منور ہوا۔سلاطین کے درباروں اور درس وتدریس کے اداروں کے علاوہ امرا کے دیوان خانے، علما کی مجلسیں،صوفیا کی خانقاہیں اور اطبا کے مطب علم وفن کی اشاعت کا مرکز تھے۔سائنسی طبی واسلامی علوم،شعر وادب اور تہذیب وتمدن کی جو گراں قدر

خدمات اس شہر میں انجام پائیں ان کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ممالک غیر کی توجہ کا وہ مرکز بنا دور دور سے شائقین علم اس شہر کا رخ کرتے اور یہاں کے باکمال اساتذہ کے دامن فیض سے مستفید ہوتے۔ اس کی تہذیبی اقدار کی منزلت کا یہ حال تھا کہ پورے ملک کے لیے وہ معیار اور نمونہ سمجھی جاتی تھیں۔ اور ایک عام آدمی سے لے کر ملک کے چھوٹے بڑے درباروں میں ان آداب کو تہذیب و شائستگی کے اعلیٰ معیار کے بطور برتا جاتا تھا۔

ابتدائی مغل حکمرانوں اکبر اور جہانگیر کا مستقر آگرہ رہا۔ دلی کی موجودہ حیثیت شاہ جہاں کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ ۹ محرم ۱۰۴۹/۱۶۳۹ء کو لال قلعہ کی بنیاد رکھی گئی۔ ۹ برس میں مکمل ہونے پر ۱۶۴۸ء میں شاہ جہاں نے اس میں جلوس کیا۔ شاہ جہاں آباد شہر کی بنا پڑی۔ میر یحییٰ کاشی نے "شد شاہ جہاں آباد از شاہ جہاں آباد" (۱۰۵۸ھ) سے تاریخ نکالی ہے شاہ جہاں آباد نام انگریزوں کی شروع عملداری ۱۸۰۳ء تک رہا اس کے بعد یہ دہلی کہلانے لگا۔

دہلی میں جن علوم و فنون نے فروغ پایا اور جن سے اس شہر کو خاص نسبت حاصل رہی ان میں بہت اہم علم طب ہے۔ اس شہر سے طب کی تاریخی کڑیاں مسلم سلطنت کے قیام کی ابتدا سے جڑی ہوئی ہیں۔ دہلی نے اس فن کی ترقی اور فروغ میں جہاں گہری دلچسپی دکھائی ہے وہاں حاملین طب یونانی نے شہر کی علمی و ثقافتی زندگی، شعری و ادبی روایت اور سیاسی و سماجی شعور کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے، جدوجہد آزادی اور پھر قومی تعمیر نو میں بھی ان کا بیش قدر حصہ ہے۔ شائستگی، نفاست، شریفانہ اطوار اور گنگا جمنی تہذیب کے جو نمونے انہوں نے پیش کئے ہیں وہ بہت انمول اور گراں مایہ ہیں۔

وہ نہ صرف فن طب کے ماہر اور اعلیٰ درجہ کے طبیب تھے بلکہ دوسرے علوم کے ماہر کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ مسلم تہذیب کا ایک بڑا امتیاز اس کا ایسا جامع نظام تعلیم ہے، جس کی تکمیل کے بعد جہاں ایک طرف سائنسی، طبی مضامین مثلاً علم ریاضی، علم ہندسہ، علم ہیئت، علم کیمیا، علم طب و تشریح کی معلومات حاصل ہوتی تھیں

وہاں منطق، فلسفہ، علم کلام کے ساتھ اسلامی علوم تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ میں مہارت پیدا ہوتی تھی۔ یہ نظام ایک اکائی اور وحدت کے تصور پر مبنی ہے۔ اس میں علوم کی ساری شاخیں مل جاتی ہیں۔ اس تہذیب کا ہر قابل ذکر عالم دیگر علوم میں بھی کافی دخل رکھتا تھا۔ دوسری اقوام کے ہاں علم کی تقسیم اس طرح ہے کہ ایک شاخ کا دوسری شاخ سے کوئی تعلق نہیں رہتا ہے اور ایک علم کے ماہر کی دوسرے علوم سے واقفیت نہیں ہوتی ہے۔ طب یونانی میں اس تہذیبی روایت کو آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے، اطبا جس طرح اور علوم میں امتیاز رکھتے تھے اسی طرح دوسرے علوم کی شخصیتیں طب سے کماحقہ واقف ہوتی تھیں طب کو اسلامی تہذیب کے اس مخصوص نظام فکر میں دیکھنے سے اس کا پورا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

دہلی کی خاک سے جو منتخب اور باکمال طبیب پیدا ہوئے انہوں نے نہ صرف ہندوستان میں طب کی عظمت و رفعت میں اضافہ کیا بلکہ ان سے عربی و ایرانی دور زریں کے اطبا کی یاد تازہ ہوئی، ان کے اثر کا دایرہ محض اس شہر تک محدود نہیں ہے ملک کے ہر گوشہ میں ان کے اثرات پھیلے ہوتے ہیں۔ شاہ جہاں آباد کے ابتدائی قیام سے لے کر مغلیہ عہد کے آخر زمانہ تک اور اس کے بعد برطانوی ہند اور آزاد ہندوستان میں بھی دار الخلافہ کو طب کی مرکزیت کا درجہ حاصل رہا۔ دلی اور طب یونانی کے تعلق سے سب سے اہم شریف خانی خاندان کے اطبا کا سلسلہ ہے۔ اس خاندان پر اب تک جو کام کیا گیا ہے۔ وہ زیادہ تر مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے اجداد کے تعارف کے طور پر انجام پایا ہے۔ اس کی حیثیت ایک طرح سے رسمی نام کی ہے۔ اس میں ان کے جد امجد حکیم واصل خاں حکیم اکمل خاں حکیم شریف خاں حکیم صادق علی خاں حکیم محمود خاں اور ان کے بھائی حکیم عبد المجید خاں اور حکیم واصل خاں شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی شخصیت یقینی طور پر بہت ممتاز ہے اور اپنے محاسن اور کمالات کی وجہ سے وہ اس کی بجا مستحق ہے۔ مسیح الملک کے تذکرہ نگاروں نے ان کی شاخ کے تعلق سے صرف انہی کے حالات بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ چنانچہ ان کی سوانح پر جو مستقل

کتابیں تصنیف کی گئی ہیں مثلاً حیات اجمل قاضی عبد الغفار، حیات اجمل شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں، تذکرہ مسیح الملک شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی، سیرت اجمل حکیم جمیل خاں، حکیم اجمل خاں کوثر چاند پوری، مآثر مسیح مولانا ابرار حسین فاروقی ان سب میں اجمل خاں کے اسلاف میں صرف ان لوگوں کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔

ان کتابوں میں حکیم شریف خاں سے اوپر کے لوگوں مثلاً حکیم فاضل خاں کے بھائی حکیم اجمل خاں اول جن کے شاخ میں حکیم بقا خاں، حکیم وفا خاں، حکیم لقا خاں، حکیم وارث علی خاں، حکیم حمزہ خاں، حکیم برکت علی خاں، حکیم احمد علی خاں جیسے صاحب مرتبت طبیب گزرے ہیں، جن کا رتبہ حذاقت، مسیحائی اور امارت و ریاست میں دوسری شاخوں سے کم نہیں ہے اور جنہوں نے شروع میں دہلی میں اور بعد میں گوالیار میں بڑی شہرت و ناموری حاصل کی، ان سے کسی واقفیت کا اظہار نہیں ملتا ہے اسی طرح حکیم اجمل خاں دوم یعنی حکیم شریف خاں کے چچا کی اولاد جس میں حکیم عادل خاں، حکیم مہدی خاں، حکیم مظفر حسین خاں، حکیم واصل خاں ثانی، حکیم عبداللطیف خاں، حکیم محمد عظیم خاں، حکیم محمد سلیم خاں جیسی شخصیتیں تھیں، ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا ہے یہ صورت حال بعد میں بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ حکیم شریف خاں کے بھائیوں مثلاً حکیم محمد اشرف خاں اور حکیم حسین بخش خاں کی شاخ کے طبیبوں حکیم خواجہ جان، حکیم آغا جان، حکیم قاسم جان، حکیم عبد الغفار، حکیم عاقل خاں، حکیم کامل خاں، حکیم حبیب اشعر، حکیم ہاشم جان کیفت یا حکیم مشرف خاں، حکیم منور خاں، حکیم ببر علی خاں، حکیم اسد علی مضطر، حکیم تجمل حسین، حکیم قایم حسین سے صرف نظر کیا گیا ہے۔ خود حکیم محمود خاں کے بھائیوں حکیم غلام محمد خاں اور حکیم غلام مرتضیٰ خاں کے خاندان کے طبیبوں حکیم غلام اللہ خاں، حکیم غلام نبی خاں حکیم عبد العزیز خاں حکیم غلام رضا خاں، حکیم احمد سعید خاں، حکیم عبد الغنی خاں، شفاء الملک خان بہادر حکیم عبدالرشید خاں، حکیم زکریا خاں، حکیم غلام کبیر خاں، حکیم عبد الرحیم خاں کے احوال سے بے اعتنائی برتی گئی ہے۔

حکیم شریف خاں کے اسلاف و اخلاف میں جو طبیب گزرے ہیں میرے مطالعہ

کی روشنی میں ان کی تعداد سوا سو سے تجاوز ہے۔ اور دہلی اور ہندوستان ہی نہیں دنیا کی کسی ملک کی طبی تاریخ ایسے بے مثل اور بے نظیر سلسلۃ الذہب کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں اس خاندان کے طبیبوں کا آج تک ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ دہلی کا یہ خاندان علم و دانش اور طب و حکمت کا خاندان ہے۔ اس گھرانہ میں جو نادر روزگار شخصیتیں پیدا ہوئیں اور جو کارہائے نمایاں ان سے انجام پائے بالخصوص ہندوستان میں طب یونانی کی ترویج و اشاعت اور اسے مقبول عام بنانے اور دہلی کو قدیم مراکز فن میں اعلیٰ درجہ عطا کرنے میں ان کا جو زبردست حصہ ہے وہ مستقل مطالعہ کا موضوع ہے۔ اس کتاب کے صفحات اس دودمان گرامی کی طبی خدمات کے تفصیلی احاطہ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اطبائے خاندان شریفی کے نام سے بہ عنوان ایک علیحدہ کتاب کا متقاضی ہے۔ مدرسہ طبیہ اور طبیہ کالج کی سو برس سے زیادہ عرصہ پر پھیلی ہوئی تاریخ اسی خاندان کے گرد گھومتی ہے۔ ان کی یادگار اس ادارہ سے جو لائق اساتذہ وابستہ رہے اور فروغ طب کے لیے انہوں نے جو کوششیں کیں، ان کا تذکرہ بھی اس مجوزہ کتاب کے ایک حصہ کے بطور ضروری ہوگا۔

پیش نظر کتاب میں دہلی کے دوسرے اطبا کی طرح خاندان شریفی کے صرف ان افراد کے مختصر حالات درج ہیں جنہوں نے دلی میں ناموری حاصل کی ہے۔ البتہ پہلی مرتبہ اس خاندان کی تمام شاخوں کا شجرہ یہاں ضرور پیش کیا جا رہا ہے۔ خاندان بقائی کے مطالعہ کے سلسلہ میں بھی ابھی تک کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی تھی۔ اس کے متنازا اطبا کے تذکرہ کے ساتھ ان کا تفصیلی شجرہ بھی سامنے لایا گیا ہے۔

راقم سطور کا دلی آمد و رفت کا سلسلہ اگرچہ بچپن سے قائم تھا۔ گلی مدرسہ حسین بخش، اور محلہ خان خانان میں ہمارے دو مکان تھے۔ لیکن ۱۹۶۳ء میں جب جامعہ طبیہ میں لیکچرر کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا اور وہاں چند برس قیام کا موقع ملا، اس وقت اگرچہ دہلی کی طبی بہار اجڑ چکی تھی لیکن اس خزاں رسیدہ چمن کی آبیاری کرنے والی کچھ شخصیتیں موجود تھیں ـ بزم کو برہم ہوئے مدت نہ گزری تھی بہت۔ میں نے

وہاں اس وقت جن صاحبان فن کو دیکھا وہ میرے لیے ہمیشہ فخر کا باعث رہے گا۔ حکیم جمیل خاں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے اکلوتے صاحبزادہ اور عظمت فن کے گواہ۔ حکیم عبدالرحیم خاں گوناگوں اوصاف کے حامل۔ دہلی کی تہذیب و معاشرت کا نمونہ۔ حکیم عاقل خاں حسن و جمال کا مجسمہ اور عقل و خرد میں یگانہ، حکیم محمود سعید خاں حکیم بھورے میاں کے عالی قدر فرزند، پابند وضع اور رکھ رکھاؤ کے بزرگ، حکیم محمود احمد خاں حکیم محمد احمد خاں کے صاحبزادہ، روایات خاندان کے امین، حفظ وضع کا خاص خیال رکھتے تھے۔ حکیم محمد شریف خاں مرنجاں مرنج، نیک شعار، ممتاز سیاسی و سماجی کارکن، ان اراکین خاندان شریفی کے علاوہ جن دوسرے اطبا سے نیاز کی سعادت حاصل ہوئی ان میں حکیم خلیل الرحمٰن خاں شاعری میں سائل دہلوی کے شاگرد، سیاست اور ملی مسائل میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے ساتھ پیش پیش رہے، سراپا مہر و محبت تھے۔ حکیم موتی رام نہایت شریف، بامروت اور نرم گفتار، ان کا مطلب مرجع خلائق تھا۔ حکیم بی این شرما آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے جنرل سکریٹری، طبی سیاست کے شہسوار اور مسائل طب کے واقف کار۔ حکیم سید جمیل شاہ قادری خوش شکل خوش لباس، خانقاہی سلسلہ تھا اور اس حلقہ میں مقبول و محترم تھے۔ حکیم عبدالجلیل صدیقی دلکش اور جاذب نظر شخصیت، کامیاب مطلب تھا۔ برسوں روزنامہ الجمعیت کے طابع و ناشر رہے۔ حکیم محمد انجم خاں طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے پہلے بیچ (۱۹۲۷ء) سے تعلق تھا۔ قرول باغ طبیہ کالج کے لائق استاد، ملنساری اور خوش طبعی کی وجہ سے پانچویں دہائی کے پرآشوب دور میں ایسے علاقہ میں ہر دلعزیز بن کر رہے جب دوسروں کے لیے وہاں رہنا آسان نہیں تھا۔ حکیم گوردت سنگھ الگ متعدد طبی کتابوں کے مصنف، ذی شعور طبیب، ان کا تعلق غیر مسلم طبیبوں کی اس نسل سے تھا جس نے اس فن میں علاجی میدان ہی میں نہیں تدریسی اور تصنیفی طور پر بھی نقوش قائم کئے ہیں۔ مشہور افسانہ نگار اور صاحب قلم حکیم کوثر چاند پوری بھی دہلی میں موجود تھے۔ ان کی ذات میں ایک انجمن آباد تھی۔ بڑے

سلیقہ کے آدمی تھے۔ دل کھول کر داد سخن دیتے اور خردوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ حکیم ذکی احمد خاں اگرچہ دہلی کے قدیم باشندہ نہیں تھے۔ لیکن ساری عمر دہلی میں گزری۔ طب کے دہلی اسکول کے نمایندہ سمجھے جاتے تھے۔ حکیم سید حسین ایک زمانہ تک طبی سیاست میں سرگرم رہے۔ جمعیۃ العلماء اور دوسری ملی تحریکوں سے دلچسپی تھی۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ حکیم رام لبھایا حکیم ایاس خاں مرحوم کے وفادار شاگرد تھے۔ ادویہ کی شناخت اور دواسازی کے ماہر، طبی و سماجی تنظیموں سے تعلق تھا۔ ایک وضع پر سدا قایم رہے۔ حکیم گنگارام گاندھی گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار، طبیبوں کی قدیم روایت کے پابند، کامیاب معالج تھے۔

طب یونانی ایک مشترکہ تہذیب کی علامت اور ایک قیمتی وراثت علم ہے۔ یونانی طبیبوں کی کاوشیں اور ان کا دایرہ کار معالجہ اور طبی درس و تصنیف تک محدود نہیں رہا۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ ان کا شمار سماج کے نہایت باشعور افراد میں ہے۔ کیمیا، طبعیات، حیاتی علوم، تاریخ، تذکرہ، مذہب، تصوف اور شعر وادب پر بیش قدر کاموں کے علاوہ سیاسی اور ملکی مہمات، قومی و ملی مسائل، علمی و تعلیمی امور اور تحریک آزادی میں ان کا حصہ ناقابل فراموش ہے۔ دہلی ہندوستان میں طب کا سب سے بڑا مرکز رہی، صحیح معنی میں دارالطب، اس شہر سے اس کا گہرا رشتہ ہے۔ اطبا دہلی کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ ان کا شمار عمائدین شہر میں ہوتا تھا۔ ان کی سیاسی بصیرت اور تغیرات زمانہ پر ان کی نظر سے لوگوں کو رہنمائی ملتی تھی۔ دہلی کا حسن وامتیاز اور شناخت و نشان اور وہ خصوصیات جن سے دہلویت عبارت ہے ان کی زندگی میں پوری طرح جلوہ گر ہیں۔ انہوں نے وہاں جو علمی فنی اور ادبی فضا قایم کی تہذیب و ثقافت کو جو اعلیٰ معیار عطا کیا اور اس سے زیادہ ذہن و فکر کی تعمیر میں جو خدمات انجام دیں، ان کے مطالعہ کے بغیر اس شہر کا مطالعہ ادھورا رہے گا۔

دلی میں سیکڑوں باکمال طبیب گزرے ہیں۔ کسی ایک کتاب میں ان سب کا احاطہ

آسان نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ اس موضوع پر پہلے کوئی کام بھی نہ کیا گیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود دہلی کے بیشتر قابل ذکر نمائندہ طبیبوں پر زیر نظر کتاب میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے دلی میں یونانی طبیبوں کی گوناگوں دلچسپیوں کا تعارف سامنے آئے گا۔ اور دلی اور طب یونانی کے تعلق سے کتاب کی تصنیف کا مقصد پورا ہونے میں مدد ملے گی۔

دلی کا یہ طرہ امتیاز آج بھی حکیم عبدالحمید کے شاندار اور بے مثال کارناموں کی وجہ سے برقرار ہے۔ دوسرے شہروں کی نسبت سے وہاں یونانی سرگرمیاں زیادہ تیزی سے جاری ہیں۔ کافی تعداد میں اطبا معالجہ، دواسازی، تدریس اور اعلیٰ تحقیق کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ دلی میں اس وقت طب کے جو اہم ادارے موجود ہیں ان میں طبیہ کالج، جامعہ ہمدرد، سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسین، مرکزی وزارت صحت کا یونانی شعبہ، سینٹرل کونسل آف انڈین میڈیسین اور آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس قابل ذکر ہیں۔ طب کی ترقی کے سلسلہ میں ان کی خدمات کا اعتراف ضروری ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ اردو اکادمی دہلی نے "دہلی اور طب یونانی" کے موضوع کو اپنے اشاعتی منصوبہ میں شامل کیا اور راقم سطور کو یہ خدمت سپرد کی۔ دہلی اکادمی نے دہلی پر مختلف حیثیتوں سے کام کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اور اس کے زیر اہتمام دہلی سے متعلق جو قابل قدر مواد سامنے آیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اس میں مزید اضافہ کا باعث بنے گی۔ میں اردو اکادمی کے ذمہ داران اور خاص طور پر اس کے سکریٹری زبیر رضوی کا شکرگزار ہوں۔ انہوں نے اس موضوع کا انتخاب کر کے دوسرے صوبوں کی اکادمیوں اور اداروں کو راہ دکھائی ہے۔

دہلی میں عہد سلطنت میں طب کی ترقی

ہندوستان میں محمد بن قاسم سے لے کر سلطان شہاب الدین غوری تک پانچ سو سال میں مسلمانوں کی جو حکومتیں قایم ہوئیں ان کا اصل مرکز دمشق، بغداد یا غزنہ تھے۔ سندھ اور پنجاب تک ان کی عملداری تھی۔ شہاب الدین غوری پہلا فرمانروا ہے جس نے دہلی کو فتح کر کے اسلامی حکومت کے نئے سلسلہ کا آغاز کیا۔ شہاب الدین غوری کے بعد خاندان غلامان کی حکومت سے ہندوستان میں مسلم فرمانروائی کا غیر ملکی اثرات سے آزاد خود مختارانہ دور شروع ہوتا ہے۔ اور اسی دور سے لاہور اور ملتان کے بجائے دہلی کی حیثیت ابھرتی ہے۔ غوری سے پہلے کے عہد کا اگرچہ دہلی سے براہ راست تعلق نہیں ہے لیکن اس میں علما، صوفیا اور دوسرے مشاہیر فن کے ساتھ اطبا بھی بڑی تعداد میں ہندوستان آئے۔ اور یہاں انہوں نے علاج و معالجہ کے فرائض انجام دیئے۔ امرا اور خواص کے علاج کے لیے ظاہر ہے قابل اعتماد ہم وطن طبیبوں کی ضرورت تھی۔ اس عہد کی کوئی باضابطہ تاریخ مرتب نہیں ہے۔ اس زمانہ میں جو بکثرت طبیب ہندوستان آئے ان میں ابن سینا کا معاصر ابوریحان البیرونی (۱۰۵۱-۹۷۶ء) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

ہندوستان میں پہلے طبیب کے طور پر جو نام ملتا ہے وہ ضیاء الدین عبدالرافع ابوالفتح ہروی ہے۔ رافع اگرچہ ہندوستان میں آخری غزنی تاجدار خسرو ملک (۱۱۸۶-۱۱۶۰ء) کے عہد کا حاذق معالج اور درباری طبیب تھا۔ لیکن مؤلف

مآثر لاہور کے مطابق اس نے شہاب الدین غوری (وفات ۱۲۰۶ء) کا زمانہ بھی پایا۔[1] نور الدین عوفی نے اس کے فضل و دانش اور علم طب میں کامل مہارت کے ساتھ فن لغت میں بھی اس کے مرتبہ کی تعریف کی ہے۔[2] اس پہلے طبیب کی طرح ہندوستان میں جس پہلی طبی کاوش کا پتہ چلتا ہے وہ ابوریحان البیرونی کی کتاب الصیدنہ کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ کے فرائض سلطان شمس الدین التمش (۱۲۳۵-۱۲۱۱ء) کے عہد میں ابو بکر بن علی بن عثمان اسفر کاسانی نے انجام دیئے ہیں۔[3]

عہد التمش میں دہلی میں اطبا اور علماء و فضلا کے بے نظیر اجتماع کو دیکھ کر عصامی نے کہا تھا ؎

حکیمان یونان طبیبان روم | بسی اہل دانش زہر مرز و بوم
در آن شہر فرخندہ جمع آمدند | چو پروانہ بر نور شمع آمدند

عہد شمسی کے ایک نہایت برگزیدہ طبیب حکیم شمس الدین ہیں یہ بڑے حاذق معالج تھے اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے شرف بیعت رکھتے تھے عہد سلطنت میں طب پر لکھنے والے کسی بھی فاضل نے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (وفات ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء) کی طبیعت ناساز ہوئی تو ان کے مرید حکیم شمس الدین کو جو اپنے زمانہ کے بڑے حاذق طبیب تھے، بلایا گیا تھا۔[4]

غیاث الدین بلبن کے زمانہ (۱۲۸۶-۱۲۶۶ء) میں طب فیروز شاہی کے نام سے ۱۲۸۱ء میں ایک کتاب لکھی گئی تھی۔ اس کا موضوع اگرچہ علاج پرندگان ہے

---

[1] تاریخ روابط پزشکی ایران و پاکستان صفحہ ۱۲ بحوالہ مآثر لاہور ص ۱۴۹

[2] لباب الالباب جلد ۲ ص ۱۲۷

[3] کیٹلاگ عربک اینڈ پرشین لٹریچر جلد ۲ حصہ ۲ (طب) ص ۲۰۳ مزید طب فیروز شاہی ص ۱

[4] واقعات دار الحکومت جلد ۳ ص ۲۸۵ (بحوالہ رسالہ اصول السماع فخر الدین زرادی خلیفہ نظام الدین

لیکن ادویہ کے سلسلے میں اس سے بیش قیمت معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان آنے کے فوراً بعد یونانی طبیبوں نے ادویہ کے مترادف مقامی ناموں کے بارے میں واقفیت حاصل کر لی تھی۔ شاہ قلی کے نام سے منسوب یہ کتاب ہندوستان میں طبی تاریخ اور بالخصوص مفرد دواؤں کے مطالعہ کے اعتبار سے اولین ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ادویہ کے بارے میں ہندوستانی اطبا کے ذہن، جغرافیائی لحاظ اور نئی سمت میں ان کے انداز کار کے تعین میں اس سے مدد ملتی ہے اس کے مطالعہ کا دوسرا پہلو بھی کم اہم نہیں ہے۔ اس کا تعلق تاریخ لسانیات سے ہے۔ یہ اردو زبان کی ابتدا اور اس کے تجزیہ کے لحاظ سے لسانی ماہرین کے لیے دلچسپ ہو سکتا ہے۔ اس فارسی کتاب میں جس طرح ہندوستانی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے غالباً کسی فارسی تصنیف میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔ آگے چل کر اسی طرز سے اردو کا خمیر تیار ہوا اور فارسی اور ہندوستانی کے بڑھتے ہوئے اختلاط نے اردو کا روپ اختیار کیا۔ یہاں میں اس نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہونگا کہ صوفیا کے ملفوظات کے استثنیٰ کے ساتھ میرے خیال میں دوسرے موضوعات کے مقابلہ میں طب پر لکھی گئیں فارسی تصانیف میں سب سے پہلے کثرت سے ہندوستانی الفاظ و اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح ابتدائی عہد کی طبی کتابوں کے ذریعہ لسانی تحقیق کو ایک نیا رخ عطا کیا جا سکتا ہے۔

علاء الدین خلجی (۱۳۱۶-۱۲۹۶ء) کے عہد میں دہلی میں علماء کی کثرت اور ان کے فضل و کمال کے بارے میں ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ "دہلی میں اس زمانہ میں جو یگانہ عصر علما موجود تھے ان کی نظیر پیش کرنے سے بخارا، سمرقند، بغداد، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، اصفہان، رے، روم اور دوسرے شہر قاصر ہیں۔[1] برنی نے دوسری جگہ اس عہد کی دلی کو "رشک بغداد، غیرت مصر، ہمسر قسطنطنیہ، موازی بیت المقدس لکھا ہے[2]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۲

[2] ایضاً ص ۳۴۱

علاء الدین خلجی اطبا کا بڑا قدرداں اور مربی تھا۔ برنی کے مطابق وہ ان سے نہایت اعزاز و اکرام سے پیش آتا تھا۔ اس کے زیر اہتمام قانون اور قانونچہ کی تدریس کا آغاز ہوا۔ کافی تعداد میں اطبا، جراح، کحال اور ہندی طب کے ماہراس کے دامن دولت سے وابستہ تھے[1]۔ ان اطبا کی حذاقت کے بارے میں برنی نے لکھا ہے کہ "عصر علائی کے طبیبوں میں سے ہر ایک علم طب میں مہارت رکھتا تھا۔ علاج امراض میں بقراط اور جالینوس بھی ان کے آگے بے حقیقت تھے۔ ایسے سرآمد اطبا کسی زمانہ میں دیکھنے میں نہیں آئے[2]۔ برنی نے اس دور کے ممتاز طبیبوں میں مولانا حکیم بدرالدین دمشقی، مولانا حکیم حمید مطرز، مولانا حکیم صدرالدین اور ان کے والد مولانا حسام ماربیکلی، حکیم علم الدین، یمنی طبیب، حکیم اعزاز الدین بدایونی، مہ چندر طبیب، جاجا جراح، علم الدین کحال کے نام گنائے ہیں اور لکھا ہے کہ اس زمانہ میں پورے ملک میں کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے[3]

حکیم بدرالدین دمشقی دہلوی کے بارے میں برنی نے لکھا ہے کہ وہ استاد الاطبا تھے۔ شہر کے طبیب ان سے طبی کتب کا درس لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم طب میں بڑی مہارت عطا کی تھی۔ محض مریض کی نبض سے وہ مرض کی تشخیص کر لیتے تھے[4]

صاحب نزہتہ الخواطر کے مطابق حذاقت تدبیر اور نبض اور قارورہ کے ذریعہ شناخت امراض میں وہ اپنے عہد کے بے مثل طبیب تھے کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ مختلف جانوروں کا پیشاب ملا کر ان کے سامنے لایا گیا۔ دیکھتے ہی پہچان گئے۔ مسائل کی تشریح میں منفرد تھے۔ طب کے دقیق مسائل بہت آسانی سے حل کرتے اور طلبہ کے

1۔ تاریخ روابط پزشکی ایران پاکستان ص ۱۳۵

2۔ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۲

3۔ ایضاً ص ۳۶۲

4۔ ایضاً ص ۳۶۲

ذہن نشین کراتے تھے۔ قانون ابن سینا کے درس میں خاص طور پر درجہ کمال حاصل تھا، علاء الدین خلجی کے زمانہ میں دہلی میں رہتے تھے۔ طبی درس اور معالجہ کی ریاست ان پر ختم تھی۔ اس فضل و حذاقت کے ساتھ مرد صالح اور صاحب کشف و کرامات تھے[۱]

حکیم حمید مطرز کے فنی مرتبہ پر روشنی ڈالتے ہوئے برنی نے لکھا ہے کہ نبض اور قارورہ کی معرفت میں مولانا دمشقی کی طرح دہلی میں کوئی ان کا مقابل نہیں تھا۔ اپنے حسن تقریر کی وجہ سے وہ قانون، قانونچہ اور دیگر طبی کتب اس قدر تشریح اور وضاحت سے پڑھاتے تھے کہ شاگردان کے حسن تقریر اور خوش بیانی پر حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ علم طب میں مہارت کے باوجود تصوف سے گہرا تعلق تھا[۲]

حکیم صدر الدین ماریکلی دہلوی ابن حسام الدین تصوف و عرفان میں رتبہ عالی رکھنے کے علاوہ عمدہ ترین اطبائے وقت میں تھے، علاء الدین خلجی کے عہد میں پایہ تخت دہلی میں مطب کرتے تھے اور درس دیتے تھے۔ نہایت ذکی اور ذہین تھے۔ مریض کو دیکھتے ہی مرض کی تشخیص کرتے تھے۔ دست شفا حاصل تھا[۳] عبدالحق محدث دہلوی نے بھی انہیں فن طب میں ماہر و کامل لکھا ہے۔ انہوں نے چند کتابیں فصیح و سلیس عبارت میں تصنیف کی ہیں، جن میں معارف، حقائق، وعظ و نصیحت اور حکمتیں قلمبند کی ہیں ان کے خطوط بھی تصوف اور معارف سے پر ہیں[۴]

حکیم صدر الدین خواجہ نظام الدین اولیا کی دعا سے پیدا ہوئے تھے۔ پیدا ہونے پر حضرت نے شفقت سے گود میں لیا[۵] اپنے پیراہن کے ایک ٹکڑے سے ان کے لیے

---

[۱] نزہتہ الخواطر جلد ۲ ص ۱۶

[۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۲

[۳] نزہتہ الخواطر جلد ۲ ص ۶۱

[۴] اخبار الاخیار ص ۲۶۲

[۵] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۳

کرتہ بنوایا اور مخدوم نصیرالدین چراغ دہلی سے فرمایا اس بچہ کی تعلیم وتلقین تمہارے ذمہ ہے اس کو تم اپنا خلیفہ اعظم بنانا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور خلافت چشتیہ سے مشرف فرمایا۔ یہ طبیب دلہا سے بھی مشہور تھے۔ ان سے بہت لوگوں نے فیض پایا ان کا مزار حضرت نصیرالدین چراغ دہلی کے روضہ کے پاس ہے[1] ان کے والد حسام الدین ماریکلی بھی علم طب میں مہارت رکھتے تھے[2] حکیم علم الدین شیرازی کے بارے میں صاحب نزہتہ الخواطر نے لکھا ہے کہ علوم حکمت اور فن طب میں ماہر تھے علاء الدین خلجی کے عہد میں دہلی میں فرایض درس انجام دیتے تھے۔ برنی نے شیراز کی طرف ان کی نسبت نہیں کی ہے۔ لیکن تاریخ فرشتہ میں انہیں شیرازی لکھا ہے یہ خلجی کے بعد بھی بہت عرصہ تک زندہ رہے۔ محمد شاہ تغلق نے انہیں اپنا ندیم بنایا، انہیں قرب واختصاص حاصل تھا اور محمد تغلق ان سے علوم میں مذاکرہ کرتا تھا[3]

حکیم یمنی دہلوی حاذق معالج تھے۔ اور عہد علاالدین خلجی میں دہلی میں تدریسی خدمت پر مامور تھے[4]

خلجی دور کی ایک کتاب صحت علائی ہے شہاب بن عبدالکریم کی کتاب طب شہابی (تالیف ۱۳۸۸ء) میں اس کا حوالہ ملتا ہے۔[5]

عہد تغلق میں دہلی میں طبی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں اس خاندان کے فرمانرواؤں کا طب سے ذاتی تعلق تھا۔ غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰-۱۳۲۵ء) کی عملی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ خسرو خاں کے مقابلہ میں فتح حاصل ہونے کے بعد اس نے

---

[1] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۵۰۰

[2] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۲

[3] نزہتہ الخواطر جلد ۲ ص ۸۵

[4] نزہتہ الخواطر جلد ۲ ص ۱۶۸

[5] طب فیروز شاہی ص ۲

دشمن زخمیوں کی مرہم پٹی کی اور ان کا علاج کیا۔ ان زخمیوں میں تمر نام کا ایک آدمی تھا۔ غیاث الدین نے اپنے ہاتھ سے اس کے زخم پر مرہم رکھا اور پٹی باندھی امیر خسرو نے اس موقع پر کہا تھا[1]

بدست خود جراحتہاش میبست
دوا ہا بہر راحتہاش میبست

سلطان محمد شاہ تغلق (۱۳۵۱ - ۱۳۲۵ء) کو طب سے خاص تعلق تھا، وہ نہ صرف نظری طب میں دسترس کامل رکھتا تھا، بلکہ حاذق معالج تھا اور اس کے ہاتھ میں شفا تھی۔ اس کے علاج سے بہت سے مریضوں نے شفا پائی۔ سلطان معاصر اطبا سے طب کے کلی اور جزوی مسائل پر بحث و مباحثہ کرتا تھا اور اپنے فکری نکات سے انہیں آگاہ کرتا تھا۔[2] حکیم عبید جیسا طبیب اس زمانہ میں موجود تھا۔[3] اس کے عہد میں دہلی میں، شفاخانے قایم تھے۔ اور ایسے اطبا کی تعداد جو سرکاری ملازمت سے وابستہ تھے بارہ سو تھی۔[4]

فیروز شاہ تغلق (۱۳۸۸-۱۳۵۱ء) کی طبی دلچسپی محض شفا خانوں کے قیام اور فن کی قدردانی کی حد تک نہیں تھی۔ اس نے جہاں اپنے دور مملکت میں دہلی میں پانچ شفاخانے تعمیر کرائے[5] حاذق طبیبوں کو گراں قدر مشاہرہ پر مقرر کیا، مریضوں کے لیے دواؤں کی فراہمی کا نظم قایم کیا، وہاں بنفس نفیس علاج معالجہ کے فرائض انجام دیئے۔ فیروز شاہ ہیئت، نجوم اور طب کا خاص دلدادہ تھا۔ سیرت فیروز شاہی،

---

[1] تاریخ روابط بیز تنگی ایران پاکستان ص ۱۷ بحوالہ تغلق نامہ ص ۱۰۲
[2] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶۴
[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶۰
[4] اخبار عہد مغلیہ ص ۱۲: نیز مسالک الابصار ص ۲۴
[5] ہفت اقلیم جلد ۲ ص ۵۴۹

سے ان علوم پر اس کی وسیع معلومات کا اظہار ہوتا ہے۔ علم نجوم اور اس کے دقائق پر اسی طرح اصطرلابات پر اس علم کے قواعد و قوانین کی روشنی میں اس نے املا کے انداز پر کتاب لکھی ہے۔ اس موضوع کی ایک ہندی کتاب کا دلایل فیروز شاہی کے نام سے اس کے حکم سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔[1] اصطرلابات پر ایک کتاب میزان فیروز شاہی اس کی یادگار ہے۔[2] اس کی مشہور کتاب فتوحات فیروز شاہی بھی اس کی تصنیفی حیثیت پر شاہد عدل ہے۔

سلطان نے دینی مدارس کے ساتھ طب کے مدارس بھی قائم کئے، اور طبی تعلیم کا اہتمام کیا۔[3] اس کے عہد میں دہلی میں تیس مدارس تھے۔ ان میں سب سے عظیم الشان مدرسہ فیروز شاہی تھا جو حوض خاص میں واقع تھا۔ اس میں جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی ان میں دینی علوم، ریاضی و طبعیات کے ساتھ طب بھی شامل تھی۔[4] اس کی تصنیف طب فیروز شاہی کے بارے میں صاحب سیرت فیروز شاہی نے لکھا ہے کہ معالجات امراض پر مشتمل اس کتاب میں بعض ایسے امراض کا ذکر ہے جو قانون، ذخیرہ (خوارزم شاہی) اور اعراض میں مذکور نہیں ہیں۔ بعض ایسی بیماریاں جو ماہرین فن سے ٹھیک نہیں ہوسکی تھی، سلطان کے علاج سے ان میں مبتلا مریض شفایاب ہوئے۔ مختلف امراض کے جو نسخے اس نے ترتیب دیئے ہیں ان میں ایک کحل فیروز شاہی ہے جسے سلطان ہی کے نام سے معنون کیا گیا ہے اس کے تجویز کردہ نسخے اصول علاج کے مطابق ہیں اور ان سے صحیح فنی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ امراض اور ادویہ کی وضاحت میں بعض ہندی مترادفات بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً استسقا کے لیے

---

[1] سیرت فیروز شاہی ورق ۱۵۳ (الف)
[2] ایضاً ورق ۱۵۳ (ب)
[3] ایضاً ورق ۳، (ب)
[4] ایضاً ورق ۳، (ب)

جلندھر، بباسہ کے لیے جادو تری، انتشار الحار کے لیے بندال، جدوار کے لیے نربسی وغیرہ۔

عہد تغلق میں طب پر جو اہم کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں مجموعہ ضیائی اس معنی میں بہت اہمیت کی حامل ہے کہ اس سے بعض پیش رو مصنفین کی کتابوں کی اطلاع ملتی ہے۔ یہ کتاب محمد بن تغلق کے درباری طبیب ضیا محمد مسعود رشید زنگی کی ہے جسے اس نے ۷۳۶ھ/۱۳۳۶ء میں لکھا ہے۔ اس کے ماخذ سے اس کے چچا شمس منتوفی کی تصنیف مجموعہ شمسی کا پتہ چلتا ہے۔ یقینی طور پر اس تصنیف کا تعلق غیاث الدین تغلق کے زمانہ سے ہے۔

محمد بن تغلق ہی کے دور کا ایک مصنف ضیاء الدین نخشبی بدایونی (وفات ۱۳۵۰) ہے جسے طب موسیقی اور شعر و انشا میں ید بیضا حاصل تھا۔ متعدد کتابوں کا مصنف ہے۔ کتاب الکلیات والجزئیات کے علاوہ لذت النساء کے نام سے اس نے ایک کتاب تحریر کی ہے۔ اس کی ایک یادگار صناعتہ الطبیہ بھی ہے[۱]

سلطان فیروز شاہ کے نام معنون راحت الانسان اس دور کی قابل قدر تصنیف ہے۔ الیاس بن شہاب الملقب بہ ضیا (۷۸۷ھ/۱۳۸۵ء) اس کا مصنف ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں اس کا نسخہ محفوظ ہے۔

سلطان سکندر لودھی (۱۴۸۹ء–۱۵۱۷ء) نے اپنے طبی شغف کی وجہ سے وزیر بہوہ بن خواص خاں سے آیورویدک نظریات اور طریقہ علاج پر مشتمل کتاب لکھنے کی فرمایش کی۔ اس کی تعمیل میں ۱۵۱۲ء میں معدن الشفا سکندر شاہی جیسی پایہ کی کتاب وجود میں آئی۔ اسی دور کے ایک اور امیر اور عالم طب میاں طہ جو نہ صرف اسلامی علوم و سائنس میں بلند مرتبہ رکھتے تھے بلکہ ہندوستانی موسیقی، طب اور دوسرے ہندی علوم کے ماہر تھے۔ ان کی آیورویدک میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ انہیں چوبیس ہزار طبی اشلوک یاد تھے اور وہ اس فن کے ماہرین کو طب ہندی کا

---

[۱] طب فیروز شاہی ص ۲

درس دیتے تھے[1] امراض چشم پر ایک رسالہ آئینہ سکندری بھی اسی عہد کی تصنیف ہے۔ اس کا واحد مخطوطہ طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے[2]

سلطان سکندر لودھی کے بیٹے سلطان ابراہیم لودھی (۱۵۲۶-۱۵۱۷ء) کے زمانہ میں خواجگی اصلح اللہ نے طب ابراہیم شاہی جیسی ضخیم کتاب لکھی۔ ۵۰۵ صفحات پر مشتمل اس کا مخطوطہ سید عبدالقادر پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کے ذخیرہ میں محفوظ تھا۔

عہد سلطنت کی کتابوں کے مطالعہ سے ہندوستان میں تہذیب فن کے لیے کی جانے والی شعوری کوشش کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کاوش انفرادی یا کسی ایک مصنف کا امتیاز نہیں ہے۔ عمومی اور اجتماعی طرز ذہن کا آئینہ دار ہے۔ اس سے معاشرہ کی ذہنی رفتار اور تہذیبی و ثقافتی اقدار کے ساتھ سماجی اور ادبی علوم کی طرح طبی محرکات کا نہ صرف اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس دور میں زبان اور علم و فن میں مختلف سطح پر کئے جانے والے تجربوں کی بھی نشاندہی ہوتی ہے، ان تصانیف کا مطالعہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ان سے قدیم طرز فکر کے انحراف اور عصری تقاضوں کا احترام ہی سامنے نہیں آتا ان کے ذریعہ فن کی تشکیل نو اور نئی اساس فراہم کرنے کی کوشش کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس مطالعہ کے دوسرے اہم پہلو کا تعلق اطبا کے اس ذہنی رویہ سے ہے جسے ہندوستان میں پہلے سے موجود نظام طب سے تصادم کا پروردہ کہا جا سکتا ہے اس تصادم اور ردعمل کے مضمرات کا جائزہ ان کتابوں کے ذریعہ آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں میں اس عہد کے پیشہ ورانہ تقاضوں کی جھلک بھی ملتی ہے اور اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان تقاضوں کو طبی عاملین کے ساتھ طبی مصنفین نے بھی محسوس

---

[1] مقدمہ اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر ص ۳۹ بحوالہ تاریخ مشائخی ورق ۶۹ ب

[2] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۹/ ۱۲۸

کرنا شروع کردیا تھا اس وقت کے طبی نظام میں مخصوص برتری اور مقام حاصل کرنے کے لیے یہ ان کی جد و جہد اور علمی کاوشوں کا ثبوت ہے۔ ہندوستان میں یونانی طبیبوں کو عرب، ایران اور وسط ایشیا کی مملکتوں کے برخلاف آیورویدک کی وجہ سے جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا وہ ان کے لیے بالکل نئی تھی۔ اس عہد کے طبیبوں کے ذہنی بلوغ، بصیرت اور رفتار زمانہ پر ان کی نظر کی داد ضروری ہے کہ تہذیب یافتہ اور مستحکم نظام طب رکھنے کے باوجود انہوں نے نئے تقاضوں کا احساس کیا۔

عہد مغلیہ، طب کا دور زریں

مغلیہ عہد ہندوستان کی طبی تاریخ کا دور زریں ہے۔ بابر (وفات ۱۵۳۰ء) کے زمانہ میں جسے خود طب کا خاص ذوق تھا، خواجہ نظام الدین علی خلیفہ، حکیم میر ابو البقا، حکیم محمد بن یوسف ہروی، حکیم یوسف بن محمد ہروی یوسفی، حکیم محمد بن اشرف حسینی لایق ترین طبیب موجود تھے۔ انہوں نے بابر اور ہمایوں کے عہد میں ہندوستان میں طب کی عظمت کو چار چاند لگا دیے۔ دہلی میں مولانا اسمٰعیل عرب نے جو طب حکمت اور ہیئت کے بے مثل عالم تھے اور جنہیں حدیث اور تفسیر میں بھی ملکہ حاصل تھا، طبی درس وافادہ میں شہرت پائی۔ دہلی میں مدرسہ ہمایوں قائم شدہ ۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء میں وہ درس دیتے تھے۔ بڑی تعداد میں طلبہ نے ان سے فیض اٹھایا۔[1]

جہانگیر کے عہد تک اگرچہ دہلی پایہ تخت نہیں تھا اور اکبر اور جہانگیر کے عہد کے گرامی منزلت اطبا کا براہ راست دہلی سے وہ رشتہ قایم نہیں تھا جو عہد شاہجہانی اور اس کے بعد کے اطبا کا دہلی سے رہا، لیکن اس ابتدائی مغل زمانہ میں بادشاہوں کی معارف پروری اور مستحکم حکومت کی وجہ سے جس کثرت سے ایران اور وسط ایشیا سے اطبا کی ہندوستان آمد کا سلسلہ شروع ہوا وہ شاہجہان

---

[1] منتخب التواریخ ص ۳۲۳

اور مغل سلطنت کے اضمحلال تک قایم رہا۔

شاہ جہاں (۱۶۵۱ - ۱۶۲۸ء) اور اس کے بعد کے زمانہ میں جن ممتاز طبیبوں نے دہلی میں طب کی ترقی میں حصہ لیا اور اپنے علمی، ادبی اور سیاسی کارناموں کی وجہ سے وہاں شاندار روایت قایم کی ذیل میں ان کا مختصر تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے۔

حکیم رکنا کاشی

حکیم رکن الدین مسعود جو حکیم رکنا کاشی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے آبا و اجداد اگرچہ شیراز کے رہنے والے تھے۔ لیکن کاشان میں توطن اختیار کر لیا تھا۔ طبابت خاندانی پیشہ تھا۔ مسیح تخلص کرتا تھا۔ ایران میں شاہ عباس صفوی کا ندیم خاص تھا، مگر کسی وجہ سے مکدر ہو کر ہندوستان چلا آیا[1] اور اکبر اور جہانگیر کے خوان کرم کی زلہ ربائی کی۔ شاہ جہاں جب تخت نشین ہوا تو حسب ذیل قطع لکھ کر بارہ ہزار روپیہ انعام میں حاصل کیا[2]

بادشاہ زمانہ شاہ جہاں خرم و شاد و کامران باشد
بہر سال جلوس او گفتم در جہان بادنا جہان باشد

شاہ جہاں کی اجازت سے وطن واپس گیا اور وہیں ۱۰۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ملک الشعراء مرزا صائب[3] نے شاعری میں حکیم رکنا کاشی سے استفادہ کیا تھا۔ رکنا کاشی کے بھائیوں حکیم قطبا اور حکیم نصیرا کا خاندان بھی شاہی جود و سخا سے فیضیاب ہوتا رہا۔ حکیم قطبا کا بیٹا حکیم ضیاء الدین رحمت خاں شاہ جہاں

---

[1] مآثر الامرا جلد ۲ ص ۲۸۳

[2] مآثر الکرام دفتر ۲ ص ۹۰

[3] صائب رکنا کاشی کے علاوہ حکیم شفائی کا بھی شاگرد تھا۔

اور عالمگیر کے منصب داری امرا میں تھا اور ابو طالب کلیم کی بیٹی اس کے حبالہ عقد میں تھی[1] ستی النسا خانم رکنا کی بھاوج تھی اور حکیم صدرا بھی اس کا سسرالی رشتہ تھا غرض یہ پورا خاندان شاہجہاں کے عہد میں ممتاز رہا۔ آخر میں اپنے وطن کاشان چلا گیا تھا وہیں ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵ء میں انتقال ہوا۔ رفت بسوئے فلک باز مسیح دوم سے تاریخ بر آمد ہوتی ہے۔ دیوان مسیح کا نسخہ مکتوبہ ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء ذخیرہ سبحان اللہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ہے۔

حکیم صدرا مسیح الزماں

اپنے والد حکیم فخرالدین شیرازی اور نامور طبیب حکیم محمد باقر خلف حکیم عماد الدین محمود شیرازی کا شاگرد تھا۔ اکبر کے آخری زمانہ میں ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۳ء میں ہندوستان آیا اور حکیم علی گیلانی سے استفادہ کیا، جہانگیر نے اسے مسیح الزماں کا خطاب اور ہفت صد ذات اور سی صد سوار کے منصب سے ممتاز کیا۔[2] اس کی حیثیت و مرتبہ کا یہ حال تھا کہ ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۰ء میں جہانگیر کشمیر میں شدید ضیق النفس کی شکایت میں مبتلا ہوا تو اس نے درباری طبیب ہونے کے باوجود جہانگیر کے علاج سے انکار کر دیا تھا جہانگیر کو اس کے اس رویہ سے بہت صدمہ پہنچا۔ تزک میں جہانگیر نے اپنے رنج کا اظہار کیا ہے۔ عذر کے طور پر اس نے کہا تھا کہ مجھے اپنی عقل اور حذاقت پر اس قدر اعتماد نہیں ہے کہ علاج فرائض انجام دے سکوں[3]

شاہ جہاں نے تخت نشین ہونے پر حکیم صدرا کے اعزاز میں اضافہ کیا اور دو عرض مکرر جیسے منصب رفیع پر فائز ہوا، حکیم صدرا پر شاہ جہاں نے الطاف و عنایات

---

[1] بزم تیموریہ ص ۱۹۷

[2] تزک جہانگیری ص ۴۷

[3] ایضاً ص ۳۴۰

کی بارش کی۔اٹھارویں جلوس شاہ جہانی میں جہاں آرا کے آگ سے بری طرح جلنے پر حکیم صدرا نے کامیاب علاج کیا۔اس کے صلہ میں اس کا سالانہ مشاہرہ تیس ہزار سے بڑھا کر پچاس ہزار کر دیا گیا۔اور دس ہزار روپیہ بطور انعام عطا کئے گئے[1] ۱۰۶۱ھ ۱۶۵۱ء کو کشمیر میں وفات پائی۔

حکیم صدرا کا سلسلہ نسب عہد نبوی کے طبیب حارث بن کلدہ تک پہنچتا ہے یہ طب کے ساتھ عقلی و نقلی علوم میں امتیاز رکھتا تھا، شرح ہدایۃ الحکمۃ اس کی مشہور کتاب ہے۔ ملا نظام الدین سہالوی نے اس پر حاشیہ لکھا ہے، صدرا نے جہانگیر کے زمانہ میں دوسرے حج کی سعادت حاصل کی تھی[2]

حکیم مومنا شیرازی

مہابت خاں کے توسط سے ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء میں جہانگیر کے دربار سے وابستہ ہوا[3] یہ فصد کا ماہر تھا۔متعدد موقعوں پر جہانگیر کی فصد کھولنے کے صلہ میں انعامات سے نوازا گیا۔اور ایک ہزاری منصب پر سرفراز ہوا،شاہ جہاں کے زمانہ میں ترقی پاکر اس کا سالانہ مشاہرہ تیس ہزار تک پہنچ گیا تھا[4]،

اورنگ زیب کے عہد میں بھی یہ دربار شاہی سے وابستہ رہا۔اورنگ زیب کے آخری ایام میں بھی اس نے علاجی فرائض انجام دیئے[5]

---

[1] عمل صالح جلد ۲ ص ۳۲۰

[2] عمل صالح جلد ۳ ص ۳۸۶

[3] عمل صالح جلد ۳ ص ۳۸۷

[4] بادشاہ نامہ جلد ۲ ص ۳۳۴

[5] عالمگیر نامہ ص ۹۲۶

حکیم الملک حکیم ابوالقاسم گیلانی

حکیم شمس الدین کا بیٹا اور حکیم علی گیلانی کا ماموں زاد بھائی تھا۔ جہانگیر کے زمانہ میں اگرچہ بحیثیت طبیب شہرت ہو چکی تھی لیکن شاہ جہاں کے عہد میں عروج و اقبال کی بلندی تک پہنچا۔ مغلیہ عہد کی طبی تاریخ میں غالباً یہ واحد مثال ہے کہ بادشاہ کے حکم کے باوجود کسی طبیب نے علاج سے انکار کیا ہو۔ حکیم ابوالقاسم کی جہانگیر کے علاج سے بے توجہی کے پیچھے دربار کی سازش اور طبیب کا شاہ جہاں کی طرف التفات نظر آتا ہے۔ ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۰ء میں جہانگیر کشمیر میں ضیق النفس میں مبتلا ہوا۔ حکیم روح اللہ اور حکیم رکنا کاشی کے علاج سے فائدہ نہیں ہوا۔ سینہ میں بائیں طرف ہوا کی نالی میں گرانی محسوس ہوتی تھی اور سانس رکتا تھا۔ کمزوری بہت بڑھ گئی تھی۔ حکیم صدرا اور حکیم ابوالقاسم شاہی احسانات کے باوجود علاج پر آمادہ نہیں ہوئے۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں اس واقعہ کا جس طرح ذکر کیا ہے اس کے ایک ایک لفظ سے رنج اور مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔[1]

شاہ جہاں کے پہلے ہی جلوس میں آبائی خطاب حکیم الملک اور دو ہزاری منصب عطا ہوا، اور پانچ ہزار روپے نقد مرحمت ہوئے۔[2] ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء میں یہ سفر حج کے لیے روانہ ہوا شاہ جہاں نے ساٹھ ہزار روپیہ وہاں مستحقین کو تقسیم کرنے کے لیے اسے دیئے۔ حکیم ابوالقاسم شاہ جہاں کے نہایت معتمد اور راز دار اطبا میں تھا۔[3]

---

[1] تزک جہانگیری ص ۳۴۰

[2] عمل صالح ص ۲۸۰، نزہتہ الخواطر جلد ۵ ص ۳۱

[3] اطبائے عہد مغلیہ ۴۲

حکیم محمد معصوم تستری

حکیم محمد معصوم بن کریم الدین علوم حکمت میں فاضل عصر تھا۔ شیراز میں پیدا ہوا اور وہاں کے اساتذہ کے دامن فیض سے مستفید ہوکر شاہ جہاں کے زمانہ میں ہندوستان آیا۔

قرابادین معصومی اس کی مشہور تصنیف ہے۔ اسے اس نے ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء میں مکمل کیا تھا۔[۱]

حکیم محمد بن احمد گیلانی

حکیم محمد بن احمد بن حکیم الملک شمس الدین گیلانی مکہ میں پیدا ہوا۔ وہیں نشو و نما پائی۔ سلطان شریف محسن کا وہاں تقرب حاصل رہا۔ شریف احمد کے برسر اقتدار آنے کے بعد ۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء میں ہندوستان آیا۔ بہترین شاعر تھا۔ اس کے قصیدے مشہور ہیں۔

عبدالحمید نے بادشاہ نامہ میں اس کی بڑی تعریف کی ہے لکھا ہے کہ یہ صالح اور فاضل شخص تھا اپنے اخلاق و عادات کی وجہ سے اسے مقبولیت حاصل تھی۔ شاہ جہاں نے دہلی کے دار القضا کی ولایت اسے عطا کی تھی۔ خلاصۃ الاثر کے مطابق ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء میں فوت ہوا۔[۲]

---

[۱] نزہۃ الخواطر جلد ۵ ص ۳۹۰

[۲] نزہۃ الخواطر جلد ۵ ص ۳۳۵

امان اللہ خاں

امان اللہ خاں المخاطب بہ خان زمان فیروز جنگ (ابن مہابت خاں خانخان) اپنی مشہور طبی تصنیف گنج باد اورد کی وجہ سے دہلی کی طبی تاریخ کا نہایت ممتاز نام ہے۔ پون درجن کتابوں کا یہ مصنف طب میں دستگاہ کامل رکھتا تھا اور تلوار کا بھی دھنی تھا۔ اس نے کابل کی نائب امارت اور بالاگھاٹ کی امارت (گورنری) کے فرائض انجام دیئے۔ شاہ جہاں کی طرف سے دکن کی جنگ میں سرگرم رہا۔ اور وہیں بالاگھاٹ میں ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء میں سفر آخرت کیا۔ شاہ جہاں نے پنج ہزاری منصب اور خان زمان کا خطاب عطا کیا تھا۔

گنج باد آورد طب کے قرابادینی ذخیرہ کی ان مہتم بالشان کتابوں میں ہے جو ہندوستان میں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ اس ضخیم کتاب کی تصنیف میں اس نے ۱۰۵ کتابوں سے مدد لی ہے۔ ماخذ کی اس طویل فہرست سے کتاب کے معیار اور مصنف کے مطالعہ کی وسعت اور ذوق تحقیق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس کا مکمل نسخہ طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ اس کی کتاب دستور الاطبار (تالیف ۱۰۳۸ھ) کا ایک خطی نسخہ راقم الحروف کے ذخیرہ کی زینت ہے[1]

امان اللہ کی دوسری کتابوں میں دستور الہند سنسکرت کی کتاب مدن ونود کا فارسی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ اس نے ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۵ء میں کیا تھا۔

ام العلاج اس کی ایک اور طبی تصنیف ہے۔ یہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے اس کا سال تالیف ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۷ء ہے۔ مفتاح الحدود اسے اس نے اپنے والد

---

[1] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۱۵/۱۲۸ نیز ص ۲۰/۱۲۸۔ طب اسلامی برصغیر میں ص ۳۸۶

گرامی مہابت خاں کے نام معنون کیا ہے۔ رقعات امان اللہ حسینی، ہم عصر صوفیا کے نام خطوط کا مجموعہ ہے۔ جن میں تصوف اور عرفان کی بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں۔

انشائے خانہ زاد خاں۔ اس کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ہے اس میں سیاسی اور ملکی مسائل سے گفتگو کی گئی ہے۔ چہار عنصر دانش ضخیم لغت ہے اور دیوان امانی اس کی شاعری اور کلام پر دسترس کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کی ایک کتاب تاریخ عالم بھی ہے۔

حکیم حاذق

حکیم کمال الدین متخلص بہ حاذق حکیم ہمام کا بڑا بیٹا اور حکیم ابوالفتح گیلانی کا بھتیجہ نہایت ذہین اور دانش مند تھا۔ فتحپور سیکری میں پیدا ہوا۔ منطق، حکمت اور شعر میں مرتبہ کمال رکھتا تھا۔ امام قلی خاں کے دربار میں بلخ کی سفارت پر بھیجا گیا۔ ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۱ء میں حکیم مسیح الزماں کی جگہ عرض مکرر کے عہدہ پر فائز ہوا۔ سہ ہزاری منصب تھا۔ سلطنت کے کاروبار سے علاحدہ ہونے پر بیس ہزار سالانہ وظیفہ مقرر ہوا جو بعد میں بڑھ کر چالیس ہزار سالانہ تک پہنچ گیا[1] وراثت میں طبابت اور امارت کے علاوہ علم و ادب کا بھی ذوق پایا تھا، کچھ دنوں درباری مورخوں کے ساتھ اس عہد کی تاریخ لکھنے میں بھی شریک رہا۔ اس کے اشعار صاف اور پاکیزہ ہوتے تھے۔ رعونت اور خود پسندی میں مشہور تھا۔ خود بینی کی بنا پر شاعری میں اپنے کو انوری سے بہتر تصور کرتا تھا۔ اپنے دیوان کو بڑی زینت اور آرائش سے لکھوا کر ایک مرصع طشت پر رکھتا تھا۔ اور مطلی رحل پر رکھ کر اپنا کلام سناتا تھا[2] مولانا آزاد علی گڑھ میں اس کا نسخہ ہے۔ ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء کے قریب وفات ہوئی۔

---

[1] ماثر الامرا جلد ۱ ص ۵۸۵

[2] بزم تیموریہ ص ۲۰۲

حکیم خوشحال

حکیم حاذق کا چھوٹا بھائی تھا اپنے باپ اور چچا ابو الفتح بن عبد الرزاق سے طب کی تعلیم حاصل کی. شاہ جہاں نے تخت نشینی پر اسے یک ہزاری و دو صد سوار منصب عطا کیا تھا. ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۱ء میں وفات پائی[۱] دکن کی واقعہ نویسی اس کے سپرد تھی.

ستی النساخانم

ملک الشعرا طالب آملی کی بہن اور حکیم نصیرا کاشی کی بیوی تھی. مسائل طبیہ اور معالجہ امراض میں درک تھا. پیچیدہ بیماریوں کے علاج میں خصوصی مہارت رکھتی تھی[۲] طب میں امتیازی دستگاہ کے ساتھ فارسی شعر و ادب، قراۃ و تجوید، امور خانہ داری اور حسن و معاشرت میں بے نظیر تھی، انہی خوبیوں کی بدولت شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا کی تعلیم و تربیت اس کے سپرد ہوئی. وہ ممتاز محل سے بھی وابستہ رہی، ممتاز محل کے انتقال کے بعد شاہ جہاں نے اسے حرم کا مختار کل بنا دیا تھا[۳] ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء کو لاہور میں وفات ہوئی، بادشاہ نے جو خود لاہور میں موجود تھا تجہیز و تکفین کے لیے دس ہزار روپیہ عطا کیے. وہاں ایک برس نعش محفوظ رکھنے کے بعد آگرہ میں تاج محل کے مغربی جانب تیس ہزار روپیہ

---

[۱] نزہتہ الخواطر جلد ۵ ص ۳۰

[۲] عمل صالح جلد ۲ ص ۷۷

[۳] مآثر الامرا جلد ۲ ص ۹۲۰

کے صرفہ سے تعمیر کردہ مقبرہ میں اسے دفن کیا گیا۔ مقبرہ کے سالانہ اخراجات کے واسطے شاہ جہاں نے بیس ہزار کی آمدنی کا ایک گاؤں وقف کیا تھا[1] کوئی اولاد نہیں تھی اپنے بھائی طالب آملی کی دو بیٹیوں کو گود لیا تھا۔ بڑی کی شادی عاقل خاں سے اور چھوٹی کی شادی حکیم ضیاء الدین مخاطب بہ رحمت خاں ابن حکیم قطبا سے ہوئی تھی[2]۔

حکیم فتح اللہ شیرازی

حکیم ابوالقاسم شیرازی کا بیٹا تھا۔ شیراز میں پیدا ہوا، وہاں کے اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ امام قلی بن اللہ وردی خاں کی امارت سے وابستہ تھا۔ اس کے انتقال کے بعد شاہ جہاں کے زمانہ میں ہندوستان آیا اور شاہ جہاں کے درباری اطبا میں شامل ہوا۔ یہ فن طب کا دقیقہ شناس اور مشکل امراض کے علاج کا ماہر تھا، دوا کی ترکیب استعمال اور تشخیص مرض میں ثانی نہیں رکھتا تھا۔ شاہ جہاں اس کے فضل وکمال سے متاثر تھا۔ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء کو ہزاری منصب عطا ہوا[3]۔ ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۳ء میں اس کی وفات کے بعد شاہ جہاں نے اس کے بیٹے محمد صالح کو صالح خانی خطاب اور یک ہزاری منصب سے ممتاز کیا۔ اورنگ زیب کی طرف سے بھی عنایت و نوازش کا سلسلہ رہا۔ اورنگ زیب جب شجاع کو شکست دے کر کھجوہ سے آگرہ آرہا تھا اور باغ نو منزل میں ٹھہرا ہوا تھا تو حکیم صالح کو مرصع خنجر عطا کیا۔ جشن جلوس کے موقع پر ایک ہتھنی انعام میں دی گئی۔ اور یہ ہزار پانصدی و یک صد سوار کے رتبہ کو پہنچا۔ ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۴ء میں اس کی وفات پر اورنگ زیب نے حکیم محسن اور اس کے دوسرے بیٹوں کو ماتمی

---

[1] بادشاہ نامہ جلد ۲ ص ۲۹۔

[2] مآثر الکرام دفتر دوم ص ۴۴

[3] عمل صالح جلد ۳ ص ۳۴۷ نزہۃ الخواطر جلد ۵ ص ۳۰۳

خلعت دیئے۔ اور حکیم محسن خاں کے بیٹے محمد علی خاں کو توشہ خانہ کا داروغہ مقرر کیا۔[۱]
حکیم محسن کو اورنگ زیب کی وفات کے بعد شہزادہ کام بخش نے تقرب خاں کا خطاب
اور منصب وزارت عطا کیا۔ لیکن شاہ عالم کے مقابلہ میں کام بخش کو شکست نصیب
ہوئی اور حکیم محسن مارا گیا۔ حکیم محسن کے دوسرے بیٹے حکیم حاذق خاں تھے۔

حکیم داؤد تقرب خاں

حکیم عنایت اللہ خاں کا بیٹا تھا۔ عنایت اللہ خاں کو حکیم فخرالدین محمد شیرازی
سے نسبت تلمذ حاصل تھی۔[۲] باپ کے انتقال کے بعد حکیم داؤد اپنی حذاقت
اور تجربہ کاری کے سبب شاہ عباس کا اور اس کے بعد شاہ صفی کا طبیب خاص ہو
۱۰۵۳ھ/۱۶۴۳ء میں ہندوستان آیا۔ اکبرآباد میں شاہ جہاں نے باریابی کا موقع
عطا کیا۔ ابتدا میں ہزار و پانصدی و دو صد سوار کا منصب اور بیس ہزار روپیہ
عنایت کئے گئے۔[۳] بادشاہ کی ملازمت میں آنے سے بیس دن قبل شاہ جہاں کی
بیٹی بیگم صاحب جل گئی تھی اور اس کی پشت پسلیوں اور دونوں ہاتھوں پر آگ
کا اثر تھا۔ اس کے علاوہ شہزادی بخار، دست اور ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کے
پپوٹوں کے ورم میں مبتلا تھی اطبا اور جراحوں کا علاج چل رہا تھا۔ حکیم داؤد نے
ان عوارضات کے علاج میں بڑی حذاقت کا ثبوت دیا۔ شہزادی جو زخموں کی
تکلیف کے سبب بخار میں مبتلا تھی، سرد ادویہ مثلاً کافور اور ترشیوں سے ان کا
تدارک کیا، ضعف قلب کے لیے ماءاللحم تجویز کیا، حکیم داؤد کی رائے میں دست

---

[۱] مآثر عالمگیری ص ۱۳۱

[۲] نزہتہ الخواطر جلد ۵ ص ۱۴۵

[۳] عمل صالح ص ۴۰۲

بند کرنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن حکیم مومنا نے انہیں روکنے کی طرف توجہ دلائی چنانچہ حکیم مومنا نے زیرہ سے دستوں کا علاج کیا۔ مگر اسی درمیان شہزادی کو سوء القنیہ ہو گیا حکیم داؤد نے آب کاسنی سبز اور معجون انزجی کا استعمال کیا۔ جس سے ورم میں کمی آئی۔ اور آثار تندرستی ظاہر ہونے لگے تھے کہ اسی دوران حکیم مسیح الزماں صدرا لاہور سے دہلی آیا اور علاج میں حکیم داؤد کے ساتھ شریک ہوا۔ اس نے نسخہ میں معجون وردی کا اضافہ کیا اور شہزادی صحت یاب ہوئی شاہ جہاں نے غسل صحت پر حکیم داؤد کو دو ہزاری منصب، خلعت، گھوڑا مع طلائی زین اور ہاتھی عطا کیا۔ سنہ ۲۰ جلوس میں تقرب خاں کا خطاب اور سنہ ۲۳ جلوس میں سہ ہزاری منصب، سنہ ۲۶ جلوس میں اکبر آبادی محل کے علاج کے صلہ میں تیس ہزار روپیہ اور منصب میں پانچ سو کا اضافہ سنہ ۲۷ جلوس میں چار ہزاری منصب عطا ہوا۔

ایک دن سو ہاتھی بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش ہوئے۔ حکیم داؤد نے ایک ہتھنی پسند کر کے علاء الملک کے کان میں آہستہ سے کہا کہ اگر بادشاہ یہ ہتھنی مجھے بخش دیں تو بہت اچھا ہو۔ ابھی یہ سرگوشی ختم نہیں ہوئی تھی کہ بادشاہ نے داؤد کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ ہم نے یہ ہتھنی تمہیں عطا کی۔ یہ واقعہ ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء کا ہے بادشاہ کی حکیم داؤد پر توجہ کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کے بھانجہ سے اپنی بیٹی کا عقد کرنے پر آمادہ تھا۔

سنہ ۳۱ جلوس میں شاہ جہاں حبس بول میں مبتلا ہوا اور سرد مدرات کے استعمال سے اسے سلس البول اور قبض کی شکایت ہو گئی۔ دربار کے بڑے بڑے حاذق اطبا کی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ حکیم داؤد کی حذاقت نے کام کیا۔ اس نے قبض کا شیر خشت سے علاج کیا۔ جس سے بہت فائدہ ہوا۔ بادشاہ تبدیل آب و ہوا کے خیال سے دہلی سے آگرہ گیا اور ماء اللحم اور طبیعت کو قوت دینے والی دوسری دواؤں سے صحت یاب ہو گیا اس خوشی میں پنج ہزاری منصب پر فائز کیا گیا۔

شاہ جہاں کی نظر بندی کے زمانہ میں اورنگ زیب نے اسے خدمت میں

مامور کیا اور تیس ہزار اشرفی بطور انعام دیں۔ لیکن بعد میں کسی وجہ سے اس پر عالمگیر کا عتاب ہوا۔[1]

فنی حذاقت اور علاجی کمالات کے علاوہ پودوں کے اثرات بڑھانے کے سلسلہ میں اس کا ایک کامیاب تجربہ تاریخوں میں محفوظ ہے۔ ریواس جو کابل کا پہاڑی پھل ہے اس کے متعلق ۱۰۵۶/۱۶۴۶ء میں اس نے کہا اگر اس کی جڑ میں ایک بالشت چوڑا گڑھا کھود کر برف سے بھر دیا جائے تو اس کی بالیدگی میں بیس گنا اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ برف کے پانی سے اس پودے کی نشو ونما کا تجربہ کیا گیا اور یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی۔ حکیم داؤد نے ۱۰۷۳/۱۶۶۳ء میں وفات پائی۔ اس کے بیٹے محمد علی خاں کو جو باپ کے ساتھ معزول کر دیا گیا تھا، اورنگ زیب نے خلعت اور ڈیڑھ ہزاری منصب عطا کیا۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں یہ ہمیشہ قرب شاہی سے سرفراز رہا ۱۰۷۴ھ/۱۶۶۳ء میں انتقال کیا۔[2]

حکیم نور الدین بن عبد اللہ

حکیم نور الدین عبد اللہ بن عین الملک شیرازی نامور علمی خاندان کا فرد ہے۔ عین الملک عہد اکبری کا ممتاز طبیب تھا اور دوائی تخلص کرتا تھا۔ طب میں فوائد الانسان اس کی مشہور کتاب ہے۔ نور الدین آگرہ میں پیدا ہوا، شاہ جہاں کے زمانہ میں جن طبیبوں نے شہرت حاصل کی ان میں اس کا درجہ علم و فضل کے اعتبار سے بہت بلند ہے۔ شاہ جہاں نے اسے عین الملک کے خاندانی خطاب سے سرفراز کیا۔ عہد عالمگیری میں بھی یہ مراحم خسروانہ سے نوازا گیا اور دیوان بیوتات کے عہدہ پر فائز ہوا۔[4]

---

[1] اطبائے عہد مغلیہ ص ۸۹ بحوالہ منتخب اللباب جلد ا ص ۷۶۹ و ۷۱۵

[2] نزہتہ الخواطر جلد ۵ ص ۱۲۵

[3] مآثر الامرا جلد ا ص ۴۹۰ تا ۴۹۳

[4] عالمگیر نامہ ص ۳۴۴

طب کے علاوہ شعر و ادب اور تصوف سے خاص ذوق تھا۔ یوں درجن کتابیں اس کی یادگار ہیں۔

۱۔ طب دارا شکوہی :- دارا شکوہ کے نام معنون ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء کی یہ تصنیف معالجات کی اہم کتابوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ اس میں قدیم اطبا کے اقوال و مجربات کے علاوہ اطبا ہند کے معمولات بھی درج کئے گئے ہیں، اور آیور ویدک کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ دو حصوں پر مشتمل اس ضخیم کتاب سے عہد مغلیہ کے طبیبوں کے طریقہ مطب، جہت علاج اور فن نسخہ نویسی کے مطالعہ میں مدد ملتی ہے۔

۲۔ سبب سنہ رشیدیہ :۔ حفظ صحت سے متعلق ہے، اور صحت کے لیے چھ ضروری امور پر اس میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

۳۔ انیس المعالجین :۔ مطبع نول کشور سے متعدد بار طبع ہوئی ہے۔

۴۔ الفاظ الادویہ :۔ علم الادویہ سے متعلق ہے۔ حروف تہجی کی ترتیب سے مفرد اور مرکب دوائیں بیان کی گئی ہیں۔ دواؤں کے مترادف نام لکھنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ کتاب کا سال تصنیف ۱۰۳۸ھ ہے اور یہ شاہجہاں کے نام منسوب ہے ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ کے علاوہ دوسرے مطابع سے متعدد بار طبع ہوئی ہے۔

۵۔ قسطاس الاطبا :۔ طبی لغت ہے۔ ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء کی مرتبہ اس کتاب کو اپنے ولی نعمت حکیم امان اللہ خان زمان فیروز جنگ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ "الفاظ جید طب" اور "تحفہ" سے تاریخ ۱۰۴۰ برآمد ہوتی ہے۔

۶۔ مراتب الوجود :۔ توحید اور وجود باری پر بحث کی گئی ہے۔ یہ ۱۰۳۸/۱۶۲۸ کی تصنیف ہے اور شاہجہاں کے نام معنون ہے۔

۷۔ واقعات ابوالفضل :۔ ابوالفضل کے خطوط جو اس نے مختلف لوگوں کو لکھے ہیں جمع کئے ہیں۔

۸۔ لطائف فیضی :۔ فیضی کے خطوط ہیں جنہیں اس نے ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء میں جمع کیا تھا۔
۹۔ انشائے غیاث دانش :۔ ادبی خطوط کا مجموعہ ہے، جنہیں اس نے بعہد جہانگیر مرتب کیا تھا۔ نور الدین کا بیٹا شمس الدین بھی طبیب تھا اور نور جہاں کے باپ اعتماد الدولہ مرزا غیاث بیگ کا طبیب خاص تھا، دیباچہ کے مطابق اس نے اپنی کتاب طب غیاثیہ ولی نعمت مرزا غیاث بیگ کے نام سے موسوم کی ہے۔ طب غیاثیہ کا مخطوطہ انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن حیدر آباد میں محفوظ ہے۔

حکیم محمد مہدی اردستانی

حکیم محمد مہدی ایران میں پیدا ہوا اور وہیں کے اساتذہ سے تعلیم پائی اورنگ زیب کے عہد میں ہندوستان آیا، اورنگ زیب کے درباری اطبا میں حکیم مہدی اور حکیم محمد امین شیرازی بادشاہ کے خاص معتمد تھے، اور شاہی خاندان کے خصوصی معالج کی حیثیت سے امتیاز رکھتے تھے۔ ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء میں عالمگیر ان کے علاج سے شفایاب ہوا اور یہ انعام و عطایا سے نوازے گئے۔

حکیم مہدی عالمگیر کی طرف سے یک ہزاری منصب پر ممتاز تھا۔ ۱۰۷۳/۱۶۶۳ء میں اسے حکیم الملک کا خطاب ملا[1] ۱۱۰۴ھ/۱۶۹۲ء میں شہزادہ محمد اعظم کے مرض استسقا کا اس نے جس کامیابی سے علاج کیا اس کی تفصیل مآثر عالمگیری میں پیش کی گئی ہے اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہزادہ کا مرض مایوسی کے کس درجہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے جن دواؤں سے علاج کیا ان میں معجون الذہب بھی شامل تھی۔ اس کے صلہ میں ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۳ء میں دو ہزار اشرفی، خلعت اور ہاتھی انعام میں دیے گئے۔ منصب میں ترقی ہوئی اور یہ چار ہزاری تک پہنچا۔[2]

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۳۵۷ (بحوالہ مآثر الامراء)
[2] مآثر عالمگیری ص ۳۶۲

اس کے مجربات پر مشتمل ایک کتاب منتخب الشفا کا مخطوطہ محمد عمران خاں صاحب کے ذاتی ذخیرہ میں ہے[1] مگر انہوں نے مغالطہ سے اسے حکیم اکبر ارزانی کی تصنیف سمجھا ہے۔

حکیم محمد کاظم

عالمگیر کے خاص طبیبوں میں تھا۔ پانچ صدی منصب عطا ہوا تھا۔ اس نے متعدد مثنویاں لکھی ہیں جن میں آئینہ خانہ، پری خانہ، ملاحت احمدی، صباحت یوسفی کمال محمدی ہیں۔[2] اس نے اپنی کلیات انفاس مسیحی کے نام سے مرتب کی تھی۔ خود ستائی اور خود بینی بہت تھی۔ خود ہی مسیح البیان کا خطاب اختیار کر لیا تھا۔ صاحب تخلص تھا[3]

حکیم محمد امین شیرازی

عالمگیر کے عہد حکومت میں ڈیڑھ ہزاری منصب پر فائز تھا۔ یہ منصب اسے آغاز جلوس ہی میں حاصل ہو گیا تھا۔ متعدد موقعوں پر انعامات سے نوازا گیا۔ اس عہد کے طبیبوں میں حکیم امین اور محمد مہدی اردستانی بہت حاذق سمجھے جاتے تھے یہی دونوں بادشاہ کا علاج کرتے تھے۔ سنہ ۵ جلوس ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء میں اورنگ زیب کو بخار اور سوء مزاج کی شکایت ہوئی۔ ان لوگوں نے بادشاہ کی فصد کھلوائی اور علاج شروع کیا۔ بادشاہ کا بخار بہت شدید تھا، بار بار غشی طاری ہو جاتی تھی چونکہ فصد میں کافی خون نکالا گیا تھا اس لیے کمزوری بھی موجود تھی۔ رات بھر میں بادشاہ

---

[1] طب اسلامی برصغیر۔ ص ۲۶۴

[2] بزم تیموریہ ص ۲۷۲

[3] نزہۃ الخواطر۔ جلد ۲ ص ۳۵

کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ تمام رات محل کی عورتوں کا ہجوم رہا۔ سب بے قرار اور مضطرب تھیں۔ دوسرے ہفتہ میں مرض میں اتنی زیادتی ہوئی کہ متواتر تین روز تک بادشاہ آرام گاہ خاص سے باہر نہ آسکا۔ پہلی بیماری میں بعض اور عوارض شریک ہو گئے اس بیماری میں حکیم محمد امین اور حکیم محمد مہدی اتفاق رائے سے علاج کر رہے تھے۔ دونوں نے محنت اور دلچسپی سے مناسب تدابیر کیں اور بادشاہ کو صحت حاصل ہوئی۔[1]"

معتمد خاں نے تاریخ محمدی میں محمد امین شیرازی کو حاذق خاں سے مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "۷۷ برس کی عمر میں ۱۶ ذی قعدہ ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء کو دہلی میں فوت ہوا[2]" معتمد خاں کا یہ بیان عالمگیر کے پہلے جلوس یعنی ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء میں ڈیڑھ ہزاری منصب پر فائز ہوتے اور ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء میں عالمگیر کے کامیاب معالجہ کی روایت کی روشنی میں کیسے درست ہو سکتا ہے۔ جب کہ ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء میں ۴۷ برس کی عمر میں وفات کے حساب سے محمد امین کی پیدائش ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۴ء قرار پاتی ہے۔ میرے نزدیک تاریخ محمدی کا یہ اندراج یقینی طور پر صحیح نہیں ہے۔

حکیم معصوم خاں

صاحب علم اور صاحب نظر طبیب تھا۔ شیراز سے تحصیل طب کے بعد ہندوستان آیا اور شہزادہ محمد اعظم شاہ کی سرکار سے وابستہ ہوا۔ اس نے غالباً سوء القنیہ کی علامات دیکھ کر شہزادہ کو استسقا کے خطرہ سے آگاہ کیا تھا اور مناسب پرہیز اور علاج کا مشورہ دیا تھا۔ شہزادہ نے خیال نہیں کیا اور حکیم معصوم کے انتقال کے

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۵۰۷

[2] تاریخ محمدی ص ۷۶

دو برس بعد ۱۱۰۴ھ/۱۶۹۲ء میں شدید استسقا میں مبتلا ہوا۔ حکیم معصوم ۱۱۰۲ھ ۱۶۹۰ء میں فوت ہوا تھا۔[1]

حکیم نعمت خاں عالی

مرزا محمد علی نام تھا۔ لیکن نواب نعمت خاں عالی سے شہرت ہوئی، ہندوستان میں پیدا ہوا۔ صغر سنی میں باپ کے ساتھ شیراز گیا اور وہیں تعلیم پائی۔ ہندوستان آیا تو شفیعائی یزدی مخاطب بہ دانش مند خاں کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا۔ طب کے آبائی پیشہ سے وابستہ رہا۔ باقاعدہ مطب کرتا تھا۔ اس کے والد حکیم فتح الدین بھی لائق طبیب تھے۔ حکیم محسن خاں اور حکیم الملک حکیم حاذق خاں بھی اس کے عزیزوں میں تھے۔

حکیم نعمت خاں اورنگ زیب کے ملازمان خاص میں تھا۔ شاہی فوج کے وقائع نگار کی حیثیت سے اسے دکن بھیجا گیا تھا۔ اورنگ زیب نے ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۵ء میں جب حیدر آباد فتح کیا تو عالی نے یہ تاریخ کہی۔

از نصرت بادشاہ غازی   گردید دل جہانیان شاد
آمد بقلم حساب تاریخ   شد فتح بجنگ حیدر آباد

اورنگ زیب نے خوش ہو کر خلعت وانعام دیا۔ حیدر آباد سے دہلی واپس کر ۱۱۰۱ھ ۹۰-۱۶۸۹ء میں عالی نے مکان تعمیر کیا۔ اس کی درج ذیل تاریخ کہی ۔

ز ملک دکن آمدم سوئے دہلی   چو از ظلمت آید کسی جانب ضو
بنا کردم این جا و تاریخ گفتم   الٰہی مبارک کنی خانہ نو

دو برس بعد اس نے دہلی میں دیوان خانہ بنوایا۔ اس کی تاریخ کا یہ قطعہ کہا ۔

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۳۶۱

الحمد لواہب العطا یا | اتمام نمودم این بنا را
ہاتف پئ سال آں ندا داد | این خانہ ہمیشہ آباد باد

۱۱۰۴ھ/۹۲-۱۶۹۲ء میں اورنگ زیب نے نعمت خاں کا خطاب اور باورچی خانہ کا داروغہ مقرر کیا۔ عالیؔ نے اس واقعہ کی تاریخ "شکر نعمت واجب" سے نکالی۔

آخر عہد میں اورنگ زیب نے مقرب خاں کے خطاب سے سرفراز کیا اور جواہر خانہ نگین دولت کا داروغہ بنایا۔ بہادر شاہ کے زمانہ میں دانشمند خاں کا خطاب ملا۔[۱] سہ ہزاری منصب عطا ہوا۔ بہادر شاہ نامہ لکھ رہا تھا کہ زندگی کو خیر باد کہا۔ سال وفات ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء ہے۔[۲] بعض لوگوں نے دہلی اور بعض نے حیدرآباد اور لاہور جائے وفات لکھی ہے۔

اس کی تصانیف میں وقایع نعمت خاں عالی مشہور ہے۔ دوسری کتابوں میں خوان نعمت، نغلکات، رقعات نعمت خاں، جنگ نامہ، حسن و عشق، کلیات عالی، سخن عالی (اس میں ہجو بھی شامل ہیں مثلاً ہجو حکما، مناظرہ اطبا وغیرہ) ہیں۔

ہندوستان کے فارسی شعرا میں عالی بڑا طنز نگار اور ہجو نویس تھا، اس لئے لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اورنگ زیب اس کی دریدہ دہنی سے واقف تھا، لیکن وہ قصداً اغماض کرتا تھا۔ ایک بار کامگار نامی امیر کی شادی کے موقع پر اس نے ہجو لکھی تو امیر نے اورنگ زیب سے شکایت کی، مگر بادشاہ نے درگزر سے کام لیا۔

ابتدا میں طب کی مناسبت سے حکیم تخلص اختیار کیا تھا، بعد میں دانشمند خاں کے کہنے سے عالیؔ تخلص کیا۔ اس کے کلام میں طبی اصطلاحات کثرت سے ملتی ہیں۔ وقایع حیدرآباد، مجموعہ انشا اور جنگ نامہ کے نسخے مولانا آزاد علی گڑھ میں موجود ہیں۔

---

[۱] نزہتہ الخواطر جلد ۶ ص ۲۷۵ صاحب نزہتہ نے شفیقائی کی جگہ شفیع لکھا ہے۔

[۲] مآثر الکرام ص ۱۳۶

نواب خیراندیش خاں

نواب خیراندیش خاں میرٹھی (بن نواب محبت خاں بن نواب اسد خاں بن نواب دادن خاں) کا اصل نام محمد خان تھا، شاہی خطاب خیراندیش خاں سے مشہور ہوئے یہ بڑے مدبر دانشور اور فیاض امیر تھے۔ ان کے اسلاف و اخلاف بھی انہی کی طرح نامور گزرے ہیں۔

خیراندیش خاں نے جلد ہی علوم میں فضیلت اور طب میں حذاقت حاصل کی۔ اور انشاپردازی اور خوش نگاری میں ممتاز ہوئے۔ اکتساب کمالات علمی کے بعد دارا شکوہ کے متوسل ہوئے، اس کے قتل کے بعد اورنگ زیب کی بارگاہ میں آئے۔ پنج ہزاری منصب پایا، خیراندیش خاں کے خطاب سے نوازے گئے۔ اٹاوہ کے فوجدار مقرر ہوئے۔ بہادر شاہ کے عہد میں شش ہزاری منصب پر پہنچے، اورنگ زیب ان کی کارگزاری اور حسن عمل سے بہت مطمئن تھا۔ اس کا اظہار اس رقعہ سے ہوتا ہے جو اس نے عمدۃ الملک اسد خاں مدار المہام کے نام لکھا ہے[1]

مآثر عالمگیری میں مرزا محمد ساقی مستعد خاں نے پینتالیسویں جلوس (۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء) کے واقعات کے ضمن میں لکھا ہے کہ خیراندیش کنبو فوجدار اٹاوہ کو سات لاکھ دام انعام ملے اور دہاموتی کی فوجداری بھی پائی۔[2]

خیراندیش خاں کو سیاسی اور ملکی مصروفیات کے ساتھ ہی طب سے بے حد شغف تھا۔ انہوں نے جہاں اٹاوہ میں ایک شاندار شفاخانہ قائم کیا وہاں

---

[1] رقعات عالمگیری ص ۳۷

[2] مآثر عالمگیری ص ۴۴۴

خیر التجارب جیسی علمی کتاب تصنیف کی۔ اس کا سال تصنیف ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء ہے۔
خیر اندیش خاں نے تین بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ کتاب المشاہیر کے مطابق ۱۲۰ برس کی عمر میں بروز عید الفطر ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء کو وفات پائی۔ تاریخ وفات "نواب نماز عید در جنت کرد" ۱۱۲۲ "قدسیان گفتند رکن الخیر بود" اور "بخیر الامرا" سے بھی برآمد ہوتی ہے۔ یوم عید بہ بہشت رسید بھی مادہ تاریخ ہے، مگر اس سے ۱۱۲۳ برآمد ہوتے ہیں۔ خیر اندیش کے بیٹے محمد فاضل خاں کو اورنگ زیب نے نیک اندیش خاں کا خطاب مرحمت کیا تھا ان کے پوتے محمد مسیح بن محمد فاضل کو بھی اورنگ زیب نے منصب یک ہزاری اور خطاب نیک اندیش خاں عطا کیا تھا۔ عالمگیر کے آخری عہد میں یہ ہزاری منصب پر پہنچے۔ دادا کی وفات کے بعد بہادر شاہ نے شش ہزاری منصب، علم، نقارہ اور خیر اندیش خاں ثانی کا خطاب دیا۔ ان کے اخلاف جہاں مغلیہ درباروں سے وابستہ اور امرا شاہی میں رہے وہاں علم و فضل اور طب سے ان کا خصوصی تعلق قایم رہا۔ نواب خیر اندیش ثانی کے پوتے حکیم بندہ علی خاں ماہر طبیب اور معزز بن عصر تھے۔ بریلی میں سکونت پذیر رہے۔ اس خاندان کے حکیم طالب علی خاں اور ان کے فرزند حکیم غالب علی خاں بھی تجربہ کار طبیب تھے۔[1]

شیخ عبد الحق کرنالی

بڑے فاضل اور لایق شخص تھے۔ انشا میں دست کمال رکھتے تھے [illegible] میں مہارت حاصل تھی، ۲۱ شعبان ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء دہلی میں وفات پائی۔[2]

---

[1] المشاہیر ص ۱۵۶ و ۱۵۷

[2] تاریخ محمد شاہی جلد ۲ ص ۶ نیز ص ۱۴۱

حکیم حسن علی

حکیم محمد امین کے بیٹے تھے۔ اپنے زمانہ کے حاذق طبیبوں میں شمار تھا۔ دہلی میں ۱۱۲۷ھ/۱۷۱۴ء وفات ہوئی۔[۱]

حکیم ارشد

حاذق طبیب تھے۔ دہلی میں ۲۹ صفر ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۵ء کو فوت ہوئے۔[۲]

حکیم محمد ہادی

ابفراط خاں کے خطاب سے سرفراز تھے، شہر میں ان کی حذاقت کا شہرہ تھا۔ ذی قعدہ ۱۱۲۹ھ/۱۷۱۶ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔[۳]

حکیم محمد تقی ذوالفقار خاں

مخاطب بہ حکیم علی نقی خاں، معالجہ میں دسترس حاصل تھی۔ رمضان ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء میں دہلی میں سفر آخرت اختیار کیا۔[۴]

---

[۱] تاریخ محمد شاہی جلد ۲ ص ۴۴

[۲] ایضاً ص ۳۵

[۳] ایضاً ص ۳۷   [۴] ایضاً ص ۴۸

حکیم اکبر ارزانی

حکیم محمد اکبر ارزانی محمد مقیم حنفی دہلوی کے صاحبزادہ تھے۔ ان کے علمی کاموں کا سلسلہ اورنگ زیب کے عہد سے فرخ سیر کے دور تک پھیلا ہوا ہے، برہانپور ایک عرصہ قیام رہا۔ عام روایت کے مطابق برہانپور ہی میں ۱۱۳۴ھ/۲۱-۱۷۲۱ء میں انتقال کیا، لیکن تاریخ محمدی میں ہے کہ اواسط ربیع الثانی میں دہلی میں وفات پائی[1] تذکرہ علماء ہند میں انہیں حکیم ارزانی دہلوی سے متعارف کرایا گیا ہے۔ یہ خاندان قادری میں بیعت تھے اسی تعلق سے ایک کتاب قرابادین قادری کے نام سے موسوم کی ہے، مطب اور طبی کتابوں کی تصنیف میں زندگی گزاری[2]

ارزانی سے پہلے ہندوستان میں فارسی میں طب پر بکثرت کتابیں لکھی جاچکی تھیں۔ لیکن طب کی تعلیمی زبان عربی تھی اور عربی کتابیں ہی نصاب میں پڑھائی جاتی تھیں ارزانی نے محسوس کیا کہ یہاں کے عام باشندے عربی سے ناواقف ہیں۔ زبان نہ جاننے کی وجہ سے انہیں طب کی تعلیم میں دشواری پیش آتی ہے، اور بہت سے طلبہ اس سے محروم رہتے ہیں۔ اس نے نصابی کتابوں کو عربی سے فارسی میں منتقل کرنے کا بیڑا اٹھایا، جس سے غیر عربی داں طلبہ کے لیے تعلیمی سہولت پیدا ہوئی اور طب ان کے واسطے ارزاں اور آسان بنی۔ بعض لوگوں نے اسی کو ارزانی کی وجہ تسمیہ قرار دیا ہے[3] بعض کا خیال ہے کہ وہ جس بزرگ سے بیعت تھے ان کا نام

---

[1] تاریخ محمدی ص ۵۴ (بحوالہ عصری)

[2] تذکرہ علماء ہند ص ۱۲ اس تذکرہ میں طب اکبر کا سال تالیف ۱۱۰۸ درج ہے جو درست نہیں ہے۔

[3] قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین ص ۲۱۶

ارزاں شاہ تھا انہی کی نسبت سے یہ ارزانی کے نام سے مشہور ہوئے۔

پہلی کتاب طب اکبر ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں مکمل ہوئی ہے، اورنگ زیب کے نام منسوب یہ کتاب شرح اسباب و علامات کا کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ ترجمہ ہے۔ شرح اسباب و علامات اس کا تاریخی نام ہے، اس میں سے حروف علت چار الف اور ایک واؤ نکالنے سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ قرابادین قادری ان کی آخری کتاب ہے جس کی تالیف سے وہ ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۸ء میں فارغ ہوئے تھے[1] دوسری کتابوں میں میزان الطب (تالیف ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء) مفرح القلوب، مجربات اکبری، حدود الامراض، منتخب اکبری، طب نبوی، علاج الصبیان، طب ہندی اور تشریح الموسیقی ہیں۔

حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی

عربی النسل تھا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بحرین کے صحرانشینوں سے تعلق رکھتا تھا۔ ہندوستان آنے سے پہلے شیراز میں مقیم رہا، وہاں کے اساتذہ سے اعلیٰ علوم خصوصاً طب کا اکتساب کیا۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان آیا۔ پہلے حیدرآباد اور پھر دہلی میں اقامت اختیار کی۔ شہزادہ محمد اعظم کی سرکار سے طبیب کی حیثیت سے وابستہ ہوا۔ اس کے قتل کے بعد شہزادہ معظم (بہادر شاہ) کی خدمت میں آیا، اور بہادر شاہی عہد میں شاہی دربار سے وابستہ ہوا۔ فرخ سیر کے زمانہ میں اس کی منزلت قائم رہی۔ فرخ سیر نے اور ایک روایت کے مطابق محمد شاہ نے حکیم الممالک کا خطاب عطا کیا۔ محمد شاہ کے عہد میں ادائیگی حج کے بعد دوبارہ شاہی ملازمت میں آیا اور چہار ہزاری منصب سے نوازا گیا[2]

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۲۸۱

[2] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۷۰ (بحوالہ شمع انجمن)

حذاقت کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا شاعر تھا. شہرت تخلص کرتا تھا[۱] دہلی میں ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء میں ۹۰ برس کی عمر میں انتقال ہوا[۲]

غلام علی آزاد بلگرامی نے حسب ذیل تاریخ وفات لکھی ہے

بے نظیر زمانہ شیخ حسین — گوئے معنی ز نکتہ سنجان برد

ہاتفے از برائے رحلت او — سال تاریخ گفت شہرت مرد

شہرت نے پانچ ہزار بیت کا ایک دیوان یادگار چھوڑا[۳] شیخ حسین اپنی فنی مصروفیتوں کے ساتھ شعروادب میں بھی وقت صرف کرتا تھا. شعروادب میں اس کا جو رتبہ تھا وہ اس کے ضخیم دیوان اور آزاد بلگرامی کی تاریخ سے ظاہر ہے. سراج الدین علی خاں آرزو نے انہیں دیکھا تھا. ان کا بیان ہے کہ بہت ہشاش بشاش اور لطیفہ گو تھے[۴]

حکیم محمد حسین شیرازی

یہ حکیم محمد حسین شہرت کے ہم نام اسی دور کے نامور طبیب ہیں، حذاقت خاں کا خطاب تھا، آخر رجب یا شروع شعبان ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء میں دہلی میں فوت ہوئے. ان کے بیٹے اہلیت خاں باپ کی طرح ممتاز اور خطاب یافتہ تھے، ۷۰ برس کی عمر میں ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء میں اہلیت خاں کا انتقال ہوا[۵]

---

[۱] مآثر الکرام جلد ۲ ص ۲۰۱

[۲] تاریخ محمدی ص ۹۰، قاموس المشاہیر جلد ۲ ص ۱۸۸

[۳] اطبائے عہد مغلیہ ص ۸۲. بحوالہ قاموس المشاہیر جلد ۲ ص ۱۸۸

[۴] مجمع النفائس ص ۵۸

[۵] تاریخ محمدی جلد ۲ ص ۶۰ و ۱۳۴

حکیم یار علی خاں شفا

مختلف علوم خصوصاً فن طب میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے[1]، دست شفا حاصل تھا[2] باطن نے ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے "بیمار سخن کو معالجہ حکیم طبع سے شفا، نسخہ قرابادین طبع کا مریضان مضمون نظم کے واسطے دوا[3]" ان کا تعلق اسرائیلی خاندان سے تھا[4] یہ قدیم شعرا میں ہیں ان کے اشعار اس زمانہ کے محاورہ سے تعلق رکھتے ہیں[5] فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے[6]

نساخ نے انہیں محمد علی حشمت یا ولی دکنی کا معاصر لکھا ہے[7]. ولی دکنی کا دیوان ۱۱۳۲ھ ۱۷۲۰ء میں دہلی آیا تھا[8]

حکیم حاذق خاں

حکیم محمد حاذق خاں ابن حکیم محسن خاں ابن حکیم صالح ابن حکیم فتح اللہ شیرازی دہلی

---

[1] مخزن نکات ص ۳۵
[2] تذکرہ میر حسن ص ۱۰۲
[3] گلستان بے خزاں ص ۱۲۲
[4] گلشن بے خار ص ۱۱۰
[5] عمدہ منتخبہ ص ۳۷۰
[6] یادگار شعرا ص ۱۰۱
[7] سخن شعرا ص ۲۸۷
[8] بایوگرافیکل ڈکشنری ص ۴۱۴

کے نہایت ممتاز طبی خانوادہ کا فرد تھا۔ حکیم فتح الدین اور حکیم نعمت خاں عالی بھی اسی خاندان طب سے تعلق رکھتے تھے۔ حکیم حاذق خاں اورنگ زیب کا معالج تھا، ۱۱۱۶ھ ۱۷۰۵ء میں اورنگ زیب کا اس نے بڑا کامیاب علاج کیا تھا، اس علاج میں چوب چینی کے استعمال سے بادشاہ کو صحت ہوئی تھی۔ اس حسن خدمت پر اشرفیوں سے تولا گیا اور ساری اشرفیاں اسے انعام میں دے دی گئیں۔ حکیم الملک کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا، تاریخ ہندوستان میں مذکور ہے کہ بادشاہ نے اپنے کو سونے میں تلوا کر وہ سونا مع سرنبچ حکیم کو عطا کیا۔[۱]

بہادر شاہ کے عہد میں بھی اس کا اعزاز برقرار رہا، اور یہ سہ ہزاری و یک ہزار سوار کے منصب پر فائز ہوا۔ اور متعدد موقعوں پر انعامات سے نوازا گیا۔ کچھ عرصہ بادشاہ کے عتاب کا شکار رہا،[۲] محمد شاہ کے عہد میں پھر اس کی بلندی کا ستارہ چمکا۔ حکیم الملوک کا خطاب عطا ہوا اور پنج ہزاری منصب پر پہنچا۔[۳]

تاریخ محمدی میں اس کے درج ذیل خطابات مذکور ہیں "حکیم محمد حاذق خاں المخاطب بہ حاذق خاں ثم بہ حکیم الملک ثم بہ حکیم معتمد الملک بہادر شاہی ثم بہ حکیم مؤتمن الملک ثم بہ حکیم معتبر الملوک" اس قدر خطابات سے نہ صرف یہ کہ کوئی طبیب مفتخر نہیں ہوا بلکہ مغلیہ عہد کے امراء میں سے کم لوگ اتنے خطابات سے نوازے گئے ہیں۔ اس کا شمار کبار امراء ہند میں ہے۔ ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء کو دہلی میں ۷۶ برس کی عمر میں وفات پائی، یہ حاجی شفیع خاں کا داماد تھا۔[۴]

حکیم الملک کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ملتا ہے کہ دلی میں اس زمانہ میں سوانگیوں

---

[۱] اطبائے عہد مغلیہ ص ۵۷ بحوالہ منتخب اللباب ص ۵۳۸ و ۵۳۹ نیز تاریخ ہندوستان جلد ۸ ص ۴۶۱

[۲] مآثر الکرام ص ۱۳۶

[۳] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۶۱ [۴] تاریخ محمدی جلد ۲ حصہ ۶ ص ۷۶

اور بہروپیوں کا بڑا زور تھا، جو ہر روز ہر طرح کے بھیس بدل کر لوگوں کے سامنے آتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر پیشہ ور تھے اور اسی کے ذریعہ اپنی روزی کماتے تھے۔ محمد شاہ کے وقت میں بہترین بہروپیا عنایت تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن بادشاہ کے ذاتی معالج حکیم الملک اداس لال قلعہ میں آئے اور بادشاہ سے عنایت کی شکایت کی کہ وہ ان کا بہروپ بھر کر دربار میں آجاتا ہے، بادشاہ نے ناراض ہو کر حکم دیا کہ اگر آیندہ عنایت حکیم الملک کا بھیس بدل کر دربار میں آئے تو اس کی پٹائی کی جائے اور کوڑے لگائے جائیں۔ یہ بات اگلے کچھ دنوں میں ہی ہو گئی اور عنایت کو مار کر دربار سے نکال دیا گیا۔ بعد میں اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ جس نے شکایت کی تھی وہ عنایت تھا اور جسے مار کر دربار سے نکالا گیا تھا وہ خود حکیم الملک تھے۔[1]

حکیم کمال الدین اصفہانی

ماہر طبیب تھے۔ دہلی میں ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں وفات ہوئی۔[2]

حکیم محمد جعفر جونپوری

زندگی بھر دہلی میں رہے۔ درس اور معالجہ میں یکتا سمجھے جاتے تھے۔ ۸۵ برس کی عمر میں اوایل رمضان ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں دہلی میں رحلت کی۔[3]

---

[1] عالم میں انتخاب دلی ص ۳۲۵

[2] تاریخ محمدی جلد ۲ حصہ ۶ ص ۶۳

[3] ایضاً ص ۶۳

حکیم محمد حسین

بقراط خاں کے خطاب سے مفتخر تھے اور دہلی کے نامور طبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد حکیم معصوم خاں اور دادا حکیم محمد محسن یزدی دہلی کے مشہور طبیب تھے۔ بقراط خاں نہ صرف کامیاب مطب کے مالک تھے بلکہ وسیع حلقہ درس رکھتے تھے ان کے ایک شاگرد حکیم مظفر بن محمد قاسم ہروی نے اپنی کتاب سراج العلاج میں ان کے اور ان کے والد حکیم معصوم خاں کے حوالے سے متعدد نسخے درج کئے ہیں[1] شب پنجشنبہ ۷ محرم ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء دہلی میں فوت ہوئے[2]

حکیم محمد جعفر مشہدی

اپنے خطاب حذاقت علی خاں سے شہرت رکھتے تھے۔ ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء میں غالباً شعبان میں دہلی میں انتقال ہوا[3]

حکیم محمد کاظم

حکیم محمد کاظم بن حکیم حیدر علی تستری دہلوی نہایت حاذق طبیب اور مصنف تھے محمد شاہ نے نواب حاذق الملک کا خطاب عطا کیا تھا۔ اکمل الصناعۃ (دو جلد) اور

---

[1] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۱۲۲

[2] تاریخ محمدی جلد ۲ حصہ ۶ ص ۷۸

[3] ایضاً ص ۸۵

جامع الصناعہ عربی میں ان کی دو مشہور کتابیں ہیں، یہ دونوں علی بن عباس اہوازی کی کامل الصناعۃ کی تلخیص کے بطور لکھی گئی ہیں۔ اکمل الصناعہ کا سال تصنیف ۱۱۴۹ھ/ ۱۷۳۶ء ہے۔ حکیم محمد کاظم نے ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء میں وفات پائی[1] یہ دونوں کتابیں رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہیں۔ ان کی ایک کتاب فرح نامہ فاطمہ بھی ہے جو ۱۱۵ھ/۱۲۱۳ء کی تصنیف ہے[1]

حکیم ابن رمضان بیگ مازندرانی

محمد شاہ کے زمانہ میں ممتاز رہے، اسباب النشاط کے نام سے جنسیات پر ایک کتاب کے مصنف ہیں۔ ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء کی اس کتاب کا انتساب محمد شاہ کے نام کیا گیا ہے۔

حکیم مرزا محمد گیلانی

حکیم حاذق شیخ فاضل مرزا محمد بن ابو محمد گیلانی نے محمد شاہ کے زمانہ میں امراض باہ پر کتاب مطلب المباشرت تصنیف کی[2] طب کے جنسیاتی ذخیرہ کی اچھی کتابوں میں اس کا شمار ہے۔

حکیم ہدایت اللہ

محمد شاہی عہد میں دہلی میں جن طبیبوں نے شہرت حاصل کی ان میں حکیم ہدایت اللہ

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد ۶ ص ۳۴۶ [1] قاموس المشاہیر جلد ۲ ص ۱۴۹

[2] نزہتہ الخواطر جلد ۶ ص ۲۵۶ (بحوالہ محبوب الالباب)

بہت ذی علم اور حاذق معالج تھے۔ سیر العلاج کے نام سے ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء میں انہوں نے علاج امراض پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں آسان اور سہل الحصول دوائیں درج کی ہیں۔[1]

حکیم عابد سرہندی

سید محمد عابد سرہندی اگرچہ سرہند کے رہنے والے تھے۔ لیکن ساری عمر دہلی میں رہے۔ محمد شاہی عہد کے نہایت فاضل طبیبوں میں شمار ہے۔ معالجہ کے ساتھ ہی درس کا وسیع سلسلہ تھا۔ حکیم شریف خاں جیسے نامور طبیب کی استادی کا بھی انہیں شرف حاصل ہے۔

عابد سرہندی نے نجیب الدین سمرقندی کی کتاب اسباب و علامات کی شرح لکھی ہے، ان کی یہ شرح طبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء کی یہ شرح محمد شاہ (۱۷۱۹-۱۷۴۸ء) کے نام معنون ہے، راجپور میں ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء کا مرقومہ نسخہ موجود ہے۔[2]

حکیم عابد کا ذی الحج کے پہلے عشرہ میں ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء میں دہلی میں اچانک انتقال ہوا۔ ۷۰ برس کی عمر تھی۔[3] سراج العلاج میں ان کے حوالے ملتے ہیں۔[4]

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۳۲۷

[2] قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین ص ۱۲۶

[3] تاریخ محمدی ص ۱۰۴

[4] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۱۲۲

حکیم غریب اللہ نیوتنی

شیخ فاضل حکیم میر غریب اللہ بن محی الدین حسینی نیوتنی دہلوی اپنے زمانہ میں طب کے نہایت معروف لوگوں میں تھے۔

اودھ میں ابتدائی تعلیم کے بعد حصول علم کے لیے دہلی کا رخ کیا، وہاں حکیم محمد جعفر جونپوری کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ حکیم محمد جعفر کو اس فن میں حکیم محمد مصری اکبرآبادی سے نسبت تلمذ تھی[1] فراغت کے بعد دہلی ہی میں مقیم رہ کر مطب کا کامیاب سلسلہ شروع کیا، اور محمد شاہی عہد میں ممتاز ہوئے۔ دہلی میں وفات پائی۔

حکیم غریب اللہ کا خاندان طبی حیثیت سے مشہور رہے، حکیم میر امام الدین ان کے صاحبزادہ تھے۔

خاندان شریفی

دہلی جن تہذیبی اقدار سے عبارت ہے ان میں ایک بہت اہم قدر طب یونانی ہے طب یونانی نے جس طرح دہلی میں فروغ پایا اور دہلوی اطبا نے اسے سنوارنے اور نکھارنے میں جو تاریخی کردار ادا کیا۔ اس کی وجہ سے جہاں دہلی اس فن کا گہوارہ بنا وہاں ہندوستان بھر میں ان کے ذریعہ اس فن کی ترویج و اشاعت ہوئی، دہلی کے عام اطبا کی فنی کاوشوں کے احترام کے ساتھ، بلاشبہ اس میں سب سے نمایاں حصہ اطبا خاندان شریفی کا ہے۔ یہ خاندان نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک کے لیے باعث نازش و افتخار ہے، اس نے درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور علاج معالجہ کے ذریعہ

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد ۶ حصہ ۱۹۹۔ بحوالہ تاریخ فرخ آباد مفتی ولی اللہ۔

طب کی منتہم بالشان خدمات انجام دی ہیں، تفسیر حدیث تصوف، تاریخ، تذکرہ اور شعر و ادب کے ساتھ تہذیبی، تمدنی اور سیاسی اعتبار سے قومی تاریخ میں بھی اس کا شاندار حصہ ہے۔ اس دودمان عالی کا نسبی سلسلہ خواجہ عبیداللہ احرار (وفات ۸۹۵ھ/۱۴۸۹ء) سے ہے۔ ہندوستان آنے سے پہلے اس خاندان کے افراد نے بغداد اور وسط ایشیا کی مملکتوں بالخصوص ازبکستان کے شہروں سمرقند، تاشقند اور بخارا میں رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ بابر کے ہمراہ سمرقند سے یہ خاندان ہندوستان آیا، خواجہ عبدالحیٰ (ابن خواجہ کلاں خواجہ عبداللہ ابن خواجہ عبیداللہ احرار) پہلے فرد ہیں جن کا ورود ہندوستان میں ہوا۔ اسی زمانہ میں ان کے بڑے بھائی خواجہ خاوند محمود یہاں آئے۔ ہمایوں نے ان سے بیعت کی۔ مگر بعد میں جب وہ غوث گوالیاری کے بھائی شیخ پھول کے حلقہ میں داخل ہوا تو خواجہ خاوند بددل ہوکر کابل چلے گئے۔

خواجہ خاوند محمود کی تاریخی منزلت یہ ہے کہ وہ اس خاندان کے پہلے طبیب ہیں۔ ان کا شمار نامور اطبائے عصر میں تھا، عماد الدین محمود شیرازی سے تلمذ کی نسبت تھی۔ لیکن اس خانوادہ گرامی کی طبی کڑیاں تسلسل کے ساتھ ملا علی داؤد کے بیٹوں حکیم فاضل خاں اور حکیم اجمل خاں اول سے شروع ہوتی ہیں۔ اکبر کے عہد سے عالمگیر کے ابتدائی زمانہ تک ان لوگوں کا قیام آگرہ میں رہا، حکیم شریف خاں نے لکھا ہے کہ وہ مکان جس میں یہ بزرگ رہتے تھے صابن کے کٹرہ میں تھا۔

حکیم واصل خاں

اورنگ زیب کے ابتدائی عہد میں حکیم واصل خاں ابن حکیم فاضل خاں اور حکیم بقا خاں ابن حکیم اجمل خاں اول آگرہ سے دہلی منتقل ہوتے، اور طب میں امتیاز پیدا کیا۔ حکیم واصل خاں نے شیخ کلیم اللہ جہان آبادی سے بیعت کی۔ انہیں حسن

رسول نما سے بھی عقیدت تھی. انہی کی ہدایت پر پہلی بیوی کے انتقال کے بعد عقد ثانی کیا۔ اور دو بیٹے حکیم محمد اکمل خاں اور حکیم محمد اجمل خاں ثانی پیدا ہوئے. حکیم واصل خاں کے سنہ وفات کے بارے میں ان کے کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھا ہے، خود حکیم شریف خاں کے ہاں اس کی وضاحت نہیں ہے. بعض لوگوں کا بیان ہے کہ ان کے انتقال کے وقت عالمگیر کا عہد ختم ہو چکا تھا۔ اور محمد شاہی دور شروع ہو گیا تھا. حکیم کوثر چاند پوری نے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے اسلاف کا تاریخی حقائق کی روشنی میں تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء کے آس پاس حکیم واصل خاں کی تاریخ وفات کا تعین کیا ہے[۱] اجمل میگزین فروری ۱۹۳۶ کے مقالہ نگار نے سنہ کی وضاحت کے بغیر ۳ شعبان وفات کی تاریخ لکھی ہے۔ ان میں سے کسی کے پیش نظر اس عہد کی وفیات کی مشہور کتاب تاریخ محمدی نہیں تھی۔ اس کے مطابق حکیم واصل خاں کا انتقال ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء میں ہوا ہے۔ "حکیم واصل خاں طبیب در رجب یا در شعبان در شاہ جہاں آباد ۱۱۴۵ھ فوت شد[۲]" ان کے انتقال کے وقت ان کے بیٹوں حکیم اکمل خاں اور حکیم اجمل خاں ثانی کی عمر علی الترتیب ۱۱۵ اور ۱۳ برس تھی۔

حکیم بقا خاں

حکیم بقا خاں حکیم اجمل خاں اول کے بیٹے تھے، اپنے چچازاد بھائی حکیم واصل خاں کے ہمراہ اورنگ زیب کے زمانہ میں آگرہ سے دہلی آئے اور سکونت پذیر ہوئے دہلی ہی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں[۳]

---

[۱] حکیم اجمل خاں ص ۱۰۳

[۲] تاریخ محمدی ص ۸۵ [۳] تذکرۃ الخواجگان ص ۲۷

حکیم عبدالحی حسنی نے حکیم بقاء اللہ خاں اکبرآبادی اور خاندان بقائی کے حکیم بقا خاں کو ایک شخصیت سمجھا ہے۔ انہوں نے حکیم بقاء اللہ اکبرآبادی کے ذیل میں لکھا ہے "بقاء اللہ بن اسحٰق بن اسمٰعیل دہلوی اکبرآبادی حکیم بقا خاں کی نسل سے تھے ان کا دوشنبہ شوال ۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ء میں اکبرآباد میں انتقال ہوا اور اپنے بھائی ذکاء اللہ کے پاس مقبرہ شیخ علاء الدین میں دفن ہوتے۔"[1]

حکیم عبدالحی حسنی کا یہ پورا بیان بالکل غلط ہے۔ پہلی بات یہ کہ حکیم بقا خاں اکبرآبادی اور حکیم بقا خاں خاندان بقائی کا تعلق دو مختلف خاندانوں سے ہے حکیم بقا اکبرآبادی حکیم شریف خاں دہلوی کے جدامجد حکیم واصل خاں کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔ ان کا انتقال اگرچہ دہلی میں ہوا۔ لیکن ان کے خاندان کے دیگر افراد کی آخری آرام گاہ درگاہ علاء الدین آگرہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ حکیم ذکا خاں حکیم بقا خاں کے بھائی نہیں بلکہ ان کے پوتے تھے، وہ ضرور آگرہ میں مقبرہ علاء الدین میں دفن ہیں۔ تیسرے یہ کہ خاندان بقائی کے حکیم بقاء اللہ خاں کا شجرہ بھی حکیم عبدالحی نے صحیح نہیں لکھا ہے۔ یہ اصل کے بالکل برعکس ہے۔ بقاء اللہ ابن اسحٰق ابن اسمٰعیل کے بجائے اسحاق بن اسماعیل بن بقاء اللہ ہونا چاہیے۔ صاحب تذکرۃ الخواجگان نے بھی ان دونوں شخصیتوں کو خلط ملط کیا ہے۔ چنانچہ خاندان بقائی کے حکیم بقاء اللہ خاں کی مشہور کتاب قرابادین بقائی کو حکیم بقا خاں ابن حکیم اجمل خاں کی تصنیف سمجھا ہے۔[2]

حکیم محمد وفا خاں

حکیم بقا خاں کے صاحبزادہ حکیم محمد وفا خاں تھے۔ ان کی زندگی میں کئی بادشاہوں

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۱۰۲

[2] تذکرۃ الخواجگان ص ۲۷

کا عزل ونصب ہوا یہ حکیم علوی خاں کے ہمعصر ہیں۔ خاندانی قرابادینوں میں ان کے متعدد مرکبات ملتے ہیں۔ جن میں اطریفل وفائی مشہور ہے۔ حکیم محمد ذکا خاں اور حکیم محمد لقا خاں دو فرزند تھے۔ حکیم محمد وفا خاں دہلی میں مدفون ہیں۔

حکیم محمد ذکا خاں

حکیم محمد ذکا خاں احمد شاہ کے طبیب خاص رہے، حسن معالجہ اور اعلیٰ فنی خدمات کے صلہ میں ۱۷۵۲ء میں سونی پت میں انہیں جاگیر عطا ہوئی۔ جس کی آمدنی پچاس ہزار درم سالانہ تھی۔ نقل فرمان جس پر " فدوی احمد شاہ بہادر شاہ غازی ابوالمنصور خاں بہادر صفدر جنگ وزیر الممالک برہان الملک " کی مہر ثبت ہے درج ذیل ہے۔

" چودھریان وقانون گویان ومصدیان ورعایا ومزارعات پرگنہ سونی پت سرکار صوبہ علاقہ شاہ جہاں آباد بدانند چوں مبلغ پنجاہ ہزار درم موضع مانولی دربست عملہ دپرگنہ مزبور منجملہ محال خالصہ شریفہ من ازابتدائے خریف قومی ہیل من مطابق ضمن بجاگیر حکیم محمد ذکا خاں مقرر گشتہ باید بالمواجب وحقوق دیوانی راازقرار واقع وراستی موافق ضابطہ ومعمول بمشار الیہ جواب میگفتہ باشند۔ در اسی جریدہ وصلاح وصوابدید حال موی الیہ برون رو بتاریخ ۱۲ ذی قعدہ سنہ ۴ جلوس قلمی گشت[1] "۔ تذکرہ علماء ہند میں مادھوجی سندھیا والی گوالیار کے ہاں ان کی ملازمت کا لکھا ہے۔ ۲۰ شوال ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۰ مئی ۱۷۹۵ء کو انتقال ہوا[2] کوئی اولاد نہیں تھی۔ آگرہ میں درگاہ علاء الدین شاہ ولایت میں دفن ہیں۔ رابرٹ بیل نے مفتاح التواریخ میں لکھا ہے " طبیب حاذق بود در ۱۲۰۹ھ فوت کرد و تربتش اندرون احاطہ علاء الدین کہ در اکبر آباد موضع

---

[1] تذکرۃ الخواجگان ص ۲۸

[2] تذکرہ علماء ہند ص ۶۱

نائی منڈی واقع است از سنگ مرمر ساختہ اندر آن این تاریخ منقوش است ؎

ذکا خاں عالم قانون حکمت — کہ دادی عقل کل بر دست او بوس
شب آدینہ و بستم ز شوال — بعزم کوچ زد ابن کوچک کوس
خرد گفت از سر افسوس تاریخ — شد از دنیا مسیح وقت افسوس

حکیم ذکا خاں درس وافادہ میں شہرت رکھتے تھے۔ حکیم بیر علی موہانی ان کے تلامذہ میں ہیں۔ حکیم عبدالحی حسنی نے حکیم بقا خاں کی طرح انہیں بھی حکیم ذکاء اللہ خاں بقائی سے خلط ملط کیا ہے۔ آگرہ اور گوالیار سے ان کا تعلق قرار دینے اور صحیح سنہ وفات لکھنے کے باوجود انہیں غلط طور پر حکیم ذکاء اللہ ابن اسحٰق ابن اسمٰعیل لکھا ہے اور قرابادین ذکائی ان کی تصنیف بتائی ہے[1]

حکیم محمد لقا خاں

حکیم محمد وفا خاں کے چھوٹے بیٹے تھے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں جب مادھو راؤ سندھیا مدارالمہام سلطنت قرار پاتے اور قیام دہلی کے دنوں میں سخت علیل ہوئے تو شاہ عالم کی طرف سے درباری طبیب کی حیثیت سے حکیم لقا خاں علاج پر مامور کئے گئے اگرچہ دوسرے اطباتے شاہی نے بھی علاجی خدمات انجام دیں لیکن سندھیا کی پیچیدہ اور خطرناک بیماری حکیم لقا خاں کے علاج سے رفع ہوئی۔ اس کامیاب معالجہ کے صلہ میں مہاراجہ کی سفارش پر دربار شاہی سے فخرالحکما کا خطاب عطا ہوا۔ اور اسی سال یعنی ۲۶ جلوس شاہ عالم مطابق ۲۴ جولائی ۱۷۸۵ء مہاراجہ نے حکیم صاحب کو پانچ ہزار کی جاگیر عطا فرمائی۔ یہ جاگیر پہلے مجید الدولہ عبدالاحد کی تھی، حکیم لقا خاں کی درخواست پر سند جاگیر میں حکیم شریف خاں کے نام کا بھی اضافہ کیا گیا۔

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد ۶، ص ۹۹، ۱۰۰

حکیم شریف خاں ان کے چچازاد بھائی اور ہم زلف تھے، اور حکیم شریف خاں کی والدہ ان کی پھوپھی تھیں۔ یہ درخواست منظور ہونے پر سند میں ۱۲ ذی الحجہ سنہ ۲۷ جلوس مطابق ۱۷ نومبر ۱۷۸۶ء حکیم شریف خاں کا نام درج ہوا نقل سند یہ ہے۔ اس پر وکیل مطلق مختار الملک عمدۃ الامرا مادھو راؤ سندھیا فدوی شاہ عالم کی مہر ہے۔

" عاملان حال واستقبال پرگنہ ڈاسنہ سرکار صوبہ دار الخلافہ شاہ جہاں آباد، بدانند موضع مصوری وغیرہ عملہ پرگنہ مذکور سوائے سائر و اراضی املاک و باغات کہ سابق در جاگیر مجید الدولہ مقرر بود در خالصہ شریفہ ضبط شدہ واز سند پرگنہ مہاست دریولا بموجب دستخط عوض موضع کانتھ و مؤکان عملہ پرگنہ یا غپت در جاگیر رفعت وعوالی پناہ حکیم محمد شریف خاں وحکیم محمد لقا خاں نسلا بعد نسل و بطنا بعد بطن مقرر شد لہٰذا قلمی میگردد کہ آنہا مواضع مستور را حسب الظن من ابتدائے فصل خریف ۱۹۳۹ ف بہ تصرف حکیم مشار الیہ واگذارند و بوجہ من الوجوہ مزاحمت ورزدہ نہ رسانند دریں باب تاکید دانستہ حسب المسطور بہ عمل آرند بتاریخ بست دیکم ذی الحجہ سنہ ۲۷ جلوس قلمی شد[1]"

بعد میں حکیم لقا خاں کی خدمات مہاراجہ سندھیا نے گوالیار منتقل کر لیں۔ یہ پہلے دہلی سے اجین پہنچے جو اس وقت گوالیار کے بجائے سندھیا کا دار الخلافہ تھا۔ شاہی جاگیر کے علاوہ مہاراجہ کی طرف سے ایک ہزار روپیہ ماہانہ مشاہرہ مقرر ہوا، معافی مبلغ تین ہزار سات سو روپیہ سالانہ وپالکی آٹھ سو آٹھ روپیہ آٹھ آنے ریاست کی طرف سے عطا ہوئی۔ اس کا تعلق پرگنہ مند سور سے تھا، اجین میں شوال ۱۲۱۵ھ/ فروری ۱۸۰۱ء بعمر ۷۴ برس انتقال ہوا، حسب وصیت نعش اجین سے آگرہ لاکر مزار حضرت علاء الدین سے متصل دفن کی گئی۔ قطعہ تاریخ جو لوح تربت پر نقش ہے ؎

---

[1] تذکرۃ الخواجگان ص ۲۳

چوں بفردوس بریں رفت از جہاں | بو علی ثانی لقا خاں محترم
کلک شبلیں سال وماہ وروز نقل | شہر شوال دوشنبہ زد رقم

حکیم حمزہ علی خاں اور حکیم وارث علی خاں دو صاحبزادہ تھے جن کا گوالیار قیام رہا۔

حکیم خوشحال رائے اکبر آبادی

دہلی کے حاذق طبیبوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۸ء کو دہلی میں نادر شاہی قتل عام میں ہلاک ہوئے۔ ۴۰ برس کی عمر تھی[1]

حکیم میر امام الدین

حکیم میر غریب اللہ تونی کے بیٹے اور عالی قدر طبیب تھے۔ طب کے علاوہ دوسرے علوم میں مہارت تھی۔ ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۸ء دہلی میں نادر شاہی قتل عام میں بعمر ۶۰ برس شہید ہوئے[2] حکیم شفائی خاں نے رسالہ چوب چینی میں ان کا مجوزہ ایک نسخہ نقل کیا ہے، اس رسالہ کا ایک خطی نسخہ راقم الحروف کے ذخیرہ کی زینت ہے[3]

دہلی سانحہ کے بعد حکیم میر امام الدین کا خاندان فرخ آباد منتقل ہو گیا تھا۔ حکیم فرزند علی فرخ آبادی ان کے فرزند تھے، انہوں نے طب کی تعلیم دہلی میں اپنے والد سے حاصل کی تھی۔ اور انہی سے مطب سیکھا تھا۔ پھر درس وافادہ اور معالجہ میں ان کے جانشین ہوئے۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی

---

[1] تاریخ محمدی جلد ۲ حصہ ۶ ص ۱۰۵
[2] ایضاً ص ۱۰۵
[3] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۱۲۰

نے تاریخ فرخ آباد میں لکھا ہے کہ یہ جالینوس عصر اور بقراط زمانہ تھے[1] ان کے بیٹے حکیم امداد علی نے بھی فرخ آباد میں شہرت پائی۔

حکیم فرزند علی کے شاگرد حکیم سید امیر بخش نے حکیم فرزند علی کے انتقال کے بعد ان کا مطب مرتب کیا ہے، اس کا ایک مخطوطہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ میر امام الدین کے ایک بیٹے حکیم میر حسن تھے، جن کا مطب نولکشور سے شائع ہوا ہے۔

حکیم سید حکمت خاں

ماہر طبیب تھے۔ حکمت خاں غالباً ان کا شاہی خطاب تھا۔ آخر رجب ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء دہلی میں فوت ہوئے، انتقال کے وقت عمر تقریباً ۷۰ برس تھی[2]

حکیم علی اکبر خاں شیرازی

حکیم علی اکبر دہلی کے حاذقین میں تھے، بعمر ۶۰ برس شوال ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء وفات پائی[3]

حکیم علوی خاں

حکیم محمد ہاشم شیرازی المعروف بہ نواب معتمد الملوک حکیم علوی خاں (ابن حکیم محمد ہادی قلندر ابن سید مظفر الدین علوی) رمضان ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء میں پیدا ہوئے، ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد ۷، ص ۱۷۱ و ۳
[2] تاریخ محمدی جلد ۲ حصہ ۲ ص ۱۱۸
[3] ایضاً ص ۱۳۸

میں دہلی آئے جہاں بکثرت شیرازی اطبا موجود تھے۔ پہلے اورنگ زیب کی خدمت سے اس کے بعد محمد اعظم کی سرکار سے وابستہ ہوئے۔ بہادر شاہ کے زمانہ میں بھی وہ بلند مرتبہ رہے۔ اور علوی خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ محمد شاہ کے عہد میں انہیں چاندی سے تولا گیا۔ چھ ہزاری منصب اور معتمد الملوک کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء میں نادر شاہ انہیں اپنے ہمراہ لے گیا، وہاں سے حج بیت اللہ سے فارغ ہوتے ہوئے ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء میں وہ دہلی واپس آئے۔ اور ۲۵ رجب ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء مرض استسقا میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے۔ حسب وصیت درگاہ نظام الدین اولیا دہلی میں آسودہ خاک ہیں۔[1] "برفلک رفت مسیحائی جدید" سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔ مگر اس سے سال وفات ۱۱۶۲ھ نکلتا ہے، صاحب مجمع النفائس نے ۸۴ برس کی عمر میں ۱۱۶۳ھ میں احمد شاہ پسر محمد شاہ کے زمانہ میں فوت ہونے کا لکھا ہے[2]

حکیم علوی خاں سے پہلے دہلی میں کسی طبیب کو وہ عظمت و شہرت نصیب نہیں ہوئی جو ان کے حصہ میں آئی، وہ محض امرا اور سلاطین کے معالج نہیں رہے، دہلی اور دہلی سے باہر کے ہزاروں باشندوں نے ان سے فیض پایا۔ ان کے درس کی وسعت کا یہ عالم رہا کہ ہندوستان کے بیشتر گرامی منزلت طبیبوں کا سلسلہ ان پر منتہی ہوتا ہے بے شمار طلبہ نے ان سے استفادہ کیا[3] دہلی میں ان کے درس اور مطب کی دھوم تھی۔ دور دور سے طلبہ اور مریض ان کی خدمت میں پہنچتے تھے۔ انہیں دہلی میں ایک مستقل اسکول کا درجہ حاصل ہے۔ ان کے سلسلہ کے طبیب علوی خانی کہلاتے تھے علوی خانی اطبا کی خدمات تحقیق کا ایک مستقل موضوع ہیں۔ ان کے مطالعہ سے علوی

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۳۶۴ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۰

[2] مجمع النفائس ص ۶۱

[3] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۵۲/۱۲۸

خاں کے دائرہ اثر کے علاوہ ہندوستان کی طبی تاریخ کا ایک اہم گوشہ سامنے آئے گا اس ملک کی طبی تاریخ بنانے میں جن اطبا کا بہت زیادہ حصہ ہے ان میں علوی خاں کا نام سرفہرست ہے۔

ان کی حذاقت اور مسیحائی کے بہت سے واقعات تاریخوں میں مذکور ہیں۔ نادرشاہ دہلی سے دوسرے علماء وفضلا کے ساتھ حکیم علوی خاں اور عبدالکریم کشمیری کو بھی اپنے ہمراہ ایران لے گیا تھا۔ یہ دونوں پانچ برس نادرشاہ کے پاس رہے، پھر اس سے اجازت لے کر ہندوستان واپس آئے۔ عبدالکریم نے بیان واقع کے نام سے سفرنامہ لکھا ہے۔ اس کے مطالعہ سے علوی خاں سے اس کے گہرے تعلق پر روشنی پڑتی ہے اس نے تحریر کیا ہے کہ حج سے واپسی پر بہ مدراس پہنچے، اور فرخ آباد بھی گئے جہاں نواب محمد خاں بنگش کا علوی خاں نے طبی معائنہ کیا اور نبض دیکھنے کے بعد عبدالکریم سے فوراً وہاں سے چلنے کے لیے کہا، اس لیے کہ نواب چھ سات روز کا مہمان ہے، عبدالکریم نے دریافت کیا کہ یہ تعیّن آپ علم طب کی رو سے کر رہے ہیں یا کشف وکرامت کی بنا پر۔ علوی خاں نے جواب دیا "بکثرت شغل معالجہ وفور تجربہ"

کہا جاتا ہے کہ دلی کی فتح کے بعد نادرشاہ کو اتنی پرتکلف ضیافتیں دی گئیں کہ اس کا پیٹ خراب ہوگیا، اور وہ بھاری پن محسوس کرنے لگا۔ حکیم علوی خاں کو کہ شاہی حکیم تھے بلایا گیا۔ وہ اپنی دواؤں کے ساتھ آئے اور سونے چاندی کے پلڑوں والی اپنی دواؤں کی ترازو بھی لے آئے، صحیح خوراک کو ناپنے کے بعد اور حکیم صاحب کے مزید عمل کے بعد جب جڑاؤ ڈھکنے کو اٹھایا گیا تو نادرشاہ نے سونے کی ایک طشتری دیکھی، جس پر ایک پیالہ اور ایک قیمتی پتھر کا چمچہ رکھا ہوا تھا۔ اس پیالہ میں گلقند تھا، جو گلاب کی پتیوں، ان سے نکلے ہوئے رس اور شیرینی کا مرکب تھا۔ نادرشاہ کو اس کی شکل، خوشبو اور حکیم صاحب کی دل پذیر مسکراہٹ اتنی اچھی لگی کہ اس نے حکیم صاحب کے اشارے کے بغیر اس چمچے میں تھوڑا سا لیا اور کھا گیا۔ اس کا ذائقہ اسے اتنا پسند آیا کہ وہ یہ کہتے ہوئے

کہ یہ نہایت لذیذ حلوا ہے سارا کا سارا گلقند کھا گیا۔ نادر شاہ نے ان کو اور بھی کئی طریقوں سے آزمایا اور آخر میں اتنا متاثر ہوا کہ انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔[1]

عبدالکریم کی بیگم کا علوی خاں نے جس حکمت اور ترکیب سے علاج کیا وہ حذاقت کے ساتھ ہی ان کی فہم و فراست پر شاہد ہے۔ سفرنامہ کے مطابق اس کی بیگم کا ایک طرف کا پستان متورم اور بہت سخت ہو گیا تھا، وہ کسی کو دکھانے پر آمادہ نہیں تھی۔ علوی خاں کو روداد اور کیفیت مرض سنائی گئی، اور وہ علاج کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے ایک کمرہ میں باریک میدہ بچھانے کا حکم دیا اس کے بعد بیگم سے برہنہ پا اس فرش پر چلنے کی فرمایش کی جب وہ اس پر پیر رکھ کر گزریں تو علوی خاں نے قدموں کے نشانات کا بغور مطالعہ کیا اور پیر کی رگ پہچان کر اس نقش قدم پر لوگوں کی نظریں بچا کر نشتر چھپا دیا اور بیگم سے سابقہ نشانات پر ہی قدم جما کر ایک بار اور چلنے کی فرمایش کی بیگم نے جب دوبارہ چلنا شروع کیا تو نشتر کی جگہ پیر رکھتے ہی چبھا اور وہ چیخ کر مار کر گریں۔ نشتر فوراً ان کے پیر سے نکالا گیا۔ اس تدبیر سے حکیم صاحب کا مقصد فصد کھولنا تھا، جس کے لیے وہ کسی قیمت پر تیار نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس کامیاب تدبیر کے بعد بہت جلد ان کے مرض کا ازالہ ہو گیا۔[2]

حکیم علوی خاں ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کتابوں میں قرابادین علوی خاں اطبا کے معمولات میں شامل رہی ہے، دوسری کتابوں میں جامع الجوامع، رسالہ امراض اطفال رسالہ دستور العلاج سوء القنیہ و استسقا، علاج الحمی، رسالہ قوانین علاج، حاشیہ شرح اسباب و علامات، احوال اعضاء النفس علاج الانسان، آثار باقیہ، شرح مجسطی، حاشیہ ہدایۃ الحکمت میبذی، شرح اقلیدس

---

[1] عالم میں انتخاب دلی ص ۱۲۱ و ۱۲۲

[2] رسالہ جودیہ ص ۲۲

رسالۂ فی الموسیقی ہیں۔ ان کے علاوہ جس کثرت سے ان کے مطب، دستور العمل، مجربات، معمولات اور قواعد و قوانین علاج وغیرہ ناموں سے ان کے شاگردوں نے ان کے طبی افادات جمع کئے ہیں دوسرے اساتذہ فن کے ہاں اس کی مثالیں نہیں ملتی ہیں[1]

علوی خاں کو اپنے والد کی طرح شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ ان کے والد حکیم مرزا ہادی قلندر کا شر تخلص تھا۔ اور یہ علوی ہی کے نام سے شعر کہتے تھے، جامع الجوامع میں سیکڑوں اشعار درج ہیں۔ سراج الدین خاں آرزو کو ان کی خدمت میں کمال ارتباط حاصل تھا اس ربط و تعلق کی وجہ میر سید محمد تھے جو علوی خاں کے نہ صرف قریبی عزیز بلکہ قائم مقام فرزند رشید تھے اور شاعری کا ذوق رکھتے تھے[2]

خاندان بقائی

حکیم بقاء اللہ خاں

حکیم بقاء اللہ خاں ایک جلیل القدر طبی خانوادہ کے باکمال فرد ہیں۔ جس طرح ان کے اسلاف میں طبی سلسلہ اوپر تک قایم ہے۔ اسی طرح آج بھی برصغیر ہند و پاک میں ان کے خاندان میں متعدد طبیب موجود ہیں۔ اور خاندان بقائی کے نام سے اسے امتیاز حاصل ہے۔ ان کا سلسلہ اس طرح ہے۔ حکیم بقا خاں اعظم ابن حکیم عبدالسلام خاں ابن حکیم حبیب اللہ خاں ابن حکیم دوست محمد خاں ابن حکیم شاہ محمد خاں ابن حکیم ارشد خاں ابن حکیم مسیحا خاں۔

---

[1] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۱۲۵

[2] مجمع النفایس ص ۶۱

حکیم مسیحا خاں ایران کے مشہور مردم خیز قصبہ لار کے باشندہ تھے۔ اور شہنشاہ ایران کے دربار میں "حکیم باشی" کے مرتبہ پر فائز تھے، وہیں آخر وقت تک قیام رہا۔ ان کے بیٹے حکیم ارشد خاں اس خاندان کے پہلے طبیب ہیں جو ایران سے ہندوستان آئے۔ اور شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ ایران میں ان کا تعلق شاہ عباس صفوی کے دربار سے تھا۔ حکیم ارشد خاں کے بیٹے حکیم شاہ محمد خاں اور پوتے حکیم دوست محمد خاں بھی دہلی میں ممتاز رہے۔ حکیم نجیب اللہ خاں بادشاہ ابوالبرکات کے معالج خاص تھے۔ حکیم عبدالسلام خاں ارکا غاس الزماں اور افلاطون دوراں کہلاتے تھے۔ محمد شاہ کی طرف سے دو ہزاری منصب حاصل تھا۔[1]

حکیم بقاء اللہ خاں (۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء) نہایت حاذق طبیب اور سر برآوردہ شخص تھے دہلی میں ان کے مطب اور درس کی دھوم تھی۔ معاصرین میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، تھانہ حوض قاضی کے قریب دو منزلہ مسجد ان کی یادگار ہے مرزا سنگین بیگ نے ان کی حویلی کا بھی ذکر کیا ہے۔[2] ان کے صاحبزادہ حکیم محمد اسمٰعیل خاں المخاطب بہ طبیب خاقان نے ان کے مجربات و معمولات مرتب کئے اور مجموعۂ بقائی نام رکھا، عام طور پر نام کی وجہ سے لوگوں نے اسے حکیم بقا خاں کی تصنیف قرار دیا ہے۔ حکیم کوثر چاند پوری نے ایک اور بڑی غلطی یہ کی ہے کہ انہوں نے حکیم ذکاء اللہ خاں کو حکیم بقا خاں سمجھا ہے۔ ان کا بیان ہے "حکیم بقائی کا پورا نام ذکاء اللہ ابن اسحٰق بن اسمٰعیل تھا۔ انہوں نے ایک قرابادین بھی تالیف کی تھی جو قرابادین ذکائی یا قرابادین بقائی کے نام سے طبع ہو چکی ہے۔"[3] یہ پورا بیان بالکل غلط ہے جس طرح حکیم بقا خاں اور ذکاء اللہ ایک شخصیت نہیں ہیں۔ اسی طرح قرابادین بقائی اور قرابادین ذکائی دو علاحدہ کتابیں ہیں۔ پہلی کے مصنف حکیم اسمٰعیل خاں

---

[1] حیات کرم حسین ص ۱۰۵ و ۱۰۶

[2] سیر المنازل ص ۱۸

[3] اطبائے عہد مغلیہ ص ۶۳

اور دوسری کے مصنف ان کے پوتے حکیم ذکاء اللہ خاں ہیں۔ اسی طرح امداد صابری نے حکیم اسمعیل خاں اور حکیم ذکاء اللہ خاں کو حکیم بقاء اللہ کا بیٹا لکھا ہے[۱] جبکہ درحقیقت حکیم اسمٰعیل ان کے بیٹے اور حکیم ذکاء اللہ ان کے پوتے ہیں۔ حکیم محمد اسمعیل حضرت شاہ ولی اللہ کے چچا شیخ ابوالرضا کے مرید تھے۔ دو جلدوں پر مشتمل قرابادین بقائی کی پہلی جلد یکم دسمبر ۱۸۶۱ کو اور دوسری جلد فروری ۱۸۶۲ کو ہندو پریس دہلی سے چھپی ہے۔ دونوں کے مجموعی صفحات کی تعداد ۱۰۸۷ ہے۔

حکیم اسمٰعیل خاں کے علاوہ حکیم بقاء اللہ خاں کے دوسرے بیٹے حکیم بھلو بقائی تھے یہ ارسطوئے دوراں کہلاتے تھے، ان کے بیٹے حکیم سعید الدولہ سقراط الزماں اور ان کے بیٹے حکیم نجف خاں مسیح الملک تھے۔ حکیم نجف خاں کے ایک بیٹے حکیم جالینوس الزماں تھے جنہوں نے اکمل الحکما کا اعجاز حاصل کیا۔ دوسرے بیٹے حکیم ظہیرالدین تھے، جن کے صاحبزادگان حکیم رضی الدین اور حکیم ریاض الدین نے بھی اپنے زمانہ میں ناموری حاصل کی۔

حکیم معالج خاں

حکیم محمد اشرف کشمیری دہلوی کو محمد شاہ کے دربار میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ معالج خاں کے خطاب سے سرفراز ہوتے اور اسی سے شہرت پائی، یہ اپنے زمانہ کے دہلی کے اطبائے کبار میں ہیں، طب کی تعلیم حکیم علوی خاں سے حاصل کی تھی۔ مطب و معالجہ میں یکتا تھے، درس وافادہ کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت بڑی تعداد میں طلبہ ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے ان کے شاگردوں میں ممتاز طبیبوں کے نام ملتے ہیں۔ حکیم میر محبوب علی ان کے بڑے فاضل شاگرد تھے، حدود الحمیات کے نام سے محبوب علی

---

[۱] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۱۸۹ دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۱۱۷

کا ایک رسالہ ہے۔

حکیم معالج خاں کے نسخہ ہائے مطب کو معمولات حکیم معالج خاں کے نام سے ان کی وفات کے بعد انکے شاگردوں نے مرتب کیا ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ یہ محض نسخوں کا مجموعہ ہے، معالجہ سے متعلق بعض اہم ہدایات اس میں درج ہیں۔

دوسرے مؤلفین نے اپنے مجربات کے مجموعوں میں حکیم معالج خاں کے مرتبہ نسخے اعتماد کے ساتھ نقل کئے ہیں۔ اس سے ان کی فنی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔

متعدد مخطوطات پر حکیم معالج خاں کے دستخطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کا بھی ان کے پاس اچھا ذخیرہ تھا[1] دہلی میں وفات پائی۔ عمر ساٹھ برس سے زیادہ تھی۔

تاریخ محمدی میں ان کی تاریخ وفات اواخر ربیع الثانی یا اوایل جمادی الاول ۱۱۳۷ھ ۱۷۲۴ء درج ہے[2] حکیم معالج خاں کے بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد گئے نواب اور ان کی بیگم امۃ الزہرا کے ہاں تقرب تھا۔ آصف الدولہ کے زمانہ میں بھی فیض آباد میں قیام رہا۔[3]

حکیم اعاجب خاں

حکیم اعاجب بن حکیم محمد اشرف شیرازی المخاطب معالج خاں بن علی اصغر خاں بن نواب مقرب خاں شاہ جہانی اٹھارویں صدی کے دہلی کے عالم طب تھے۔ طب سے

---

[1] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۱۲۶

[2] تاریخ محمدی جلد ۲ حصہ ۶ ص ۵۵

[3] نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۴۸۵

نا :براتی تعلق تھا اور درس اور مطب کا سلسلہ رہتا تھا، انہوں نے عربی میں نفیسی
پر ایک عمدہ حاشیہ تحریر کیا ہے۔ رضا لائبریری رامپور اور خدا بخش پٹنہ میں اس
کے نسخے موجود ہیں۔[1]

حکیم محمد دایم خاں

حکیم محمد دایم خاں اور ان کے بھائی دیوان محمد عاقل خاں امرا عہد محمد شاہی میں
تھے۔ دہلی قدیمی وطن تھا۔ نادر شاہی حملہ کے بعد دہلی کی سکونت ترک کر کے امروہہ
پہنچے اور محلہ شاہی چبوترہ میں بود و باش اختیار کی۔ حکیم دایم کا تعلق خاندان
کنبوہ کے معزز اراکین میں ہے، ان کے بعد کئی پشتوں تک طبابت کا سلسلہ قائم رہا
ان کے بیٹے حکیم محمد محفوظ خاں، پوتے حکیم محمد مسعود احمد خاں کا شمار طب کی بڑی شخصیتوں
میں تھا، حکیم محمد مسعود احمد خاں کے بیٹے حکیم منصور علی خاں فقیر دوست اور مخیر بزرگ
تھے۔ ثروت و اقتدار حاصل تھا، راجہ ٹیکت رائے وزیر نواب آصف الدولہ سے
خاص تعلق تھا۔ راجہ ہی کے توسل سے آصف الدولہ کی سرکار میں بصیغہ طبابت مامور
ہوئے۔ پانچ سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ تھا۔

دیوان محمد عاقل خاں کے پوتے اور فاخر علی خاں کے بیٹے حکیم محمد منیر ذی علم
طبیب اور شاندار شخصیت کے مالک تھے فاخر علی خاں نے بھی اپنے بزرگوں
کے ساتھ دہلی کی سکونت ترک کر کے امروہہ میں بود و باش اختیار کی۔ ان کے
اخلاف بھی صاحب علم و دانش ہوئے اور ان کی نسل میں وجاہت و وقار اور
عزت و اعتبار قایم رہا۔[2]

---

[1] قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین ص ۱۵۹

[2] المشاہیر ص ۲۴۴

حکیم لطف الدین

خاندان کنبوہ کے ممتاز طبیب تھے، ان کا تعلق مفتی محمد اکرم عالمگیری کے خاندان سے تھا، یہ نہایت خوش صحبت، قیافہ شناس، آداب دان اور بالا دست طبیب تھے، نادر شاہی حملہ کے بعد دہلی سے مارہرہ پہنچے۔ وہاں ایک ذی رتبہ اور ہم قوم رئیس کریم الدین محمد کی دختر سے شادی ہوئی۔ ان کی نسل باقی نہیں رہی، حکیم لطف الدین کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہے۔ لیکن ان کے خسر کریم الدین محمد نے ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۱ء میں انتقال کیا تھا[1]

حکیم اکمل خاں

محمد شاہ کے معالج تھے۔ اکثر و بیشتر قلعہ میں وقت گزرتا تھا۔ حسن خدمات کے صلہ میں اکمل المحققین و حاذق الملک کا خطاب ملا تھا۔ دو لاکھ روپیہ کی جاگیر سواد عظیم آباد پٹنہ اور سہ ہزاری منصب[2] عطا تھا، آخر عمر میں محمد شاہ ان کے سوا دوسرے کا علاج نہیں کرتا تھا۔ خاندانی روایت کے مطابق احمد شاہ نے حکیم صاحب کے ذریعہ محمد شاہ کو ختم کرانا چاہا، لیکن حکیم صاحب کسی طرح اس خلاف انسانیت فعل کے لیے تیار نہیں ہوئے، محمد شاہ کے انتقال کے بعد احمد شاہ (۱۷۴۸-۱۷۵۴ء) نے انتقامی جذبہ کے تحت حکیم صاحب کے تمام عطیات شاہی کی ضبطی کا حکم دیا۔ اس کے بعد حکیم صاحب گوشہ نشین ہو گئے۔ بیشتر وقت مریضوں کو دیکھنے میں صرف

---

[1] المشاہیر ص ۲۸۰

[2] اجمل میگزین ص ۲۳

کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں حکیم محمد شریف خاں اور حکیم محمد سعید خاں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ خود طبی کتابوں کا درس دیتے تھے اور مطب و معالجہ کے رموز سکھاتے تھے۔

۲۹ رمضان کو وفات پائی[1]۔ تذکرۃ الخواجگان اور بڑی بیاض میں سنہ وفات ۱۲۰۲ھ/۸۸-۱۷۸۷ء درج ہے۔

حکیم اجمل خاں ثانی

حکیم واصل خاں کے دوسرے بیٹے تھے، بڑے بھائی حکیم اکمل خاں قلعہ معلی میں اراکین خاندان شاہی کے معالجہ میں مصروف رہتے تھے، ان کا گھر پر عوامی مطب کا سلسلہ تھا۔ درس و تدریس کا شوق بھی رکھتے تھے، حکیم شریف خاں کے تذکرہ میں ملتا ہے کہ ان کے چچا حکیم اجمل خاں دوپہر کو انہیں کتابیں پڑھاتے تھے اور صبح اپنے مطب میں بیٹھا کر مریضوں پر تشخیص مرض اور تجویز نسخہ لکھاتے تھے۔

حکیم اجمل خاں کی بیاضوں کی صورت میں دو کتابیں یادگار ہیں۔ ایک بیاض میں دوسروں کے مجربات قلمبند کئے ہیں اور دوسری میں اپنے قابل اعتماد مجربات جمع کئے ہیں۔ ان کی ذہانت اور قابلیت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ حکیم اکمل خاں کی وفات کے بعد تک زندہ رہے۔ حکیم عاقل، حکیم عادل اور حکیم مہدی تین بیٹے تھے، حکیم کوثر چاندپوری نے حکیم اجمل خاں کے نام کے آگے گوالیار لکھا دیکھ کر خیال کیا ہے کہ ان کا گوالیار قیام رہا ہوگا۔ پھر ساتھ ہی لکھا ہے کہ اجمل میگزین کے مقالہ نگار نے ان کے گوالیار جانے کا کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، حکیم کوثر شش و پنج میں پڑ گئے ہیں اور آخر میں لکھتے ہیں کہ "نہیں کہا جا سکتا کہ وہ گوالیار گئے یا نہیں[2]"۔ لیکن یہ سب اس لاعلمی

---

[1] تذکرۃ الخواجگان ص ۸۵ [2] حکیم اجمل خاں ص ۱۱۳

کی وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اس خاندان میں اجمل خاں اول نہیں ہیں جیسا کہ حکیم کوثر نے انہیں سمجھا ہے، جن حکیم اجمل خاں کے آگے گوالیار لکھا ہوا ہے وہ اجمل خاں اول یعنی حکیم اکمل خاں اور حکیم اجمل خاں ثانی کے دادا حکیم محمد فاضل خاں کے حقیقی بھائی ہیں۔ اور ان کی شاخ کا گوالیار سے تعلق ہے۔

حکیم قوام الدین خاں

محمد مرشد المخاطب حکیم قوام الدین کے والد اعظم الدین خاں بہادر شاہ کے زمانہ کے علما و امرا میں تھے۔ سلسلہ نسب نویں پشت میں ہندوستان میں خاندان کنبوہ کے سرخیل اور مشہور بزرگ شیخ سماء الدین (وفات ۱۷ جمادی الاول ۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء بعمر ۹۳ برس) سے ملتا ہے۔

حکیم قوام الدین نے علوم عقلی و نقلی اپنے پدر بزرگوار سے حاصل کئے۔ معتمد الملک حکیم علوی خاں سے طب کی تعلیم پائی۔ اپنے زمانہ کے مشہور طبیبوں میں شمار ہوئے۔ بہادر شاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ دار الشفا دہلی کے مہتمم مقرر ہوئے۔ اس دار الشفا کا سالانہ خرچ تین لاکھ روپیہ تھا۔ ۱۸ جلوس محمد شاہی مطابق ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء میں بر رسالہ روشنی الدولہ ظفر خاں منصب پانچ صدی ذات بر سرفراز ہوئے۔ دہلی میں وفات پائی اور مقبرہ شیخ سماء الدین میں مدفون ہوئے۔ حکیم امام الدین خاں اور حکیم رضی الدین خاں دو فرزند یادگار چھوڑے[1]

حکیم امام الدین خاں

مرجع امرا اور اطبا ر تامدار میں تھے۔ معقولات اور منقولات میں دسترس تھی۔

---

[1] المشاہیر ص ۲۳۹

تصوف سے بھی ذوق تھا. فصوص الحکم اور مثنوی مولانا روم کا درس ہوتا تھا. نہایت خوش رو اور بہادر تھے۔ ۶ جلوس احمد شاہ موافق ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء میں پانچ صدی ذات منصب عطا ہوا. عالمگیر ثانی نے حکیم الملک کا خطاب دیا. اور ایک ہزار پانچ صدی منصب مقرر کیا. ذوالفقار الدولہ امیرالامرا نواب نجف خاں وزیر سے بہت تعلق تھا[1] تخبۃ التواریخ کے مطابق شاہ عالم کے زمانہ میں سلطنت کے ضعف کی وجہ سے دہلی کی سکونت ترک کر کے امروہہ میں توطن اختیار کیا. ان کے بھائی حکیم رضی الدین بھی ان کے ہمراہ منتقل ہوئے۔

حکیم امام الدین نے دہلی میں انتقال کیا اور مقبرہ شیخ سماء الدین متصل حوض شمسی مہرولی میں مدفون ہوئے، حکیم رمضان علی خاں اور حکیم غلام علی دو بیٹے تھے[2]

حکیم رمضان علی کو ۲۳ جلوس شاہ عالم موافق ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء کو برسالہ مرزا نجف خاں ہزاری ذات اور دو سو سوار کا منصب اور خطاب خانی عطا ہوا تھا۔

حکیم امام الدین خاں کے دوسرے بیٹے حکیم غلام علی خاں دہلی میں پیدا ہوئے عربی، فارسی اور طب کی تعلیم اپنے والد سے پائی. مشکل سے علاج پذیر امراض کا کامیابی سے علاج کرتے تھے۔ ۱۴ جلوس ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں برسالہ روشن الدولہ ظفر خاں منصب پانچ صدی ذات دو سو سوار تھا، حسین علی خاں خطاب عطا ہوا تھا۔ بعد میں پانچ صدی ذات و پانچ صدی سوار کا منصب ملا. ۲۶ جمادی الثانی ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء انتقال کیا امروہہ میں مدفون ہیں. حکیم بوعلی خاں اور حکیم عظیم علی خاں دو فرزند تھے[3]

حکیم رضی الدین خاں

حکیم قوام الدین کے دوسرے صاحبزادہ تھے۔ امروہہ میں پیدا ہوئے۔ امروہہ

---

[1] المشاہیر ص ۲۴۰

[2] ایضاً ص ۲۴۰

[3] " " ۲۴۱

اور دہلی کے اساتذہ سے تعلیم پائی۔ طب اپنے والد سے سیکھی اپنے اسلاف و اخوان کی طرح با نام و نشان اور معزز و محترم رہے۔ ۲۹ جلوس محمد شاہ برسالہ فخر الدین خاں جیسن ان کو پانچ صدی ذات کا منصب تھا۔ حکیم عبد الحی حسنی، کے مطابق پانچ صدی کا یہ منصب احمد شاہ بن محمد شاہ نے عطا کیا تھا۔ دہلی میں ایک عرصہ تک قیام رہا، پھر لکھنؤ گئے اور آصف الدولہ کے ہاں اعزاز حاصل کیا۔ ان کی کتابوں میں الرضیہ حاشیہ شرح اسباب، جامع الرضی (معالجات) اور الرسالۃ الجماعیہ ہیں۔ رمضان ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۷ء امروہہ میں انتقال ہوا۔[1]

حکیم رضی الدین خاں کے بیٹے حکیم فیروز علی خاں کو بھی یہ منصب ۲۷ جلوس شاہ عالم برسالہ صاحب عالم مرزا محمد اکبر شاہ ملا تھا۔ فیروز علی خاں کے کوئی اولاد ذکور نہیں تھی۔ ان کے نواسہ حکیم نیاز علی خاں برادر زادہ مولانا نواب لکھنوی لایق طبیب اور مصنف تھے۔[2]

حکیم مہابت خاں

حسین المشتہر بہ مظفر بن محمد بن قاسم ہروی کو مہابت خاں کا خطاب تھا۔ ان کے باپ اور دادا دہلی کے مشہور طبیبوں میں تھے۔ انہوں نے طب کی تعلیم حکیم محمد حسین بقراط خاں سے حاصل کی تھی۔

۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء میں انہوں نے ایک کتاب سراج العلاج تصنیف کی۔ یہ سلسلہ قرابادین کی ایک ضخیم اور جامع کتاب ہے، اس میں ذاتی مجربات کے علاوہ اپنے والد اور جد بزرگوار اور دوسرے ہندوستانی طبیبوں مثلاً حکیم شاہ محمد اکبرآبادی

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد ۷، ص ۱۸۰ بحوالہ شمس التواریخ

[2] المشاہیر ص ۲۴۳

حکیم مرزا سلیمان شیرازی، حکیم اسمٰعیل، حکیم محمد جعفر، حکیم اجمل خاں، حکیم احمد، حکیم عابد، حکیم محمد حیات لاہوری، حکیم داؤد تقرب خاں وغیرہ کے مجربہ نسخے شامل کئے ہیں۔ اپنے استاد حکیم بقراط خاں اور ان کے والد حکیم معصوم خاں کے حوالہ سے بھی متعدد نسخے نقل ہیں۔ مولف حکیم علوی خاں سے خاص طور پر متاثر نظر آتا ہے۔ یہ محض کتابی نسخوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس میں اگر ایک طرف اطباء دہلی کے معمولات کثرت سے پیش کئے گئے ہیں تو دوسری طرف ذاتی مخترعہ نسخوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو مولف کی فنی مہارت کا ثبوت ہے۔ کتاب پانچ مقالوں پر مشتمل ہے۔ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں اس کا مخطوطہ محفوظ ہے۔ اس کی کتابت ۲۱ دسمبر ۱۸۶۰ء کو ہوئی ہے[1]

حکیم راضی خاں

قطب الدین خاں کے صاحبزادہ تھے۔ شاہ عالم کے عہد میں ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء میں "فواید معدہ فی ترتیب ضعف معدہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ دیباچہ کے مطابق وجہ تالیف اس مرض کی عمومیت اور خود شاہ عالم کا اس میں مبتلا ہونا ہے بادشاہ کے قرب و اختصاص کی بناء پر مولف نے ضعف معدہ کے اسباب و علامات اور علاج پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

حکیم مظہر مظفر

۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء میں شاہ عالم سے منسوب کرتے ہوئے انہوں نے خلاصۃ العیش

---

[1] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۱۲۲

عالم شاہی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔

شاہ اہل اللہ

شاہ اہل اللہ بن شاہ عبدالرحیم عالم متقی اور طبیب تھے۔ اپنے برادر گرامی شاہ ولی اللہ (وفات ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء بعمر ۶۲ برس) سے درسیات کی تعلیم پائی۔ اور طبی علوم میں امتیاز پیدا کیا، طبی حلقوں میں ان کی کتاب تکملہ ہندی جو طبع ہو چکی ہے، محتاج تعارف نہیں ہے، تکملہ یونانی بھی معروف ہے۔ لیکن ان کی کتاب ترجمہ و شرح موجز القانون کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں تھی، کسی تذکرہ نگار کے ہاں اس کا حوالہ نہیں ملتا ہے۔ پہلی مرتبہ اسے متعارف کرانے کی عزت راقم سطور کو حاصل ہوئی۔ شاہ اہل اللہ نے فارسی میں موجز کے ترجمہ کے ساتھ ضروری مقامات کی توضیح بھی کی ہے۔ دیباچہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ "علاء الدین قرشی ابن نفیس کی یہ کتاب جو نہایت مختصر اور طب کے تمام ضروری مباحث پر منقسم ہے اور ہر چند کہ بڑی تعداد میں اس کی شرحیں کی گئی ہیں لیکن فارسی خواندہ ان کے مطالعہ سے محروم ہیں۔ ان کے استفادہ کے لیے اس کا ترجمہ بعض دوسرے مفید اضافوں کے ساتھ پیش ہے"۔ ۹۶ صفحات کی اس کتاب کے آخر میں آٹھ اشعار کی ایک نظم ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۸۰/۱۷۶۶ء میں انہوں نے چالیس روز میں اس ترجمہ کی تکمیل کی ہے۔

شد میسر کارم از رب خلق	آنکہ پیدا کرد انسان از علق
یک ہزار و یک صد و ہشتاد می	سال ہجری بودہ است واثق
موجز القانون اندر چہل روز	شد مترجم جملہ تا آخر ورق

اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں اس کا مخطوطہ موجود ہے، یہ سنہ کی وضاحت کے بغیر ۱۰ رمضان کا مکتوبہ ہے، شاہ اہل اللہ کی تاریخ پیدائش ۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹ء اور تاریخ وفات ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء ہے جو قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں ان کی

قبر پرکندہ ہے[۱]، صاحب نزہتہ الخواطر نے، ۱۱۸۰ھ کے قریب وفات لکھی ہے[۲]۔ ان کی متعدد کتابوں میں مختصر ہدایتہ الفقہ مرغینانی، تفسیر قرآن مجید کے علاوہ فارسی میں فقہ، عقاید اور سلوک پر کتابیں ہیں۔

حکیم اسحٰق خاں

حکیم اسحٰق خاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ طب کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ شاہ عالم کے خصوصی معالج تھے ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸ء میں پنج ہزاری منصب اور معتمد الملک کا خطاب مرحمت ہوا۔ شاہ جہاں آباد کی دیوانی پر بھی مامور کئے گئے تھے[۳]، حکیم عبدالحی حسنی نے ان کا خطاب حاذق الملک بھی لکھا ہے[۴]۔ درس کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ علوم عقلی و نقلی کے ماہر طبیب حاذق حکیم امام بخش کرنپوری ان کے شاگرد ہیں[۵]۔

حکیم اسحٰق خاں نے عربی زبان میں طب کے تالیفی سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ ان کی تصانیف میں ایک غایتہ الفہوم فی تدبیر المحموم ہے۔ یہ کمیات قانون کی شرح ہے، دیباچہ کے مطابق یہ ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۹ء میں مرتب ہوئی ہے۔ اس میں شرح قرشی اور شرح گیلانی کو بطور بنیاد استعمال کیا گیا ہے۔ خدا بخش پٹنہ اور رضا لائبریری رامپور میں اس کے نسخے ہیں۔ موخر الذکر نسخہ پر احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کی مہر ثبت ہے۔

ان کی دوسری کتاب موارد الحکم فی علاج الامراض من الراس الی القدم ہے۔ یہ قانون ابن سینا کی جلد سوم کی تلخیص ہے، اس معالجاتی اختصار کی شرح کی طرف حکیم اسحٰق خاں نے ضرورت محسوس کی بلکہ یہ ایک دوسرے مصنف کی توجہ کا بھی مرکز بنی

---

[۱] قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین ص ۲۱۸ و ۲۱۹

[۲] نزہتہ الخواطر جلد ۶ ص ۴۴

[۳] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۱۸۹ نیز دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۱۱۷

[۴] نزہتہ الخواطر جلد ۶ ص ۳۲ [۵] تذکرہ علمار ہند ص ۲۶ نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۱۰۳

اور اس کی شرحوں نے بھی اس موضوع کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اہم مواد فراہم کیا۔ کلیم اللہ بن صبغۃ اللہ طبیب نے احمدی خاں کی فرمایش پر موارد الحکم کی جو شرح کی ہے وہ ۲۴۹ صفحات پر مشتمل رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے بروکلمان نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

حکیم اسحٰق نے خود بھی جوامع الکلم کے نام سے موارد الحکم کی شرح لکھی ہے۔ یہ دو ضخیم جلدوں میں ہے اور ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء کے بعد کی تصنیف ہے، رضا لائبریری میں اس کے نسخے موجود ہیں۔ ایک نسخہ کے حاشیہ پر حکیم اسحٰق خاں کے بیٹے کے ہاتھ کی یادداشتیں ہیں، یہ نسخہ ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۷ کا لکھا ہوا ہے[۱] حکیم ذکاء اللہ خاں اور حکیم غلام رضا خاں بیٹے تھے۔

حکیم سلامت علی خاں

حکیم سلامت علی خاں المخاطب بہ حذاقت خاں اطبا خاندان کنبوہ کے نامور فرد ہیں۔ یہ طب میں کامل اور علوم عقلی و نقلی میں فاضل تھے۔ امراء و سلاطین کے درباروں میں امتیاز و اعتبار حاصل تھا۔ قابلیت فن کے اعتراف میں ۱۲۱۰ھ ۱۷۹۵ء میں شاہ عالم نے حکیم حذاقت خاں کا خطاب عطا کیا تھا۔ فرمان شاہی کے الفاظ ہیں۔

"دریں وقت میمنت قران فرمان والا شان واجب الطاعت و الاذعان صادر شد کہ بمقتضائی وفور مراحم خاقانی و فرط تفضلات خسروانی کہ نمونہ افضال یزدانی است حذاقت انتباہ حکیم سلامت علی خاں را بخطاب حذاقت خاں عین الاعیان والارکان و فی الامثال و الاقران سرفراز و ممتاز فرمودیم باید کہ فرزندان کامگار و الابنا و وزرار ذوی الاقتدار و امرای عالی مقدار و جمیع ارکان دربار جہان مدار و حکام

---

[۱] قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین ص ۱۶۱

ممالک حذاقت انتباہ مذکور را از جناب فیض مآب بادشاہی بشمول این خطاب برگزیدہ والقاب پسندیدہ معزز و مباہی دانستہ انظار عنایت ما بدولت نسبت باحوال فرخندہ مآل خاندان مذکور یوماً فیوماً متزاید و نہایت قصور نماید،

تاریخ پانزدہم شہر جمادی الاول سال سی و ہفتم از جلوس ابد مانوس والاامر قوم شد"

حکیم سلامت علی خاں خاندان شاہی کی تباہی کے بعد آبائی وطن دہلی سے بنارس منتقل ہوئے۔ انگریزی عملداری شروع ہو گئی تھی۔ اپنے تبحر علمی کی وجہ سے بنارس میں کورٹ اپیل کے قاضی و مفتی ہو گئے۔ طبابت و فضیلت کے سبب شہر میں اول درجہ کا اعزاز تھا۔ ایک مرتبہ بنارس میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی امر پر نزاع ہوا۔ ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کو منہدم کیا جانے لگا۔ نئی عملداری تھی۔ کمپنی کو تشویش ہوئی۔ حکیم صاحب ہی شہر میں ایسے باا ثر آدمی تھے جن پر ہندو اور مسلمان دونوں متفق تھے، چنانچہ ان کی کوششوں سے فریقین میں صلح ہوئی۔[1]

حکیم محمد ہاشم

دہلی کے ایک ممتاز طبی گھرانے سے تعلق تھا۔ ان کے والد حکیم محمد احسن اور جد گرامی حکیم محمد افضل دہلوی نے دہلی میں طبی روایت کو آگے بڑھایا، حکیم محمد ہاشم کے درس کا سلسلہ تھا۔ انہوں نے برہان الدین نفیس کی کتاب شرح اسباب و علامات کا جو معالجات کی مشہور درسی کتاب ہے، حاشیہ لکھا ہے[2] شرح اسباب کی تشریح اور حل مطالب میں ان کا یہ ضخیم حاشیہ شاہ عالم کے عہد میں لکھا گیا ہے۔ ہندوستان

---

[1] المشاہیر ص ۲۸۲

[2] نزہۃ الخواطر جلد ۷، ص ۵۳۱

میں طب کے عربی سرمایہ اور بالخصوص معالجاتی ذخیرہ کی یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ کشف الاشکالات اس کا تاریخی نام ہے اس سے تاریخ تالیف ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء برآمد ہوتی ہے۔ یہ حاشیہ انہوں نے اپنے زمانہ شباب میں تحریر کیا تھا۔ طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ اور دارالعلوم دیو بند میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ مولانا آزاد کا نسخہ ۱۲۶۱ھ ۱۸۴۵ء کا مکتوبہ ہے۔ صفحات کی تعداد ۴۷۸ ہے[1]

حکیم غلام علی

حکیم غلام علی حسینی دہلوی شیخ فاضل اور اپنے زمانہ میں علم وعمل میں ماہر تھے۔ ان کا تعلق شیخ نوراللہ احراری کے خاندان سے تھا، طب کی تعلیم معتمد الملک حکیم محمد ہاشم علوی خاں سے حاصل کی تھی۔ آخر میں فرخ آباد میں نواب غضنفر جنگ کی سرکار سے وابستہ ہوتے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ درس وافادہ اور علاج ومعالجہ کی وجہ سے وہاں لوگوں کو ان سے بہت فائدہ پہنچا[2]

حکیم سراج الدین

علامہ زماں اور شاہ جہاں آباد کے مشاہیر اطباء میں تھے۔ ان کی تصانیف کو شہرت حاصل ہے، چراغ دین ۱۰ انتخاب بحرالکلام، علم رموز، عقل افزا، حکمت ایمانی، سراج منیر، سراج ہدایت، لب لباب مثنوی مولانا روم، دستور العمل علمائے متقدمین وعقلائے

---

[1] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۵/۱۲۸

[2] نزہتہ الخواطر جلد ۶ ص ۲۰۸ بحوالہ تاریخ فرخ آباد

سا بقین، مجموعہ گل، دیباچہ، قانون علاج ان کی کتابیں ہیں۔[1]

حکیم غلام رسول حکمت

بڑے جید عالم اور خوش تقریر بزرگ تھے۔ آبائی وطن کشمیر تھا۔ نواب غازی الدین فیروز جنگ کی مصاحبت کی بدولت بڑے کروفر سے زندگی بسر کرتے تھے۔ کچھ دنوں نواب فیض اللہ خاں والی رامپور (۱۷۹۴-۱۷۷۴ء) کے ہاں بھی ملازمت کی۔ دہلی میں انتقال ہوا۔

ان کے بزرگ محمد حسن قانی کشمیر کے شعراء مشاہیر میں گزرے ہیں۔ حکیم غلام رسول کے بیٹے حکیم عطاء اللہ قریشی انتظار بھی اچھے طبیب اور اچھے شاعر تھے۔ قدرت اللہ بلیغ سے تلمذ تھا۔ نواب فیض اللہ خاں کے صاجزادوں کے مصاحب رہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں داد سخنوری دیتے تھے۔[2]

حکیم مرزا محمد حسین سخن

ان کے بزرگوں کا کشمیر سے تعلق تھا۔ یہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ فن طب سے آگاہ تھے[3] قاسم نے زیادہ پرزور الفاظ میں تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہیں طب میں درجہ کمال حاصل تھا۔[4]

---

[1] تذکرہ علماء ہند ص ۷۱

[2] خمخانہ جاوید جلد ۱ ص ۲۵۲

[3] گلشن بے خار ص ۹۵

[4] مجموعہ نغز ص ۲۹۱

خوش خلق، متواضع[1]، خوش اختلاط، مرد قابل اور ماہر طب تھے[2]۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے[3]۔ سخن تخلص تھا۔ صاحب خمخانۂ جاوید کا بیان ہے کہ شاہ جہاں آباد کے قدیم شعرا سے تھے۔ طبابت میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت اور قابلیت تھی۔ تذکرہ ریختہ گویان ہند مؤلفہ صدر الدین میں ان کا ایک شعر درج ہے[4]۔

جو ہیں جان نکلی وو ہیں آن نکلا — بھلا مرتے مرتے تو ارمان نکلا

فارسی میں خاص ملکہ تھا[5]۔

حکیم میر محمد سجاد

میر محمد سجاد خلف میر محمد عظیم مصحح فرامین شاہی تھے۔ آذربائیجان سے آنے کے بعد ان کے آباواجداد کا وطن آگرہ بنا۔ ان کا قیام شاہ جہاں آباد میں رہا۔ انہیں جس فن میں دخل تھا وہ کمال کے درجہ کا تھا۔ علم طب کی باقاعدہ تکمیل کی تھی۔ شوق طلسمات، انشا، خوشنویسی و شعر فہمی میں اعلیٰ مرتبہ کے حامل تھے۔ نام کی مناسبت سے سجاد تخلص کرتے تھے۔ میاں آبرو (وفات ۱۷۴۷ء) کے شاگرد تھے[6]۔

جب وطن میں رہتے تھے، شوق سخن کا یہ حال تھا کہ ہمیشہ مشاعرہ میں شعرا کو بلاتے تھے[7]۔

---

[1] عمدہ منتخبہ ص ۳۵۵

[2] طبقات شعرائے ہند ص ۳۳۰

[3] یادگار شعرا ص ۹۱ سخن شعرا ص ۲۱۲

[4] خمخانہ جاوید جلد ۴ ص ۱۳۸

[5] گلستان بے خزاں ص ۱۰۴

[6] تذکرہ شعرائے اردو ص ۸۸

[7] گلستان بے خزاں ص ۱۰۵

حکیم میر ماشاء اللہ مصدر

خاندان کے اعتبار سے گرامی منزلت تھے۔ ان کے بزرگ ہندوستان میں نجف اشرف سے آئے تھے بعض کا کہنا ہے کہ کشمیر کے سادات صحیح النسب سے ہیں۔ وہاں کسی زمانہ میں سمرقند سے آئے تھے۔ پھر دہلی میں آکر سکونت اختیار کی۔ رفتہ رفتہ امرا شاہی میں داخل ہوئے اور بعض ان میں طبل ونقارہ سے بلند آوازہ ہوئے۔ پیشہ خاندان کے بموجب میر ماشاء اللہ خاں دربار شاہی میں طبیب تھے[1] اور زمرہ امرا میں داخل تھے۔ ان کے خاندان کی خوبیوں اور گھر کے چال چلن کو دلی اور لکھنؤ کے سب شرفا مانتے تھے۔ ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ ان کے ہاں عورتوں کی پوشاک گھر میں دھوتے تھے یا جلا دیتے تھے۔ دھوبی کو نہ دیتے تھے کہ نا محرم کے ہاتھ میں عورتوں کا لباس نہ جائے[2] محمد حسین آزاد کی بیان کردہ یہ خصوصیت کچھ اس خاندان کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھی دہلی اور دوسرے شہروں کے شرفا کے ہاں بھی یہی دستور تھا۔ ہمارے خاندان میں نجارہ میں ۱۹۴۷ء تک یہ وضع قائم رہی۔

مغلیہ سلطنت کے ضعف میں میر ماشاء اللہ کو دہلی سے مرشد آباد جانا پڑا۔ وہاں اعزاز واکرام سے رہے۔ نواب سراج الدولہ (وفات ۱۷۵۷ء) کی رفاقت میں عروج پایا۔ وہاں ان کی امارت کا یہ عالم تھا کہ اٹھارہ زنجیر فیل ان کے ہاتھی خانہ میں تھے[3] امیر الامرا نواب ذوالفقار الدولہ کے عہد میں سامان امارت اور دو زنجیر فیل کے ساتھ ممالک شرقیہ سے دہلی آئے تھے[4] مصحفی نے لکھا ہے کہ ان کے طبی کمالات

---

[1] ابائے عہد مغلیہ ص ۱۶۸ بحوالہ سیر المتاخرین جلد ۲ ص ۶۰۶

[2] آب حیات ص ۲۴۷

[3] ابائے عہد مغلیہ ص ۱۶۸ [4] طبقات شعرائے ہند ص ۲۰۱

حد درجہ شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے بیان کی حاجت نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر چہ اس نے انہیں دیکھا ضرور تھا مگر ان کے اوصاف اور کمال کا بہت تذکرہ سنا ہے[۱] شیفتہ نے "در طب جانگاہی شائستہ دارد"[۲] اور باطن نے انہیں علم طب کا استاد لکھا ہے[۳] میر حسن نے ان کی تعریف کرتے ہوئے ان کے لیے حکیم الحکما کا لقب استعمال کیا ہے[۴] علم طب میں مہارت و خوبی اور امارت و تمول کے علاوہ مشہور شاعر تھے[۵] اور بدیہہ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا[۶] مزاج میں سخاوت اور مروت تھی[۷] ان کا تخلص مصدر اور بیٹے کا تخلص انشا تھا۔ مصدر اور انشا میں قدرتی مناسبت واقع ہوئی ہے۔ صاحب نزہتہ الخواطر نے تاریخ فرخ آباد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حکیم ماشاء اللہ آخر میں فرخ آباد آ گئے تھے، وہاں انہوں نے شاندار زندگی بسر کی اور وہیں مظفر جنگ (۱۷۷۱ء میں اپنے والد احمد خاں بنگش کے جانشین ہوتے تھے۔) کے زمانہ میں وفات پائی[۸] ان کے سلسلہ میں یہ بہت اہم حوالہ ہے اس لیے کہ فرخ آباد قیام اور وہاں انتقال کا اس کے علاوہ کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔

حکیم انشاء اللہ خاں انشا

حکیم ماشاء اللہ خاں مصدر کے صاحبزادہ تھے۔ مرشد آباد میں پیدا ہوتے۔ اپنے

---

۱ تذکرہ ہندی ص ۲۵۰
۲ گلشن بے خار ص ۱۷۷
۳ گلستان بے خزاں ص ۲۱۶ ۴ تذکرہ شعراء اردو ص ۲۷
۵ طبقات شعرائے ہند ص ۱۹۲
۶ عمدہ منتخبہ ص ۳۳۷
۷ مجموعہ نغز ص ۸۰
۸ نزہتہ الخواطر جلد ۶ حصہ ۲۴۸

والد کی طرح ہوشیار طبیب اور ہندوستان کے بہت زیادہ قابل شعرا میں تھے جس طرح اگلے وقتوں میں خاندانی امیرزادے تعلیم پاتے تھے اسی طرح سید انشا کو سب ضروری علوم میں ماہر کیا گیا۔[1] سرور اور قاسم نے ان کے طبی مرتبہ کے بارے میں لکھا ہے "انشا در فن طب مہارت کلی دارد"[2] یہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ ترکی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کا قیام لکھنؤ میں اگرچہ سلیمان شکوہ کی ملازمت میں رہا۔ لیکن دہلی جوان کا آبائی وطن تھا، آمد و رفت کا سلسلہ رہتا تھا۔ دہلی کے مشاعروں میں شرکت اور وہاں شعری ماحول گرم رکھنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ حکیم سید انشا کی خداداد ذہانت طباعی، شوخی ظرافت اور جدت کا ایک زمانہ قائل ہے، ان کی خاندانی شرافت اور خاندانی اخلاق و آداب دلی اور لکھنؤ کے سب شرفا مانتے تھے ان کے بزرگ دلی میں آکر بس گئے اور وہیں کے ہو گئے[3]

آزاد نے لکھا ہے ایسا طباع اور عالی دماغ آدمی ہندوستان میں کم پیدا ہوا ہوگا وہ اگر علوم میں سے کسی ایک فن کی طرف متوجہ ہوتے تو صدہا سال تک وحید عصر گنے جاتے۔ طبیعت ایک ہیولیٰ تھی کہ ہر قسم کی صورت پکڑ سکتی تھی، باوجود اس کے شوخی اس قدر کہ سیماب کی طرح ایک جا قرار نہ تھا۔ انہوں نے کسی سے اصلاح نہ لی۔ والد کو ابتدا میں کلام دکھایا۔ مرشد آباد کے حالات بگڑنے پر وہاں سے دلی آئے۔ اس وقت دلی کا دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ اور سجادہ نشین اس کے شاہ عالم بادشاہ تھے۔ وہ خود بھی شاعر تھے۔ انہوں نے اس نوجوان کو خلعت عزت عطا کی۔ اہل دربار میں داخل ہوتے۔ اپنے اشعار کے ساتھ لطایف و ظرایف سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے، یہ عالم ہوا کہ شاہ عالم کو ان کی جدائی ناگوار تھی، ان کی طبیعت کی شوخی، زبان کی طراری، تراوشوں کی نئی پھبن، ایجادوں کے بانکپن کے آگے

---

[1] آب حیات ص ۲۴۷   [2] عمدہ منتخبہ ص ۴۴ و مجموعہ نغز ص ۸۰

[3] مقدمہ دریائے لطافت ص الف

پرانے مشاق شاعروں میں سے کوئی ٹک نہیں پاتا تھا۔ چشمکوں اور نکتہ چینیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان میں مرزا عظیم بیگ بھی تھے جو اپنے کو صائب کا ہم رتبہ سمجھتے تھے اور ان معرکوں میں سب سے آگے رہتے تھے۔ ایک دن وہ حکیم ماشاء اللہ خاں کے پاس آئے اور غزل سنائی جو بحر رجز میں تھی مگر ناواقفیت کی وجہ سے کچھ شعر بحر رمل میں جا پڑے تھے۔ سید انشا بھی موجود تھے، تاڑ گئے، حد سے زیادہ تعریف کی اور اصرار سے اسے مشاعرہ میں پڑھنے کے لیے کہا۔ مدعی کمال نے کہ مغز سخن سے بے خبر تھا[1] یہ غزل مرزا مینڈھو کے ہاں مشاعرہ میں پڑھ ڈالی۔ سید انشا نے وہیں تقطیع کی فرمایش کی[2]۔ اس وقت اس غریب پر جو گزری سو گزری۔ سید انشا نے اس کے ساتھ سب کو لے ڈالا اور کوئی دم نہ مار سکا۔ اس کے بعد دونوں طرف سے زبردست معرکہ گرم رہا۔ اور ایک دوسرے کے خلاف ناقابل تحریر سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد ایک مشاعرہ میں کمریں باندھ باندھ کر آئے۔ یہ مشاعرہ ایک خطرناک معرکہ تھا۔ حریفوں نے تیغ و تفنگ اور اسلحہ جنگ سنبھالے تھے، بھائی بند اور دوستوں کو ساتھ لیا تھا۔ بعض کو ادھر ادھر لگا رکھا تھا اور بزرگان دین کی نیازیں مان مان کر مشاعرہ میں گئے تھے۔ سید انشا نے جو شعر پڑھے تھے ان میں سے بعض ہیں ؎

ایک طفل دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے	کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے
کیا مال بھلا قصر فریدوں مرے آگے	کانپے ہے پڑا گنبد گردوں مرے آگے
ہوں وہ جبروتی کہ گروہ حکما سب	چڑیوں کی طرح کرتے ہیں چوں چوں مرے آگے
بولے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں	بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے
مجرے کو مرے خسرو پرویز ہو حاضر	شیریں بھی کہے آکے بلالوں مرے آگے

ان کے بعد حکیم میر قدرت اللہ قاسم کے سامنے شمع آئی۔ انہوں نے پڑھنا ہی چاہا

---

[1] آب حیات ص ۲۵۷

[2] طبقات شعرائے ہند ص ۳۴۳

تھا کہ میر مشاعرہ کو خیال ہوا کہ سید انشا کی ہجو کہی گئی ہو گی۔ مبادا اشرفا میں بے لطفی حد سے بڑھ جائے۔ اسی وقت اٹھے کہ دونوں میں صلح کرا دیں۔ سید انشا نے بھی شرافت خاندانی اور علو حوصلہ سے کام لیا۔ اٹھ کر حکیم صاحب کے گلے لپٹ گئے اور کہا حضرت حکیم صاحب آپ میرے بنی عم، اس پر صاحب علم، صاحب فضل، خاکم بدہن بھلا میں آپ پر طنز کروں گا۔ البتہ مرزا عظیم بیگ سے شکایت ہے کہ وہ خواہ مخواہ بد دماغی کرتے ہیں۔ غرض کہ سب کی صلح پر خاتمہ ہو گیا[1]

اس مشاعرہ میں انشا اور دوسرے شعرا کے علاوہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، حکیم ثنار اللہ فراق، مرزا عظیم بیگ اور شیخ ولی اللہ محب بھی تھے۔ یہ چاروں اشخاص اپنے زمانہ کے سخن سنج، سخن داں، سخن فہم اور سخن گو تھے[2] دوسرے شعرا میں قاسم نے برکت اللہ خاں برکت اور مشتاق علی خاں مشتاق کے نام لئے ہیں[3]

انشا کا دل دلی سے اچاٹ ہوا، لکھنؤ کا رخ کیا۔ دلی کے قدیم تعلق سے لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں پہنچے۔ وہ شاہ عالم کے بیٹے تھے، شاعری سے بہت تعلق تھا۔ لکھنؤ میں ان کے دولت کدہ پر اہل دہلی کے علاوہ شعرا کا مجمع رہتا تھا، وہاں سید انشا کا مصحفی سے پالا پڑا۔ سلیمان شکوہ کے ہاں مصحفی، جرأت اور انشا ہمعصر تھے۔ شعری چشمک رہتی تھی قطب الدین باطن کے بقول یہ تینوں اکثر مشاعروں میں ہم ردیف رہتے[4] انشا اور مصحفی کے معرکے مشہور ہیں۔

کلیات کے علاوہ انشا کی ایک کتاب دریائے لطافت ہے جس میں قواعد اردو سے بحث کی گئی ہے۔ ایک داستان بھی اردو میں ان کی یادگار ہے، اردو قواعد

---

[1] آب حیات ص ۲۴۸ تا ۲۵۰

[2] عمدہ منتخبہ ص ۲۵

[3] مجموعہ نغز ص ۸۲

[4] گلستان بے خزاں ص ۵۹

پر اگرچہ اس سے پہلے بعض اہل یورپ نے متعدد کتابیں لکھی تھیں لیکن یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہل زبان نے لکھی ہے۔ عبدالحق کے مطابق یہ نہایت مستند اور محققانہ کتاب ہے[1]

انشا کے شاگردوں میں ایشوری سنگھ نشاط دہلوی (گلشن بے خار صفحہ ۲۳۰) منّھن لال نامی دہلوی (یادگار شعرا صفحہ ۱۷۳) محمود بیگ شور دہلوی (یادگار شعرا صفحہ ۱۰۲) میر صادق علی صادق (عمدہ منتخبہ صفحہ ۷۰۰ طبقات شعرائے ہند صفحہ ۳۴۱ تذکرہ ہندی صفحہ ۱۴۸) طالب حسین خاں طالب (طبقات شعرائے ہند صفحہ ۲۷۱ عمدہ منتخبہ صفحہ ۴۱۱) طالب علی عیشی (تذکرہ ریاض الفصحا صفحہ ۲۲۸) وغیرہ ہیں، ان سے دہلی میں ان کے شعری اعزاز کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں انشا کے دو شعر ضرور لکھنا چاہوں گا۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

حکیم عوض علی مدعا

میر عوض علی ایک اچھے طبیب اور حافظ رحمت خاں (وفات ۱۷۷۴ء) کے ملازم تھے اردو میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس میں پشتو کے بکثرت الفاظ استعمال کئے تھے۔ صاحب تذکرہ شعرائے اردو نے لکھا ہے کہ یہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاعر بے نظیر و منشی خوش تحریر، طبیب خوش نصیب بہ حذاقت قریب، عنایت خاں خلف حافظ رحمت خاں کے ہاں از رہ قدر دانی تین سو روپیہ پر ملازم تھے اس طرح

---

[1] مقدمہ دریائے لطافت صفحہ ح (۱۲۲۳ھ) کی بہ تصنیف عبدالحق کی مساعی سے انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام ۱۹۱۶ء میں پہلی بار اور ۱۹۳۵ء میں دوسری بار طبع ہوئی ہے، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

[2] یادگار شعرا ص ۱۵۴

آخر میں بریلی میں بھی قیام رہا۔[1]

حکیم شریف خاں

حکیم شریف خاں بن اکمل خاں ابن حکیم واصل خاں سے پہلے اگرچہ خاندان میں طب کی تین پشتیں گزر چکی تھیں مگر یہ امتیاز انہی کے حصہ میں آیا کہ ان کے نام سے اس خاندان کو شہرت دوام ملی۔ حذاقت فن، بیش قدر تصنیفات اور کثرت تلامذہ کی وجہ سے وہ اس خانوادہ کے گل سرسبد ہیں، ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء میں پیدا ہوئے، اپنے والد حکیم اکمل خاں اور چچا حکیم اجمل خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں۔[2] حکیم عابد سرہندی شارح اسباب و علامات جیسے فاضل استاد سے تلمذ کا موقع ملا۔ شاہ عالم کے زمانہ میں مرتبہ کمال کو پہنچے، دہلی میں حکیم علوی خاں کے بعد ان سے زیادہ شہرت کسی طبیب کو حاصل نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں علوی خاں کی حذاقت و استادی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ حکیم شریف خاں اپنے زمانہ میں ان کے مدمقابل ثابت ہوئے اور بعد کے ہندوستانی اطبا بالخصوص اطبائے دہلی کے لیے یہ دونوں سند قرار پاتے۔ تلمذ کے لحاظ سے اطبا انہی دو کے سلسلہ سے وابستہ تھے، اور ان کے نام کے ساتھ بطور امتیاز علوی خانی اور شریف خانی لکھا جاتا تھا۔ حکیم علوی خاں کے بعد حکیم شریف خاں سے دہلی کو رونق ملی۔ دہلی میں طب کو فروغ بخشنے میں ان کا بہت زیادہ حصہ ہے نہ صرف دہلی بلکہ ہندوستان بھر میں اس جامعیت کا کوئی طبیب نہیں تھا۔ ملک کے مختلف حصوں سے ان کا طبی شہرہ سن کر طلبہ دہلی کا رخ کرتے تھے اور دہلی دار الطب بن گئی تھی۔ طب ان کے خاندان میں

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۸۰

[2] نزہتہ الخواطر جلد ۷، ص ۲۱۰

نسلاً بعد نسلٍ متوارث رہی۔

مطب و معالجہ کے باوجود اعلیٰ علمی ذوق کی بنا پر تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا اور طب و دیگر علوم میں متعدد کتابیں تصنیف کیں، وہ پہلے ہندوستانی طبیب ہیں جنہوں نے اپنے معمولات میں آیورویدک کی مفید صورتوں کا اضافہ اور مجتہدانہ طریقہ پر کشتوں کا استعمال کیا۔ انہوں نے علمی طور پر بھی اس کی وکالت کی اور اس کے فروغ کے اہتمامات کئے۔

حکیم شریف خاں، محرم ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ کو تقریباً ۸۲ برس کی عمر میں فوت ہوئے درگاہ خواجہ قطب الدین کے صحن میں مدفون ہیں، شاہ عبد العزیز نے دخل الجنۃ بلا حساب مادۂ تاریخ کہا ان کی قبر کے کتبہ پر "ہذا مرقد اشرف الحکما محمد شریف خان الدہلوی دخل الجنۃ بلا حساب" لکھا ہوا تھا۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں دوسرے کتبات کے ساتھ اس قبر کے کتبہ کو بھی توڑ دیا گیا، قبر بغیر کتبہ کے ٹھیک حالت میں ہے یہ درگاہ کی مسجد کے جنوب میں راستہ کے قریب واقع ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد جواہر لال نہرو وزیر اعظم جب درگاہ شریف گئے اور حکیم ہلال قطبی سجادہ نشین کے والد نے جو اس وقت سجادہ نشین تھے، حکیم شریف خاں کی قبر اور دوسری ٹوٹی ہوئی قبریں دکھائیں تو وہ آبدیدہ ہوگئے اور افسردہ اور غمگین چہرہ کے ساتھ حکیم شریف خاں کی قبر پر کچھ دیر ٹھہرے رہے۔

رحمٰن علی نے ۱۲۳۱ھ ۱۸۱۵ء تاریخ وفات لکھی ہے اور یہ قطعہ درج کیا ہے۔[1]

دریغا ازیں دار فانی گزشت حکیم و طبیب و لطیف و ظریف
خرد گفت سال وفاتش بمن صد افسوس مرزا محمد شریف

قانون اور متعلقات قانون پر پانچ کتابوں حاشیہ قانون، ترجمہ کلیات قانون، ترجمہ حمیات قانون، شرح موجز، حاشیہ نفیسی بنام مدارک الحکم کے علاوہ دیگر طبی

---

[1] تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۵

کتابوں میں فوائد نثر بقیہ یعنی حاشیہ شرح اسباب، علاج الامراض، تالیف شریفی، عجالہ نافعہ، اسرار العلاج، دستور الفصد، رسالہ خواص الجواہر، تحفہ عالم شاہی ہیں۔ ترجمہ کلیات قانون اور ترجمہ معالجات بقراطیہ ان کی حیات میں ضایع ہو گئی تھیں۔ رسالہ قوت باہ، رسالہ مارالجبن، رسالہ چوب چینی بعد میں تلف ہوئیں۔ حکیم صاحب کی غیر طبی کتابوں میں ترجمہ و تفسیر قرآن مجید (فارسی واردو) کاشف المشکوٰۃ (حدیث) سوالات اربعہ (تصوف) آثار النبوت، شرح سلم، حاشیہ حمد اللہ (منطق) ہیں۔ حکیم صاحب کی باقیات میں بلی ماران کی مسجد بھی ہے، جس کے زیر سایہ غالب کا قیام رہا[۱]

حکیم شریف خاں کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ملتا ہے کہ ایک دن اپنے دیوان خانہ میں بیٹھے کچھ مکان بنوانے کی فکر میں تھے، اور دل ہی دل میں حساب لگا رہے تھے۔ تیسرا پہر تھا، جو ایک بیمار آیا۔ اس شخص کو خفقان کی بیماری تھی، حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر یہ نسخہ تجویز کیا، بارہ کڑیاں نوستون روپیہ کے وزن میں لپیٹ کر کھاؤ، عطار نے نسخہ پڑھ کر مریض سے کہا کہ اس میں یہ لکھا ہے۔ حکیم صاحب سے جاکر پوچھو۔ مریض نے حاضر ہو کر کہا حضور فدوی کا اتنا بڑا حلق نہیں ہے جو بارہ کڑیاں اور نوستون نگل جائے۔ حکیم صاحب نے اس ہاتھ سے نسخہ لے کر پڑھا اور بہت ہنسے[۲]

حکیم قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ مرزا محمد غیاث نے جو انشاپردازی اور سخن آرائی میں کمال رکھتے تھے، شریف الحکما، رئیس الاطبا، مقتدائے متفلسفین، پیشوائے منطقین، محور فلک فطانت، عضادہ اسطرلاب متانت، سرکردہ فضلائے جہاں حکیم محمد شریف خاں مدظلہم کی مدح میں جو قصیدہ کہا ہے اس کے صنایع و بدایع کی اہل زبان ایرانی فضلا نے تعریف کی ہے۔ قصیدہ کا ایک شعر ہے[۳]

---

[۱] قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین ص ۱۶۵ و ۱۶۶

[۲] لال قلعہ کی ایک جھلک ہے ص ۷۸

[۳] مجموعہ نغز جلد ۲ ص ۲۵۹

طفل نہ ماہہ اگر یک ماشہ ایں معجون خورد . عاقر صد سالہ را صد بار آبستن کند

حکیم محمد مہدی خاں

حکیم اجمل خاں کے فرزند اور حکیم شریف خاں کے چچازاد بھائی تھے۔ یہ بڑے صاحب علم اور حاذق طبیب تھے، انہوں نے ایک قرابادین بھی مرتب کی تھی، خاندان شریفی میں اس کا مخطوطہ موجود تھا[۱]

حکیم محمد اشرف خاں

حکیم شریف خاں کے بڑے بیٹے تھے، علوم متعارفہ سے واقف[۲] اور اپنے والد کی طرح بے مثل طبیب تھے[۳] اکبر شاہ ثانی کے دربار میں اعزاز اور شاہی طبیب کا منصب حاصل تھا، مسیح الزماں کے خطاب سے نوازے گئے تھے، تجویز اور معالجہ میں درجہ کمال حاصل تھا، مشکل امراض کے علاج میں خصوصیت تھی[۴]

اکبر شاہ کے حکم سے مرزا جہانگیر کے ہمراہ الہ آباد گئے، اور جب تک شہزادہ موصوف زندہ رہے، ان کے پاس قیام رہا، ان کی وفات کے بعد وطن واپس آئے۔ اکبر شاہ ثانی ہی کے عہد میں قضا کی[۵] تاریخ وفات ۲ جمادی الثانی ۱۲۳۸ھ/۲۲-۱۸۲۲ء

---

[۱] بڑی بیاض ص ۱۹

[۲] گلشن بے خار ص ۶۱

[۳] سخن شعرا ص ۱۳۶

[۴] مجموعہ نغز ص ۲۲۱

[۵] خمخانہ جاوید جلد ۲ ص ۹۲-۹۳

ہے۔ انتقال کے وقت عمر ۶۵ برس تھی۔ سرکار انگریزی سے پنشن ملتی تھی[1] ان کے تین برس بعد ہی دوسرے بھائی حکیم شرف الدین ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء میں لاولد فوت ہوئے حکیم اشرف کو شاعری سے ذوق تھا۔ حکیم تخلص کرتے تھے۔ اردو شعرا کے تذکرہ نگاروں نے ان کے فن اور کلام کی تعریف کی ہے۔ باطن نے کہا ہے " بعلاج امراض مہلک مسیح زمان نسخہ کتاب طبع شفا بخش مریضان "[2]

کریم الدین کا بیان ہے " علوم متعارفہ سے بہرہ ور اور غوامض فنون شریفہ سے باخبر تھے۔ تشخیص امراض اور تعیین اعراض میں دست قدرت رکھتے تھے، نہایت خوش طبیعت، یار باش، خوش مزاج، ظریف الطبع، پاکیزہ معاش، شیریں زبان، عذب البیان تھے "[3]

سرور کے مطابق طب میں بلند مرتبہ رکھتے تھے، معالجہ میں مسیحائی کا کام کرتے تھے۔ حضور انور سے مسیح الزماں کے خطاب سے سرفراز کئے گئے تھے، کبھی کبھی اردو میں شعر کہتے تھے، خلیق، یار باش، اور خوش گفتار تھے۔ سرور کے ساتھ یگانگت اور یک جہتی کا رابطہ مستحکم تھا[4] چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مرے رونے نے اس کو مجھ سے کھویا ۔۔۔ مجھے اس دیدۂ تر نے ڈبو یا

کہوں کیا میں بہ رنگ زخم ناسور ۔۔۔ ہنسا یک بار گر سو بار رویا

حکیم یک بیک آیا جو زندگی کا خیال ۔۔۔ تو اپنی نظروں میں سارا جہاں ہوا تاریک

کہ مثل شیشۂ ساعت کٹے ہے ہر دم عمر ۔۔۔ ہر اک نفس نفس واپسیں سے ہے نزدیک

---

[1] تذکرۃ الخواجگان ص ۹۱

[2] گلستان بے خزاں ص ۷۲

[3] طبقات شعرائے ہند ص ۲۴۶

[4] عمدہ منتخبہ ص ۲۲۱

کہے ہے لخت جگر اشک سے کہ اے ہمدم
نہ تاگے سے سیا جاوے نہ ریشم کا لگے ٹانکا

ذرا تو ٹھہر کہیں یوں بیٹھ کر ہم دم
کہاں سے لائیں سینے کو دل صد چاک کے ڈورے

حکیم عبد الشافی خاں

حکیم عبد الشافی خاں مسیح الملک دہلوی صاحب درس وافادہ اور حاذق طبیب تھے کثیر تعداد میں لوگوں نے ان سے طب میں استفادہ کیا تھا۔

ان کے بیٹے حکیم محمد ارشد المعروف حکیم شفائی خاں ہندوستان کی طبی تاریخ کی نہایت اہم شخصیت ہیں۔ معالج اور مصنف دونوں حیثیتوں سے امتیاز رکھتے تھے۔ دہلی میں ایک عرصہ تک مطب اور تدریس کے بعد احمد شاہ درانی کے حملہ کے وقت شفائی خاں فیض آباد منتقل ہوتے۔ اودھ میں ان کی طبابت کا ڈنکا بجا۔ ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۴ء میں انتقال کیا۔[1]

نادر شاہ اور پھر احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے بعد دہلی کے جو بہت سے صاحب کمال ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں منتقل ہوئے ان میں ذی مقدرت اطبا بھی شامل تھے۔ آگے چل کر ۱۸۵۷ کا سانحہ بھی دہلی کے لیے قیامت صغریٰ سے کچھ کم نہ تھا۔

حکیم اسرائیل خاں

دہلی میں شاہ عالم کے زمانہ میں درباری وشاہی طبیب تھے۔ حکیم الممالک کا خطاب اور چھ ہزاری منصب حاصل تھا۔[2]

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد، ص ۲۴۴ علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۵۲ / ۱۲۸

[2] اطبائے عہد مغلیہ ص ۴۹ بحوالہ شاہ عالم نامہ ص ۱۲۳

حکیم کریم اللہ

حکیم مولوی کریم اللہ حکیم شریف خاں کے کم عمر معاصر تھے، انہوں نے حکیم شریف خاں کے حاشیہ نفیسی کے جواب میں عربی میں نفیسی کا حاشیہ تحریر کیا ہے۔ اس میں حکیم شریف خاں کی بعض وضاحتوں سے اختلاف کیا گیا ہے، جامعہ ہمدرد نئی دہلی میں اس کا مخطوطہ محفوظ ہے۔[1]

حکیم اسد علی

دہلی کے ممتاز طبی گھرانے کے صاحب نظر اور عالم طبیب تھے۔ ان کے والد حکیم درویش محمد اور دادا عارف و حکیم نجم اللہ الملقب بہ حافظ عالم خاں دہلی کے ذی حیثیت افراد میں تھے۔ یہ شاہ جہاں آباد کے مضافات کے رہنے والے تھے۔ اس زمانہ میں تغلق آباد، مہرولی، چراغ دہلی وغیرہ سب کا شمار دہلی کے مضافات میں تھا۔ اور دہلی صرف شاہ جہاں آباد کو کہا جاتا تھا۔

حکیم اسد علی کا درس و تدریس کا سلسلہ رہتا تھا۔ حکیم شریف خاں کے حاشیہ شرح اسباب کے طویل اور بسیط ہونے کی وجہ سے اس کے مضامین کے مطالعہ میں طلبہ کی دشواری کے پیش نظر انہوں نے شرح اسباب پر ایک حاشیہ تحریر کیا۔ اس میں اس بات کا لحاظ رکھا کہ کتاب کا نفس مطلب ادجھل نہ ہو اور طلبہ کے سامنے تمام ضروری مباحث آجائیں، یہ شرح ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں کی گئی ہے، اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔[2]

---

[1] قانون ابن سینا شارحین و مترجمین ص ۱۶۶ [2] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۲/ ۱۲۸

مرزا محمد ظہیر الدین اظفر گورگانی

ایک مغل شہزادہ جس کا طب سے گہرا تعلق تھا مرزا علی بخت بہادر محمد ظہیر الدین اظفر گورگانی ہے، یہ ۱۱۷۲ھ ۵۸-۱۷۵۷ء میں قلعہ معلی میں پیدا ہوا۔ وہاں سے راجستھان کے شہروں جے پور، جودھپور کی سیاحت کرتا ہوا لکھنؤ پہنچا۔ نواب آصف الدولہ نے اعزاز و اکرام کیا۔ لکھنؤ میں کئی سال مقیم رہ کر مدراس منتقل ہوا اور مدراس ہی میں ۱۲۳۴ھ/۱۸-۱۸۱۸ء میں فوت ہوا۔ طب اور رمل میں خصوصی مہارت تھی۔ شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ اس کا اردو دیوان مدراس یونی ورسٹی سے شایع ہوا ہے۔ واقعات اظفری اس کی مشہور کتاب ہے۔ مدراس سے اس کا اردو ترجمہ چھپ گیا ہے۔

اپنی سرکار سے وابستہ حکیم حسین رضاخاں کی فرمایش پر اظفری نے بقراط کے رسالہ قبریہ کا فارسی میں ترجمہ کیا اور پھر اسے نظم کا جامہ پہنایا تھا۔

حکیم مظہر علی خاں مظہر

حکیم مظہر علی خاں عرف منجھو خاں حکیم عسکری خاں کے دوسرے بیٹے اور حکیم بو علی خاں کے بھائی تھے۔ قاسم کے تذکرہ لکھنے کے وقت انتقال کر چکے تھے[1]

سرور نے انہیں برادر زادہ حکیم بو علی خاں لکھا ہے اور باپ کا نام تحریر نہیں کیا ہے[2]

---

[1] مجموعہ نغز جلد ۲ ص ۲۲۰

[2] عمدہ منتخبہ ص ۶۸۱

حکیم شیخ محسن رضا

دہلی کے رہنے والے تھے۔ نواب فرخ آباد کے ہاں طبی خدمات انجام دیں۔ رضا تخلص کرتے تھے۔ صاحب دیوان تھے۔[1]

حکیم فضل اللہ مرزا

حکیم فضل اللہ پانی پتی عرف مرزا نینا طب میں مہارت شایان حاصل تھی۔[2] کریم الدین نے بھی طب میں ان کی قابلیت کا اعتراف کیا ہے۔ اردو اور فارسی دونوں میں کلام ہے لیکن فارسی میں زیادہ شعر کہتے تھے، فارسی میں ان کے بہت سے شاگرد تھے کریم الدین کے والد نے بھی ان سے فارسی پڑھی تھی۔ اس زمانہ کے طبیبوں، شاعروں اور فارسی دانوں میں ان کا بڑا مرتبہ تھا۔[3] قاسم نے انہیں خوش طبع، پاکیزہ معاش، صاحب شعور اور خرد مند لکھا ہے، یہ حکیم محمد حفیظ خاں کے داماد تھے۔ اور حکیم حفیظ خاں مرزا عبدالقادر بیدل کے بڑے بھائی مرزا عبداللہ کے احفاد میں تھے۔[4] اسپرنگر نے سرور کے حوالہ سے خود انہیں مرزا بیدل کی اولاد سے لکھا ہے۔[5] ۱۸۰۸ء کے قریب انتقال ہوا۔

حکیم میر حسین تسکین

---

[1] گلستان بے خزاں ص ۱۰۰ [2] گلشن بے خار ص ۱۷۵
[3] طبقات شعرائے ہند ص ۳۴۹
[4] مجموعہ نغز جلد ۲ ص ۱۷۹
[5] یادگار شعرا ص ۱۵۵

حکیم میر چشتی مولانا فخر الدین کے مرید تھے[1] حضرت کی ان کے حال پر بے حد عنایت تھی۔ اطبا رجلیل القدر کی موجودگی کے باوجود ان کے علاوہ کسی کی تجویز کردہ دوا استعمال نہیں کرتے تھے اور دوسروں کو بھی ان کے علاج کا مشورہ دیتے تھے[2]

خط نسخ، نستعلیق، شفیعائی اور شکستہ میں جواب نہیں تھا۔ موسیقی میں میاں نورنگ کلاونت کے شاگردوں میں تھے، اور مہارت پیدا کی تھی، علوم عربیہ سے بھی بہرہ مند تھے، اگرچہ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے[3] لیکن زیادہ کلام فارسی میں ہے[4]

حکیم مرزا محمد کامل

حکیم مرزا محمد کامل بن غیاث احمد دہلوی (وفات ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) علم وفضل کے خاندان سے ایک فاضل کامل اور جامع کمالات تھے۔ طب میں حکیم شریف سے تلمذ تھا، ان کے والد بھی صاحب علم وفضل اور شاعر تھے۔ کامل میر شمس الدین فقیر مصنف حدائق البلاغت کے شاگرد تھے۔ ان کے ایک مبسوط رسالہ علم قوافی کا ذکر محمد حسین آزاد نے کیا ہے، انہوں نے شاہ عبدالعزیز کے تحفۂ اثنا عشریہ کا جواب بھی لکھا تھا۔ آخر کے تین باب باقی تھے کہ انتقال ہو گیا۔ حکیم صاحب کا علاج معالجہ کا کامیاب سلسلہ تھا، محمد حسین آزاد کے والد انہی کا علاج کرتے تھے[5]

---

[1] عمدہ منتخبہ ص ۲۳۲

[2] مجموعہ نغز ص ۲۰۷

[3] طبقات شعرائے ہند ص ۱۷۴

[4] یادگار شعرا ص ۶۳

[5] آب حیات ص ۴۳۹

حکیم کامل نے برہان الدین نفیس کرمانی کی کتاب نفیسی کے ان مقامات کی شرح میں جن پر شکوک و شبہات وارد ہوتے ہیں. حل التشکیکات تصنیف کی۔ ۱۳۹ صفحات کی اس عربی کتاب کا نایاب نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ کتاب کا سال تصنیف ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء ہے[1] موری دروازہ میں پنجہ شریف میں قبر ہے[2]

حکیم گلزار علی

حکیم گلزار علی دہلوی طب میں اپنے فضل و کمال کی وجہ سے امتیاز رکھتے تھے۔ ایک عرصہ تک شاہ عالم کے دربار سے وابستہ رہے۔ آخر میں اجمیر میں سکونت اختیار کی۔ ۹۸ برس سے متجاوز ہونے کے باوجود انہیں کسی سہارہ کی ضرورت نہیں تھی۔ اور اس عمر میں بھی ۸ ورق روزانہ لکھتے تھے اور پیدل مریضوں کو دیکھنے جاتے تھے۔ نوجوانوں کی طرح کھانا کھاتے تھے اور مباشرت کرتے تھے۔ اجمیر میں ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء میں فوت ہوئے[3]

حکیم محسن

حکیم محسن کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ یہ خود دہلی میں پیدا ہوئے۔ علم کلام، طب، تاریخ انشا، موسیقی اور خطاطی میں امتیاز رکھتے تھے۔ نواب فیض اللہ (۱۷۹۴ء - ۱۷۷۴ء) کے عہد میں رامپور گئے، اور نواب احمد علی خاں کے عہد تک وہاں رہے، پھر دہلی

---

[1] قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین ص ۱۶۷

[2] مشاہیر الاطبا نمبر دہلی ص ۴

[3] نزہتہ الخواطر جلد ۷، ص ۴۰۱ بحوالہ روزنامہ عبدالقادر

واپس آئے اور مستقل اقامت اختیار کی۔[1]

حکیم میر قدرت اللہ خاں قاسم

سید ابوالقاسم عرف میر قدرت اللہ قادری قاسم دہلی کے قدیم باشندہ اور مشہور لوگوں میں تھے۔ معقول و منقول میں مولانا فخر الدین اور خواجہ احمد جان سے تلمذ تھا۔ طب کی تعلیم دہلی کے اساتذہ باکمال سے حاصل کی تھی۔ بزرگوں کا پیشہ درس و تدریس اور پیری مریدی تھا۔ قاسم نے اس کو ترک کر کے طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ انہوں نے کسی سرکار میں ملازمت قبول نہیں کی۔ مطب کرتے تھے اور طبابت ذریعہ معاش تھی۔ کریم الدین نے لکھا ہے کہ "علم طب خوب ان کو آتا تھا" بیماروں کا علاج کرتے تھے۔[2]

صاحب گلستان سخن نے انہیں حکیم کامل، طبیب فاضل، زبدہ کملائے دوراں اسوہ فضلائے زماں لکھا ہے۔ اس کے مطابق شعر نے اس کی ذات سے رتبہ حکمت لیا اور مجاز نے مرتبہ حقیقت، جالینوس اس کی شاگردی سے صاحب دانش و دید اور بقراط اس کے تلامذہ کے سلک میں ادنیٰ مستفید۔[3] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت اچھے طبیب تھے۔ ان کی زندگی بے انقلاب تھی جو طبابت اور شعر کی خدمت میں خاموشی کے ساتھ بسر ہو گئی۔

قاسم شاعری میں ہدایت اللہ خاں ہدایت کے شاگرد اور چشتی سلسلہ کے بزرگ مولانا فخر الدین کے مرید تھے۔[4] اپنے شیخ سے بڑا اعتقاد تھا اور ان کی خدمت

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۱۰۸

[2] طبقات شعرائے ہند ص ۳۱۹

[3] گلستان سخن ص ۳۹۶

[4] سخن شعرا ص ۳۷۹ ایک روایت کے مطابق سید احمد بن محمد کے سلسلہ میں داخل تھے۔ علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۶۳/ ۱۲۸

میں حاضر رہتے تھے[1]

ابتدا شعور سے شعر گوئی کا شوق تھا، مشاعروں میں ضرور حاضر رہتے۔ امیر الامرا نجیب الدولہ کے عہد میں میر محمدی اشرف کے ہاں دہلی میں محفل مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی۔ حکیم صاحب ان ایام میں محض مبتدی فن تھے لیکن مشاعرہ میں ضرور شامل ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں مصحفی دہلی میں مقیم تھے اور اپنے گھر مشاعرہ منعقد کراتے تھے حکیم صاحب ان مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے[2] مشاعروں میں حکیم انشا اللہ خاں انشا سے قاسم اور مرزا عظیم بیگ عظیم کا بگاڑ ہوا۔ انشا کی شوخ اور ہنگامہ زا طبیعت ادھر عظیم کی خود بینی اور بد دماغی اس ادبی معرکہ کی ذمہ دار ہے عظیم کی رفاقت کی بنا پر قاسم کو اس معرکہ میں حصہ لینا پڑا۔ مرزا ابنڈھو کے مشاعرہ میں قطعات فخریہ سے گزر کر میدان جنگ کی صورت اختیار کرنے والی تھی۔ جب حکیم قاسم کے سامنے شمع لائی گئی تو انہوں نے انشا سے خطاب کر کے کہا، عم زاد آپ کی سرکار سے ہمیں مسیلمۂ کذاب کا خطاب عطا ہوا ہے۔ اب ذرا ہمارے ألفیل مالفیل پر بھی کان دھریے۔ صاحب مشاعرہ کو گمان گزرا کہ اب کوئی رکیک ہجو پڑھی جانے والی ہے۔ ادھر سے یہ اور ادھر سے محب علی محبؔ اٹھے اور کوشش کر کے فریقین میں صلح کرا دی۔ دونوں طرف شرفا تھے۔ مان گئے۔ اس پرخاشِ شاعرانہ کی یادگار مرزا عظیم کا وہ مشہور مخمس ہے جس کا ایک شعر ضرب المثل بن چکا ہے[3]

شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق ۔۔۔ وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

شاہ نصیر اور حکیم قاسم سے ایک خاص معاملہ یہ درمیان میں آیا کہ ایک دفعہ مشاعرہ میں طرح ہوئی یار شتاب اور تلوار شتاب، شاہ نصیر نے جو غزل کہہ کر پڑھی تو اس

---

[1] گلشن بے خار ص ۱۵۷

[2] مجموعہ نغز دیباچہ مرتب ص ل ا

[3] تذکرہ انشا جلد ا ص ۸۲ و ۸۶

میں قطعہ تھا کہ سے

رخ انور کا ترے وصف لکھا جب ہم نے — انوری نے دیا دیوان الٹ اے یار شتاب
پھر پڑھا ہم نے جو مضمون بیاض گردن — سن اسے ہو گیا چپ قاسم انوار شتاب

حکیم صاحب خاص و عام میں واجب التعظیم تھے۔ اس کے علاوہ فضیلت علمی کے ساتھ شعر کے مشاق تھے اور فقط موزونی طبع اور زور کلام کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ چونکہ قاسم تخلص کرتے تھے اس لیے قاسم انوار کا لفظ ناگوار ہوا۔ چنانچہ دوسرے مشاعرہ کی غزل میں قطعہ کہا [1]

واسطے انسان کے انسانیت اول شرط ہے — میر ہو یا مرزا ہو خاں ہو یا نواب ہو
آدمی تو کیا خدا کو بھی نہ ہم سجدہ کریں — گر نہ خم تعظیم کو پہلے سر محراب ہو

حکیم قاسم کے تذکرہ مجموعہ نغز کے دیباچہ میں محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ زمانہ اگرچہ مشغلہ شعر کے خلاف تھا اور سیاسیات کے مطلع پر فتنہ و آشوب کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ احمد شاہ ابدالی کی آمد اور بعد کے سیاسی واقعات نے مغلیہ سلطنت کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا ہے۔ دہلی ویران ہو رہی ہے اور اس کے فرزند تلاش معاش میں دربدر اور خاک بسر پریشان پھرتے ہیں لیکن راجا سے پرجا تک جس کو دیکھو شوق شعر میں ڈوبا ہوا ہے۔[2]

شاعری کے مراکز اگرچہ اور بھی تھے لیکن سب سے زیادہ طاقتور مرکز دہلی تھا۔ مشاعرے کثرت سے ہوتے تھے۔ مثلاً نواب یار محمد خاں فرزند علی محمد خاں کے ہاں مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ معین الملک عرف مرزا مینڈھو فرزند وزیر الممالک شجاع الدولہ کے ہاں بھی بزم مشاعرہ قایم تھی۔ مرزا اسد بیگ رفیق شاگرد حکیم ثناء اللہ فراق اور میر سجاد اکبر آبادی کے مکان پر بھی مشاعرہ ہوتا تھا۔ شنکر ناتھ جیا، بہادر بیگ خاں

---

[1] آب حیات ص ۲۹۲ و ۲۹۳

[2] دیباچہ مجموعہ نغز ص لم

غالب، حمید الرحمٰن عرف میاں جان انیس، عظیم الدین خاں آشفتہ، میر سجاد سجاد، میری محمدی شرف، مولوی قدرت اللہ کے ہاں بھی مشاعرے انعقاد پاتے تھے[1] مہدی علی خاں عاشق کے ہاں بلا ناغہ جمعہ کے روز مشاعرہ ہوتا تھا[2]

قاسم کے شاگردوں میں احسن اللہ احسن دہلوی (طبقات شعراء ہند ص ۲۲۲ سخن شعرا صفحہ ۱۴) حافظ غلام اشرف اشرف دہلوی بلنفات صفحہ ۴۵۳ سخن شعرا ص ۲۸) غفور بیگ افسوس (یہ فراق کے بھی شاگرد تھے۔ سخن شعرا صفحہ ۳۹) حکیم سید محمد تعشق دہلوی (شاگرد و عزیز قدرت اللہ قاسم۔ بعض نے انہیں قاسم کے بیٹے حکیم عزت اللہ عشق کا شاگرد لکھا ہے سخن شعرا صفحہ ۸۹) محمد حفیظ حفیظ (گلشن بے خار صفحہ ۱۱ گلستان سخن صفحہ ۲۷ سخن شعرا صفحہ ۱۳۵) غلام محمد راقم دہلوی (سخن شعرا صفحہ ۱۷۹) خواجہ احسن اللہ خاں بیان، غلام محمد ہفت قلم، مظہر علی خاں شفیق، نیاز احمد نیاز (مجموعہ نغز) حکیم مرزا محمد عشق دہلوی (گلشن بے خار صفحہ ۱۰۹) میر محمدی مائل (گلستان بے خزاں ص ۲۰۳) حکیم بو علی خاں، ان کے بیٹے مرزا غلام حسین صبر (گلشن بے خار صفحہ ۱۲۶) قاضی احمد علی حب (عمدہ منتخبہ صفحہ ۲۳۲) حکیم احمد علی خاں یکتا دہلوی (گلستان سخن صفحہ ۴۸۴ سخن شعرا صفحہ ۵۷۰) ہیں۔

حکیم صاحب کی درج ذیل تصانیف ہیں۔

۱۔ دیوان۔ اس میں سات ہزار اشعار ہیں۔

۲۔ معراج نامہ۔ اس کے ابیات کی تعداد ساڑھے تین ہزار ہے۔

۳۔ مثنوی کرامات پیران پیر۔ شیخ عبد القادر جیلانی کے حالات میں ہے، اس میں پانچ ہزار دو سو اشعار ہیں، ذخیرہ حبیب گنج مولانا آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے۔

---

[1] دیباچہ مجموعہ نغز ص م

[2] ″ ″ ص ۲۹

۴۔ مجموعہ نغز۔ ان کا اصل کارنامہ جس کی بنا پر انہیں فارسی اور اردو ادبیات کی تاریخ میں ایک ممتاز جگہ حاصل ہوئی ہے وہ ان کی فارسی تالیف مجموعہ نغز ہے یہ ۶۹۳ اردو شعرا کے حالات میں ہے۔ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء اس کی تاریخ اختتام ہے مجموعہ نغز تاریخی نام ہے۔ حکیم ثناء اللہ فراق نے "مجموعہ انتخاب" اور دوسرے "باغ گل معنی" سے تاریخ نکالی ہے۔

یہ بہت تعجب کی بات ہے کہ قدرت اللہ قاسم کے کسی تذکرہ نگار نے نہ طب میں ان کے استاد کا نام بتایا ہے اور نہ ان کی کسی طبی تصنیف کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ان تذکروں سے ریاست بلم گڑھ سے ان سے وابستگی کا بھی پتہ نہیں چلتا ہے۔ حکیم قدرت اللہ کی شعری و ادبی خدمات اور ان کے درج بالا تصنیفی کاموں کے علاوہ ان کے مطالعہ میں بہت اہم بات یہ ہے کہ وہ طب میں حکیم شریف خاں دہلوی کے شاگرد تھے۔ بحیثیت طبیب ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ انہوں نے ریاست بلم گڑھ (فرید آباد) میں طبی خدمات انجام دیں اور وہاں کے علم پرور فرمانروا راجہ اجیت سنگھ بن چودھری بشن سنگھ بن راؤ بلرام) کی حسب فرمایش حکیم اکبر ارزانی کی کتاب حدود الامراض کی فصول الاعراض کے نام سے شرح کی۔ اس میں نہ صرف تشریح کا حق ادا کیا گیا ہے بلکہ مؤلف نے بعض مقامات میں جہاں اسباب، علامات اور وجہ تسمیہ امراض سے اعراض اختیار کیا تھا اسے بھی بر سبیل اجمال تحریر کیا ہے۔ تاریخ تالیف ۱۱۹۳ھ ۱۷۷۹ء اس شعر سے برآمد ہوتی ہے۔

شد نام بدی چو خارج از وی گفتا   ہاتف تاریخ او فصول الاعراض

راقم الحروف کے ذخیرہ میں اس کا نسخہ محفوظ ہے[۱]

دوسری کتاب مفتنت الجربن ہے۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ فصول الاعراض سے جب فراغت ہوئی تو راجہ اجیت سنگھ نے کہا کہ وہ ایک

---

[۱] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۶۳/۱۲۸

عرصہ سے گردہ کی پتھری میں مبتلا ہیں اور اکثر شکار اور سیر و تفریح میں باہر رہنا ہوتا ہے۔ اگر سنگ گردہ و مثانہ پر ایک کتاب تصنیف کی جائے تو وہ اسے بطور زاد راہ اپنے ساتھ رکھیں گے۔ چنانچہ ان کے حسب الحکم یہ کتاب تالیف ہوئی۔ اس کا سال تالیف ۱۲۰۵ھ/۹۰-۱۷۸۹ء ہے۔ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں اس کا مخطوطہ موجود ہے[1]۔ بلبلی خانہ میں حکیم قدرت اللہ کی یادگار مسجد ہے اسی کے نزدیک چھتہ موم گران میں حکیم صاحب کا دیوان خانہ اور مطب تھا اس کے دروازہ پر "دار الشفائی مادر ماں یقینی نہاد" کندہ تھا، اور شاہ غلام علی کی خانقاہ کے قریب حکیم قدرت اللہ خاں اور حکیم عزت اللہ خاں کی حویلی تھی[2]۔

حکیم صاحب کی شادی مولوی نور احمد ممتاز کی دختر سے ہوئی تھی۔ مولوی نور احمد شاہ عالم ثانی کے ایام شہزادگی میں استاد تھے۔ حکیم میر عزت اللہ عشق قاسم کے صاحبزادہ ہیں۔ حکیم قاسم نے طویل عمر پا کر ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء میں انتقال کیا[3]۔ حکیم عبد الحی حسنی نے محبوب الالباب کے حوالہ سے ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء تاریخ وفات لکھی ہے[4]۔

حکیم عبد الحی نعمت

سکندرہ باد کے رہنے والے تھے۔ لیکن مستقل طور پر دہلی میں رہے، ہندو تھے مسلمان ہو گئے تھے، بہت عابد مرتاض تھے، شاہ عبد العزیز کی خدمت میں رہتے تھے۔ نعمت تخلص تھا اور شاعری سے ذوق رکھتے تھے۔ ذکا نے ان کا نام نعمت اللہ

---

[1] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۲۷/ ۱۲۸

[2] سیر المنازل ص ۲۶ و ۲۷

[3] طبقات شعرائے ہند ص ۳۱۹ سخن شعرا ص ۳۷۹

[4] نزہتہ الخواطر جلد ۷، ص ۳۸۷

لکھا ہے[۱]

حکیم میر باقر علی جعفری

میر نظام الدین ممنون کے برادر حقیقی تھے۔ علوم رسمی میں دستگاہ معقول اور صناعت طب میں مہارت تام تھی۔ سفر حج سے واپسی پر وفات ہوئی[۲]

حکیم خلیفہ غلام محمد راقم

دہلی کے رہنے والے تھے۔ ابتدا میں کچھ دنوں کے لیے لکھنؤ گئے[۳] لکھنو جانے سے پیشتر حکیم قدرت اللہ قاسم سے عربی، فارسی اور انشا سیکھی، شرح شمسیہ اور حاشیہ میر پڑھا تھا۔ شعر کی اصلاح بھی ان سے لیتے تھے۔ لکھنو سے پھر واپس دہلی آئے، حکیم مرزا عشق سے اکتساب فن طب شروع کیا۔ شیریں گفتار تھے، کتب فارسی و انشا پردازی میں مہارت اور علوم عربی سے بہرہ رکھتے تھے[۴] معلم پیشہ تھے، طب میں دخل تھا، خوشنویسی میں فرد سمجھے جاتے تھے۔ فارسی شعر کا زیادہ اور اردو کا کمتر شوق تھا[۵]

نستعلیق، شکستہ، ریحان وغیرہ ساتوں خطوں میں کمال حاصل تھا، ہفت قلم کہلاتے

---

[۱] سخن شعرا ص ۱۷۶

[۲] گلستان سخن ۱۸۶

[۳] یادگار شعرا ص ۸۱

[۴] طبقات شعرائے ہند ص ۲۶۰

[۵] خمخانہ جاوید جلد ۳ ص ۳۵۴

اکبر شاہ ثانی کے خوشنویسوں کے زمرہ میں شامل تھے۔ خوش نویسی کے سلسلہ میں ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے خوش نویسوں کا تذکرہ لکھ کر ان کی تاریخ محفوظ کر دی۔ اس میں انہوں نے ایسے خوش نویسوں کے حالات لکھے ہیں، جن کی قلم کاری کے نمونے انہوں نے خود دیکھے تھے۔ اپنے زمانہ کے اکثر خوشنویسوں سے ملے تھے۔ یہ تذکرہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے چھپا ہے۔

آخر عمر میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء میں فوت ہوتے [۱]

حکیم اکرام الدین یاسؔ

دہلی میں قیام رہا[۲]۔ باطن کے مطابق مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور سامعین کو شادکام کرتے تھے[۳]

حکیم واصل خاں ثانیؔ

خاندان شریفی کے جن بزرگوں کو غیر معمولی اثر و اقتدار حاصل ہوا۔ ان میں حکیم عادل خاں کے صاحبزادہ حکیم واصل خاں ثانی تھے۔ ۱۸۰۰ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانہ میں دہلی سے جے پور گئے۔ اور حضوری طبیب مقرر ہوتے۔ ۱۸۰۱ء سے دو روپیہ یومیہ قرار پائے۔ طبی خدمات کے علاوہ یہ داروغہ خبر داروغہ دواخانہ خاص حضوری اور داروغہ مطبخ کے مناصب پر بھی فائز رہے۔ رفتہ رفتہ پچاس ہزار روپیہ سالانہ کی

---

[۱] دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۸۳

[۲] یادگار شعرا ص ۱۸۹

[۳] گلستان بے خزاں ص ۲۸۷

جاگیر اور تیس روپیہ روزانہ نقد اور ایک روپیہ یومیہ کا نسہ مقرر ہوا۔ اس کے علاوہ عہدوں کی تنخواہ جداگانہ پاتے رہے۔ جاگیر کے تیرہ گاؤں تھے جن میں دس تنخواہ کے اور تین انعامی دیہات تھے۔ یہ جاگیریں مہاراجہ پرتاپ سنگھ اور ان کے جانشین مہاراجہ جگت سنگھ اور مہاراجہ رام سنگھ نے اپنے اپنے دور میں عطا کی تھیں۔

حکیم صاحب کا قیام اگرچہ جے پور میں رہا لیکن شاہان دہلی کی بارگاہ میں عرایض و تحایف اور اسی طرح جوابی شقوں کے اعزاز کا سلسلہ رہا۔ ریاست جے پور کی متعدد سیاسی و سرکاری مہمات حکیم صاحب کے ذریعہ انجام پائیں۔ اور نازک موقعوں پر ان کی خدمات سے ریاست کو فایدہ پہنچا، ۸۲ برس کی عمر میں ۱۸۳۵ء میں انتقال ہوا۔ جے پور میں باغ قدم شریف (بیرون سانگانیری دروازہ) میں آخری آرام گاہ ہے[1] ان کے نواسہ حکیم محمد عظیم خاں جانشین مقرر ہوئے جن کے بیٹے حکیم سلیم خاں تھے۔ غالب نے حکیم سلیم خاں کی کتاب تکثیف الحکمت کا قطعہ تاریخ کہا تھا اس میں حکیم واصل خاں کا نام بھی نظم کیا ہے ؎

سلیم خاں کہ وہ ہے نور چشم واصل خاں ۔۔۔ حکیم حاذق و دانا ہے وہ لطیف کلام

حکیم محمد سلیم خاں خستہ جے پور کے تعظیمی سرداروں میں تھے۔ حاذق طبیب اور متعدد کتابوں کے مصنف۔ انہوں نے ۱۸۶۶ یا ۱۸۶۵ء میں وہاں سے ہفت وار اخبار نیر بھی نکالا تھا۔

حکیم ذکاءاللہ خاں

حکیم ذکاءاللہ خاں نہ صرف خاندان بقائی بلکہ ہندوستان کی طبی تاریخ کے لیے مایہ صد افتخار ہیں۔ حاذق الملک کا خطاب تھا۔ حذاقت اور معجز نما علاج کے

---

[1] تذکرۃ الخواجگان ص ۵،

علاوہ دہلی میں استاد طب کی حیثیت سے ان کی بڑی شہرت ہوئی۔ ان کے دامن فیض سے بکثرت لوگوں نے استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ میں احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں اور دوسرے نامور اطبا شامل ہیں۔ ان کی غیر معمولی شہرت کی وجہ سے ان کے خاندان کو بعض لوگوں نے خانوادہ ذکائی کا نام دیا ہے، اور اسے خاندان بقائی سے الگ دوسرا خاندان سمجھا ہے۔ چنانچہ حکیم بدرالدین خاں کے حالات تحریر کرتے ہوئے ان کے شاگرد حکیم مرزا محمد بیگ نے اسحٰق خانی اور ذکاء اللہ خانی کو ایک اور بقاخانی کو دوسرا خاندان بنایا ہے۔[1]

حکیم ذکاء اللہ خاں کی کتاب قرابادین ذکائی طب کے قرابادینی ذخیرہ کی اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے والد اور دادا کے نسخہ ہائے مجربہ جو ضخیم قرابادین (بقائی) اور متفرق بیاضوں میں پھیلے ہوئے تھے، جمع کئے ہیں۔[2] اس کا اصل نام ملتقط ذکائیہ منتخب از مجموعہ بقائیہ ہے، یہ کتاب ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء میں مطبع رای بھوانی پرشاد دہلی سے طبع ہوئی تھی۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ نول کشور پریس لکھنؤ سے ۱۹۰۷ء تک اس کی چھ اشاعتیں نکل چکی تھیں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔[3] حکیم حسام الدین، حکیم اسد علی اور حکیم نورالدین ان کی یادگار رہے۔ مرزا سنگین بیگ نے کٹرہ شیخ چاند میں واقع کوچہ سموسہ میں جس کا دوسرا راستہ فراش خانہ کی طرف نکل جاتا ہے، حکیم ذکاء اللہ خاں کے مکان کا ذکر کیا ہے۔[4]

---

[1] امتحان الالبا لکافۃ الاطبا ص ۲۱۹

[2] قرابادین ذکائی ص ۲

[3] دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۱۱۷

[4] سیر المنازل ص ۲۱

حکیم صادق علی خاں

۱۱۸۴ھ/۱۷۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ حکیم شریف خاں کے تیسرے صاحبزادہ تھے۔ طب کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور ان کی حیات ہی میں ممتاز ہوئے۔ حکیم شریف خاں کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۳۸ برس ہو چکی تھی۔ انہوں نے خاندانی روایات کو بڑی ہوشمندی اور دانشوری کے ساتھ برقرار رکھا[1] حکیم شریف خاں کے بعد انگریزوں نے ان کی جاگیر ضبط کر کے ان کے بیٹوں کی پنشن مقرر کر دی تھی۔ البتہ تین گاؤں جو حکیم شریف خاں نے غربا و مساکین کے لیے وقف کئے تھے ضبط ہونے سے بچ گئے تھے[2]۔

۸۰ برس زندہ رہ کر ۲۹ صفر ۱۲۶۴ھ/۵ فروری ۱۸۴۸ء کو انتقال ہوا[3]، درگاہ سید حسن رسول نما میں دفن ہوئے۔ مرزا سہراب بیگ نے قطعہ تاریخ وفات کہا ؎

وحید عصر فلاطون زماں ارسطو فکر	بعلم و فضل در آفاق آنکہ فایق بود
طبیب ابن طبیب و شریف ابن شریف	حکیم کامل و ہم کاشف حقایق بود
چو رخصت ہستی خود ازیں جہان فانی بست	کہ او بہشت بریں را ہمیشہ شایق بود
چناں رقم زدہ سہراب مصرعہ تاریخ	طبیب صادق و عالم حکیم صادق بود ۱۲۶۴

۳۰ مارچ ۱۸۴۸ کے روزنامچہ کے مطابق "بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ حکیم صادق علی خاں جو شہر کے نامی گرامی طبیبوں میں سے تھے رحلت کر گئے"[4] یہ غالباً ۳ مارچ ہے اس لیے

---

[1] حکیم اجمل خاں ص ۱۱۹

[2] سیرت اجمل ص ۴

[3] قانون ابن سینا اور اس کے شارحین ص ۱۷۹

[4] ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ ص ۲۴۹

کہ اس کے بعد ۱۰ مارچ کا روزنامچہ نخر بر ہے۔

سرسید نے ان کی زندگی ہی میں ان کے بارے میں لکھا تھا "حکیم حذاقت منش، طبیب عیسوی روش، سرگروہ کملائے زماں۔ آج اس کمالات ظاہری و باطنی کا جامع عرصہ روزگار میں جلوہ گرہ نہیں۔ علم عمل کے ساتھ اس بزرگ بلند فطرت کی ذات میں جمع ہے، ان کے والد ماجد اپنے عصر میں سرآمد حکما اور سرحلقۂ اطبا تھے۔ آج تک ان کے کمالات کا شہرہ گنبد دوار میں از بس بلند ہے۔ جالینوس وارسطو کا غلغلہ ان کے سامنے ایسا ہے جیسا طوطی کی آواز نقارہ خانہ میں۔ اور فی الحقیقت اس روزگار کے اکثر اطبائے نامی انہی کی نسبت شاگردی سے سرمایہ اعتبار رکھتے ہیں، جو کہ اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں۔ حضرت ممدوح بھی اپنے زمانہ میں یکتا اور بے مثل ہیں، نہ ان کے علم کی صفت زبان قلم پر آ سکتی ہے اور نہ ان کے عمل کی تعریف اندیشہ میں سما سکتی ہے سارے زمانہ کے کملا کو جس کے خاندان کی نسبت شاگردی سے فخر ہو اس کی تعریف اسی قدر کافی ہے"[1]

حکیم صادق علی خاں کے انتقال کے بعد ذاتی پنشن ضبط کر لی گئی تھی اور بعد میں چار لیکن کلکٹر میرٹھ نے جاگیر بھی ضبط کر لی۔ پسماندگان نے نصف جمع بندوبست کے لیے سرکار انگریزی سے بہت کچھ استدعا کی لیکن بحال نہیں کی گئی۔

حکیم جمیل خاں نے لکھا ہے کہ ان کی تصانیف میں زاد غریب، طریق تعلیم طفلان، رسالہ خواص ادویہ واغذیہ، شرح معالجات قانونچہ (ناتمام) شرح تشریح اعضائے مرکبہ (ناتمام: تالیف ۱۲۳۷ھ/۱۸۶۱ء) کے علاوہ ایک کتاب کلیات پر ہے۔ تقویت العقاید کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی ہے یہ شاہ اسمٰعیل شہید کی مشہور کتاب تقویت الایمان کا جواب ہے، صرف و نحو میں بھی متفرق رسایل ان کی یادگار ہیں[2] مثلاً منزہ

---

[1] آثار الصنادید ص ۱۱۵ و ۱۲۶

[2] بسرت اجمل ص ۴

کی تعداد کثیر تھی۔[1]

حکیم منور خاں

حکیم محمد اشرف خاں کے بیٹے، حکیم شریف خاں کے پوتے، عالی قدر طبیب سادہ وضع اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، شاندار مطب تھا، بڑی املاک بازار کھاری باؤلی اور پھاٹک حبش خاں میں تھیں، شاہانہ زندگی گزارتے تھے، ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء میں بعمر ۵۸ برس انتقال کیا، چھ بیٹے حکیم عبدالحی خاں، حکیم عبدالاحد خاں، حکیم عبدالصمد خاں حکیم عبدالرحمٰن خاں حکیم عبدالکریم خاں اور حکیم عبدالقادر خاں تھے، بڑی بیٹی کی شادی حکیم امام علی خاں اور چھوٹی بیٹی کی شادی حکیم مہر علی خاں گوالیار سے ہوئی تھی۔[2]

حکیم غلام حیدر خاں

حکیم غلام حیدر ابن حکیم نامدار خاں نے درسیات میں شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر سے برسوں استفادہ کیا۔ اور فیوض وبرکات حاصل کئے طب میں حکیم شریف خاں کے ارشد تلامذہ میں تھے[3] طب کے درس میں یکتا سمجھے جاتے تھے اور طبی کتابوں کے مشکل مقامات آسانی سے حل کرتے تھے، ہاتھ میں شفا تھی، سرسید کو ان سے نسبت شاگردی حاصل ہے[4]۔ حکیم مومن خاں نے ایک قطعہ میں جو

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۲۱۶

[2] تذکرۃ الخواجگان ص ۹۱

[3] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۴۰۶

[4] آثار الصنادید ص ۵۱۳ نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۳۵۴

اشعار کہے ہیں ان سے چچا کی فنی عظمت آشکار ہے۔

عم بزرگوار کہ، ہیں عیسٰی زماں　　نسخے کا جن کے معجزے سے مشکل انبا نہ
سقراط زہر خوردہ کا گر چارہ وہ کریں　　عمر خضر سے ہو نفس واپسیں دراز
وہ سب ہی جس کی فطرت عالی کے ہیں مقر　　وہ جس کی رائے خیل طبیباں میں سرفراز

حکیم غلام حسن خاں

حکیم غلام حیدر خاں کے برادر خرد تھے۔ کتب طبیہ میں مہارت تام اور علاج معالجہ میں دستگاہ رکھتے تھے۔ درسیات کی تکمیل شاہ عبدالقادر اور طب کی تکمیل حکیم شریف خاں سے کی تھی۔ ۱۸۴۷ سے چند برس قبل فوت ہوئے[1] درس و افادہ میں شہرت حاصل تھی، طب کے اساتذہ میں شمار تھا، بڑی تعداد میں لوگ ان سے مستفید ہوئے[2] حکیم محمد یوسف خاں اور حکیم عبدالحکیم معروف بہ آبو خاں دو بیٹے تھے، حکیم محمد یوسف کتب درسیہ سے فارغ اور فن طب میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ اپنے والد اور چچا سے طب کی کتابیں پڑھی تھیں[3] کمال فن کے باوجود پسندیدہ اخلاق میں یگانہ تھے۔ حکیم عبدالحکیم نے کتب درسیہ آخون شیر محمد قندھاری سے پڑھی تھیں اور طب کی تعلیم اپنے والد اور چچا سے حاصل کی تھی۔ معالجہ میں اکثر معاصرین پر فائق تھے، ظاہری اور باطنی کمالات کے ساتھ وسیع الاخلاق تھے۔ سرسید کے مطابق دست شفا ایسا تھا کہ جن مریضوں کے علاج سے مسیحا بھی عاجز ہو وہ ان سے ٹھیک ہوتے تھے[4] درس و افادہ کا سلسلہ تھا[5]

---

[1] آثار الصنادید ص ۵۱۵

[2] نزہۃ الخواطر جلد ۷، ص ۳۴۹

[3] ایضاً ص ۵۳۶

[4] آثار الصنادید ص ۵۱۶　　[5] نزہۃ الخواطر جلد ۷، ص ۲۴۶

حکیم غلام نبی خاں

حکیم غلام حیدر کے بھائی اور پایہ کے طبیب تھے. کوچہ چیلان میں ان کا مطب تھا اور وہ پابندی سے مطب کرتے تھے. ان کے مطب کے قریب شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ تھا. شاہ صاحب کے اثر کی وجہ سے وہ بڑے مذہبی اور دیندار تھے. ۱۲۴۱ھ/۲۵-۱۸۲۶ء میں وفات پائی. ان کے صاحبزادہ مومن نے فارسی اور اردو دونوں میں قطعات تاریخ کہے ؎

بہ من الہام گشت سال وفات	کہ غلام نبی بہ حق پیوست
جنازہ اٹھایا فرشتوں نے آہ	تو قد فاز فوزا عظیما کہا

حکیم ثناء اللہ فراق

دہلی کے نامور طبیب اور شاعر تھے. ان کے خاندان میں طب اور شاعری کی روایت قایم رہی. شہر کے مختلف اساتذہ سے طب کی تحصیل کی اور طبابت میں تام پیدا کیا[1] شیفتہ نے بھی طب میں ان کی "شایستہ مہارت" کی تعریف کی ہے[2] اور عشقی اور مصحفی نے دلی میں ان کے مطب کرنے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے[3] باطن نے ہی الفاظ و اصطلاحات میں ان کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے، "وہ عالم علم طب، شعر کیا ہے فنون طب ہے، نسخہ تپ غب ہے. گرم ہر دفتر اشعار ہے جس سے نکلنا دل کا بخار ہے"

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۱۶۵
[2] گلشن بے خار ص ۱۴۹
[3] یادگار شعرا ص ۱۳۲

مخالطب صفت کرنے سے دق ہے، چڑھتی تپ محرق ہے، اخلاط کا احتراق ہے، دل ان کا جلنے پر مشتاق ہے۔ حرارت قلب سے قشعریرہ ہے، ندامت سے بوں اندام نیرہ ہے، نبض قلم ممتلی ہے تو تنقیہ مزاج سخن کی ترکیب بھلی ہے۔ رنگ مضمون آبدار ہے گویا عرق بہار ہے۔ صفحہ کاغذ قرابادین شفائی ہے، جس میں ہر مرض کی دوائی ہے[1]"

قادر بخش صابر نے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے،، فراق تخلص حکیم جالینوس فطرت طبیب بقراط فطنت، خادم فقرائے باب اللہ، مخدوم کملائے دانش دستگاہ، منکی ارانک قصور جتاں حکیم ثنا اللہ خاں۔ اس بزرگ نہاد کو ارباب فہم درست و اصحاب عقل سلیم نے ثقات شعرا اور اساتذہ فن سے قرار دیا ہے۔ حق یہ ہے کہ سخن کو طرز نو بخشی اور معنی کو بلندی تازہ عطا کی۔ شعرار نامی کے ساتھ ہمیشہ مطارحہ کرتا اور صحبت شعر میں ارباب علم کا مشار الیہ اور اہل کمال کا ممدوح رہا۔ سخنوری تو اس نقدس نہاد کا ادنی وصف ہے۔ دقایق علوم اور غوامض فہوم اس جناب کی دقت فہم سے ایسی کشایش پاتے، جیسے غنچہ نسیم راحت انگیز سے اور عقدہ مالا ینحل اس حلال مشکلات سے اس طرح حل ہوتا جیسے ارزیز آتش تیز سے۔ صاحب دیوان اور انواع سخن پر قادر اور اصناف کلام پر مقتدر تھے[2]

فراق خوش فکر و شیریں گفتار شاعر تھے انہیں مشاہیر شعرا سے استفادہ کا موقع ملا ان کے اساتذہ سخن میں ان کے چچا ہدایت اللہ ہدایت کے علاوہ سودا اور درد بھی شامل ہیں۔ درد سے کسب سخن کے ساتھ کسب باطن بھی کیا تھا[3] شیفتہ اور باطن نے بھی انہیں درد کا مرید لکھا ہے[4]

---

[1] گلستان بے خزاں ص ۱۸۲

[2] گلستان سخن ص ۳۸۵

[3] طبقات شعرائے ہند ص ۱۸۰

[4] گلشن بے خار ص ۱۴۱ ۲ گلستان بے خزاں ص ۲۸۳

فراق کے چچا ہدایت خواجہ میر درد کے شاگرد تھے[1] انہوں نے ایک دیوان اور مثنوی لکھی ہے جس میں بنارس کا بیان ہے (علی ابراہیم) مصحفی نے ان کی عمر سو برس سے زیادہ لکھی ہے۔ ۱۲۱۹ھ ۱۸۰۴ء میں انتقال ہوا، (ذکا و سرور) سخن شعرا[2] اور گلشن بے خار میں تاریخ انتقال ۱۲۱۵ھ درج ہے۔ دلی کے اکثر شعرا ہدایت کے شاگرد تھے۔ تقریباً نو ہزار اشعار کا دیوان چھوڑا۔ نیز کچھ مثنویاں اور ایک رسالہ مسمیٰ بہ چراغ ہدایت (قاسم)[3] ہدایت کے لیے میر حسن نے "شمع انجمن فصاحت و بلاغت، شاعر دل پذیر، سخن سنج بے نظیر، عالی طبع" جیسے تعریفی الفاظ لکھے ہیں[4]۔

حکیم ثناءاللہ فراق کے ہاں مشاعرہ کی محفلیں بھی سجتی تھیں، مصحفی اس میں شریک ہوتے تھے۔ انہوں نے مرزا محمد ہاتف کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ثناءاللہ فراق کے مشاعرہ میں آیا کرتے تھے[5] اس مشاعرہ کے متعلق مصحفی نے وضاحت کی ہے کہ یہ مشاعرہ پسر راجہ رام ناتھ کے ہاں ہوتا تھا، اور اس کی بنا کے محرک ثناءاللہ فراق تھے۔[6]

حکیم صاحب صلاح و تقویٰ و ورع اور لوگوں سے ارتباط، یک جہتی اور حسن خلق میں مشہور تھے فن طبابت میں بڑا دخل تھا، ان کے اشعار سکنہ شہر دلی کی زبان پر جاری تھے۔ طرز بندی و صاف گوئی میں استاد وقت تھے، بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا ہے اور اصلاح شعر لی ہے۔ سرور نے ان سے اپنے تعلقات کا ذکر

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۳۳

[2] سخن شعرا ص ۵۶۰

[3] یادگار شعرا ص ۱۸۶

[4] تذکرہ شعرائے اردو ص ۲۰۴

[5] یادگار شعرا ص ۱۸۵

[6] تذکرہ ہند ص ۲۷۹

کیا ہے[1] فراق نے سرور کی عمدہ منتخبہ کی تاریخ اس شعر سے نکالی تھی ؎

جو گوش دل میں کہا باغبان قدرت نے کہ ہے یہ بحر چمن کا سفینہ اعظم

قاسم نے انہیں "شیریں زبان، ملاحت بیان، فصاحت قرین بلاغت آئین، معنی ورع و تقوی، صاحب انداز شریف، مالک طرز لطیف" اور طب میں حذاقت انتساب لکھا ہے[2]

دہلی کی معاشرتی زندگی میں ان کا مقام تھا، اور تہذیبی اعتبار سے ان کے خاندان کی بڑی حیثیت سمجھی جاتی تھی۔

اپنے چچا ہدایت کی طرح ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت بڑا تھا۔ قاسم[3] کے مطابق دلی کے اکثر شاعر ان کے شاگرد ہیں یا متبع، فراق کے شاگردوں میں سعد اللہ خاں تنہا (عمدہ منتخبہ ص ۱۶۷) محمد عبداللہ خاں خستہ (گلشن بے خار ص ۷۰) خیراتی خاں دلسوز (طبقات شعرائے ہند ص ۳۰۵) مرزا اسد بیگ رفیق (عمدہ منتخبہ ص ۲۹۸ گلشن بے خار ص ۸۷ سخن شعرا ص ۱۸۹) مظہر علی خاں شفیق (گلشن بے خار ص ۱۱۰ سخن شعرا ص ۲۵۰ عمدہ منتخبہ ص ۳۷۵) ناصر حسین شورش (سخن شعرا ص ۲۵۴) قلندر حسین شورش (عمدہ منتخبہ ص ۳۸۹) امیر بخش خاں شہرت (گلشن بے خار ص ۱۱۴ گلستان بے خزاں ص ۱۲۷ سخن شعرا ص ۲۵۸) فریدالدین آفاق (عمدہ منتخبہ ص ۱۰۹ گلشن بے خار ص ۱۵ بہار بے خزاں ص ۱۲ مجموعہ نغز ص ۳۸) عاشور بیگ خاں طالب (سخن شعرا ص ۲۹۹ یادگار شعرا ص ۱۱۱) بہادر بیگ خاں غالب (یادگار شعرا ص ۱۲۶) کنور گوپال ناتھ غلام (یادگار شعرا ص ۱۲۷) مرزا ابر علی بیگ ناصر دہلوی (ریاض الفصحا ص ۲۷۱ سخن شعرا ص ۳۷۹

---

[1] عمدہ منتخبہ ص ۴۵۹

[2] مجموعہ نغز جلد ا ص ۲۴۹

[3] یہ حکیم میر قدرت اللہ قاسم کے بھی شاگرد تھے طبقات شعرائے ہند ص ۲۸۸

[4] بہادر شاہ ظفر کے خواص میں تھے، اپنے ہاں محفل مشاعرہ منعقد کرتے تھے طبقات شعرائے ہند ص ۳۳۱

گلستان بے خزاں ص ۱۹۲) میر محمدی قربان (گلشن بے خار ۱۵۹ گلستان بے خزاں ۱۹۳ طبقات شعرا ۱۶۴) میر بہادر علی محبت (سخن شعرا ۴۱۶ عمدہ منتخبہ ۷۲۲) مقبول[1] نبی مقبول میر عسکری میرن (عسکر علی میرن عمدہ منتخبہ ۴۵، سخن شعرا ۴۸۷) محمد قاسم ندیم دہلوی (یادگار شعرا ۱۷۶) غلام[2] حسین یاد سونی پتی (عمدہ منتخبہ ۸۳۰) نراین داس بیخود (مجموعہ نغز ۱۲۶ یادگار شعرا ۳۸) مصطفی نجر دہلوی[3] (گلستان بے خزاں ۵۳ گلشن بے خار ۴۱ سخن شعرا ۸۳) قدرت اللہ قدرت (طبقات شعرا ۱۶۳ گلشن بے خار ۱۵۹ سخن شعرا ۳۸۲ گلستان بے خزاں ۱۹۳) بہادر علی بجیب (سخن شعرا ۵۰۵) مرزا غفور بیگ افسوس (مجموعہ نغز ۶۶) یہ قاسم کے بھی شاگرد تھے۔ اصل میں ہدایت سے تلمذ تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں فراق سے اصلاح لیتے تھے (طبقات شعرا ۲۴۳)

مرزا سنگین بیگ نے کوچہ چیلان میں خواجہ میر درد کے مکان کے قریب حکیم ثناء اللہ خاں کی حویلی کا تذکرہ کیا ہے[4] نزہتہ الخواطر ان کے سلسلہ میں ایسا ماخذ ہے جس سے ان کے اساتذہ اور تاریخ وفات کا علم ہوتا ہے۔ اس کے مطابق دہلی کے دوسرے علما کے علاوہ خواجہ میر درد سے درسیات اور حکیم شریف خاں سے طب کی تحصیل کی تھی۔ درس کا سلسلہ رہتا تھا۔ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء سے قبل وفات پائی[5]

---

[1] یہ دہلی کے مشہور شاعر انعام اللہ خاں یقین کے بیٹے تھے، گلشن بے خار ۱۸۶ سخن شعرا ۴۵۳ عمدہ منتخبہ ۳۳۷

[2] شاہ عبدالعزیز کے عزیزوں میں تھے، مولانا فخر الدین سے کسب باطن کیا تھا، گلشن بے خار ۲۴۲ سخن شعرا ۵۷۶۔ طبقات شعرا ۲۹۵

[3] خلف شاہ رفیع الدین

[4] سیر المنازل ص ۲۷

[5] نزہتہ الخواطر جلد ۷، ص ۱۱۴

حکیم پناہ خاں حکیم

حکیم محمد پناہ خاں حکیم صحیح النسب سید تھے۔ دہلی کے قدیم خاندان سے تعلق تھا۔ والد کا نام سید محمد شریف خاں زربخش (لک بخش) تھا، ذی رتبہ اشخاص میں شمار کئے جاتے تھے۔ خطاب خانی اور منصب ہزاری سے سرفراز تھے۔ لکھنؤ کی بھی سیر کی۔ لکھنؤ کے سفر میں مصحفی نے ان کی ہمراہی کا ذکر کیا ہے۔ وہاں سے پھر دہلی آئے۔ خواجہ میر درد (وفات ۱۷۸۵ء) کے شاگرد تھے، پہلے ان کا تخلص نثار تھا، بعد میں طب کی مناسبت سے حکیم تخلص اختیار کیا۔ طب اور تاریخ میں کامل دخل رکھتے تھے[1] ان کے علاوہ دیگر علوم شریفہ میں بھی رتبہ کمال حاصل تھا[2] اسپرنگر نے طب اور موسیقی میں تعریف کرتے ہوئے سپرد و ادبی اساتذہ اور تذکرہ ہائے سلف میں انہیں یگانہ لکھا ہے[3] خوش اختلاط، گرم ارتباط، کتب سیر فارسی پر نظر تھی[4] دردآلود عاشقانہ اور باکیفیت شعر کہتے تھے[5]

حکیم قدرت اللہ قدرت

طب اور عربی میں پوری مہارت رکھتے تھے، مصحفی سے دہلی میں اکثر ملاقات

---

[1] عمدہ منتخبہ ص ۳۳۵ گلستان بے خزاں ص ۲۷، بزم سخن ص ۵۲

[2] خمخانہ جاوید جلد ۲ ص ۴۹۲

[3] یادگار شعرا ص ۶۵

[4] طبقات شعرائے ہند ص ۲۴۷ مجموعہ نغز ص ۲۲۲

[5] عمدہ منتخبہ ص ۳۳۵

رہتی تھی۔ حکیم ثناء اللہ فراق کے شاگرد اور دوست تھے[1] باطن نے ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے "کلام میں مشاق، سخن میں طاق، خلق ان کی مشتاق"[2]
اسپرنگر کے مطابق ۱۸۳۴ء کے قریب انتقال کیا[3]

حکیم محمد حسین کلیم

دہلی کے طبیب اور شاعر تھے[4] فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ میر اور مرزا کے ہمعصر تھے اور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے کلام میں زبان و بیان کی خوبی ملتی ہے۔
رسالہ عروض و قوافی، ترجمہ فصوص الحکم (شیخ محی الدین ابن عربی) اور ایک قصہ رنگین اردو نثر میں ان کی تصانیف میں ہے۔ میر محمد حسن تجلی ان کے بیٹے تھے[5] بزم سخن کے مطابق فصوص الحکم کے علاوہ ابن عربی کے کئی رسالوں کو اردو میں منتقل کیا تھا۔ طب میں بھی مہارت کامل تھی۔ صاحب طور کلیم نے انہیں میر تقی میر کا بہنوئی لکھا ہے[6]

حکیم سید محمدی ظاہر دہلوی

حکیم میر محمدی کے والد حکیم میر واجد علی حاذق معالج تھے۔ بسلسلہ طبابت نواب

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۱۸۳

[2] گلستان بے خزاں ص ۱۹۳

[3] یادگار شعراء ص ۱۳۹

[4] گلشن بے خار ص ۱۶۳

[5] عمدہ منتخبہ ص ۵۲۷ [6] بزم سخن و طور کلیم ص ۱۰۵

احمد بخش خاں فخر الدولہ سے وابستہ رہے۔ دہلی کے علاوہ آگرہ بھی قیام رہا۔ یہ مولانا فخر الدین دہلوی کے خلیفہ تھے[1] میر محمدی سید عالی نسب دہلی کے رہنے والے تھے۔ آگرہ میں بھی مقیم رہے۔ شاعر خوش محاورہ وشیریں کلام تھے۔ طبابت میں مہارت رکھتے تھے[2] حکیم میر محمدی کو مولانا ضیاء الدین جے پوری (خلیفہ مولانا فخر الدین دہلی) سے فخر بیعت حاصل تھا، ۱۲۵۹ھ ۱۸۴۳ء میں انتقال کیا۔ صاحب دیوان تھے[3]

حکیم میر قطب الدین باطن

حکیم میر محمدی کے بیٹے حکیم میر قطب الدین باطن طبیب، شاعر اور مصنف تھے شیفتہ کی گلشن بے خار کے جواب میں گلستان بے خزاں تصنیف کی تھی۔ میاں نظیر اکبر آبادی سے استفادہ سخن کیا تھا[4] گلستاں بے خزاں اردو شعرا کے تذکرہ پر معتبر سمجھی جاتی ہے اور ان کی شہرت کا اصل باعث ہے۔ باطن میاں کالے صاحب کے مرید تھے۔ دیوان اور مثنوی غم دلربا بھی ان کی یادگار ہے۔

حکیم میر قطب الدین باطن کے بڑے بیٹے حکیم سید فخر الدین بھی شاعری اور طب میں امتیاز رکھتے تھے۔ مرزا حاتم علی مہر کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ خوش طبیعت اور خوش تقریر تھے۔ مشاعروں میں شرکت رہتی تھی[5] اس طرح کئی نسلوں تک اس خاندان نے طب اور شاعری کی آبیاری کی ہے۔

---

[1] گلستاں بے خزاں ص ۱۵۲ سخن شعرا ص ۳۰۶

[2] عمدہ منتخبہ ص ۸۱۵

[3] گلستان بے خزاں ص ۱۵۲

[4] گلستان بے خزاں ص ۲۴ خمخانہ جاوید جلد ۱ ص ۵۳۲

[5] ایضاً ص ۱۸۲

حکیم قدرت اللہ قاسم نے ان کی خاندانی منزلت اور طب میں مہارت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے [1]

حکیم شرف الدین خاں

حکیم شریف خاں کے دوسرے صاحبزادہ تھے۔ خاندانی تذکروں میں دوسری شاخوں کے بعض نہایت ممتاز افراد کی طرح ان کے بارے میں بھی کوئی تفصیل نہیں پیش کی گئی ہے۔

حکیم شرف الدین خاں دربار شاہی سے وابستہ تھے، اور اکبر شاہ ثانی کے درباری طبیب کی حیثیت سے منزلت کا درجہ رکھتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے بعد بہادر شاہ ظفر کے ہاں بھی ۱۸۳۷ سے شروع ۱۸۴۰ تک انہیں خصوصی معالج کا مرتبہ حاصل رہا۔ اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں اس عہدہ پر فائز ہوئے۔

برطانوی ہند میں حکیم محمود خاں نے جن کی تحریریں خاندانی حالات کا خاص ماخذ ہیں اراکین خاندان شریفی کی آخری مغل دربار سے وابستگی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً اس میں اس زمانہ کی سیاسی صورت حال کا دخل رہا، اور خاص طور پر بہادر شاہ سے تعلق کے اظہار کو مصلحت کے خلاف سمجھا گیا۔ شاہی عہد کے اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف حکیم شرف الدین خاں بلکہ حکیم صادق علی خاں کا بھی دربار سے تعلق تھا۔

دہلی اردو اخبار جو ۱۸۴۰ سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس کی ۲۳ فروری ۱۸۴۰ء کی اشاعت میں یہ خبر درج ہے "حکیم احسن اللہ خاں کو خلعت پارچہ کا تین رقم جواہر مع خطاب عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزماں حکیم احسن اللہ خاں ثابت جنگ مرحمت

---

[1] مجموعہ نغز ص ۳۷۱

ہوا۔ اور حکیم مذکور بجائے حکیم شرف الدین کے واسطے خاص حضور والا کے سرفراز ہوتے[1]

دہلی اردو اخبار کی ۲۷ دسمبر ۱۸۴۰ کی اشاعت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تقریب کے موقع پر بہادر شاہ نے حکیم احسن اللہ خاں، حکیم امام الدین خاں، حکیم اسد علی خاں، حکیم شرف الدین خاں اور حکیم صادق علی خاں کو خلعت چھ چھ پارچے عطا کئے[2]

حکیم میر عزت اللہ خاں عشق

ان کے والد حکیم سید قدرت اللہ قاسم کے علاوہ ان کے دادا مولوی حافظ نور احمد ممتاز نہایت ذی علم شخص تھے[3] حکیم عزت اللہ نے درسیات اور خصوصاً طب کی تحصیل اپنے والد کی خدمت میں کمال تحقیق و تدقیق سے کی۔ اور معالجہ مرض کو حد اعجاز تک پہنچایا[4] شاعری میں حکیم ثناء اللہ فراق سے اصلاح لی تھی[5] سرور نے فن طب میں ان کی مہارت کا ذکر کیا ہے اور خود ان کے والد حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے طب میں ان کے ید طولیٰ اور معالجہ مرضا میں مسیحائی کی تعریف کی ہے[6] قطب الدین باطن نے لکھا ہے "علم حکمت میں مشاق اور طب میں شہرہ آفاق ہیں، طبیب حاذق اور مطب کرنے کے لائق"[7] شیفتہ کا بیان ہے کہ دہلی کے معتبر لوگوں میں تھے۔ فن طب

---

[1] تاریخ صحافت اردو جلد ا ص ۱۴۰

[2] ایضاً ص ۱۹۱

[3] یادگار شعرا ص ۱۶۱

[4] گلستان سخن ص ۳۶۰

[5] طبقات شعرائے ہند ص ۳۷۶

[6] مجموعہ نغز ص ۳۸۵ [7] گلستان بے خزاں ص ۱۶۲

میں دست بلند حاصل تھا۔ اس نے ان سے اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے انہیں سنجیدہ اور متین بنایا ہے[۱]

حکیم عزت اللہ جوانی ہی میں لباس صلاح و تقویٰ سے آراستہ اور زیور حلم و حیا سے پیراستہ تھے۔ موزونیت طبع کے سبب جو انہیں وراثت میں ملی تھی، فکر شعر گوئی کرتے تھے۔ متواضع اور مؤدب تھے[۲]۔ قاسم نے انہیں مرد صالح، درویش نہاد، عقبیٰ دوست، شیریں کلام اور سلیم الطبع لکھا ہے۔ انہیں حفظ قرآن کی سعادت بھی میسر تھی[۳]۔ ۱۸۴۰ء کے قریب انتقال ہوا۔

محمد حسین آزاد نے بہادر شاہ کے دربار کے کہنہ مشق شعرا کا نام پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حکیم ثناء اللہ فراقؔ، میر غالب علی خاں سیدؔ، عبد الرحمٰن خاں احسانؔ، برہان الدین خاں زارؔ، حکیم قدرت اللہ خاں قاسمؔ، حکیم عزت اللہ خاں عشقؔ، میاں شکیباؔ، مرزا عظیم بیگ، میر قمر الدین منتؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، وغیرہ سب مشاعرہ میں آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنا اپنا کلام سناتے تھے، مطلع اور مصرع جلسہ میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا تھا، مصرع پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا[۴]

عشقؔ کا شمار دہلی کے مشاہیر سخن میں کیا جاتا ہے، تلامذہ کی کثرت سے دہلی کی فضائے شعری میں ان کے حصہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ امیر علی امیرؔ (سخن شعرا ص ۴۷ گلستان سخن ۱۴۴) احمد علی حبؔ فرید آبادی (سخن شعرا ۱۲۳) محمد ہاشم شائقؔ (گلستان بے خزاں ۱۲۰ سخن شعرا ۲۴۰ طبقات شعرا ۳۹۸) مقبول شاہ بینواؔ (عمدہ منتخبہ ۱۵۵) فیض علی

---

[۱] گلشن بے خار ص ۱۳۵

[۲] عمدہ منتخبہ ص ۴۲۷

[۳] مجموعہ نغز ص ۳۸۵

[۴] آب حیات ص ۴۲۵

علی سرور[1] (عمدہ منتخبہ ۳۵۴) وزیر[2] علی مسرت (طبقات شعرا ص ۳۸۵ سخن شعرا ص ۴۳۱ عمدہ منتخبہ ۷۲۳) مرزا سنگی بیگ مستور (عمدہ منتخبہ ۷۲۶ بہار بے خزاں ۲۱۴ گلشن بے خار ۱۷۶ طبقات شعرا ۳۸۵) یوسف علی یوسف (عمدہ منتخبہ ۸۱۹ گلشن بے خار ۲۴۴ سخن شعرا ۵۱۷ طبقات شعرائے ہند ۳۹۵) احمد علی احمد (طبقات شعرائے ہند ۳۹۶) امیر علی فرحت دہلوی (سخن شعرا ص ۳۶۳ گلشن بے خار ۱۴۸ گلستان بے خزاں ۱۸۱ عمدہ منتخبہ ۴۹۲) منیت علی مغموم دہلوی (عمدہ منتخبہ ۴۳، طبقات شعرا ۳۸۷) زاہد بیگ نارک (عمدہ منتخبہ ۱۷۰) محب اللہ جوان دہلوی (خمخانہ جاوید جلد ۲ ص ۲۸۰ یادگار شعرا ۵۴) مرزا غلام[3] حسین صبر (گلستان بے خزاں ۱۴۲ گلشن بے خار ۱۲۵) غلام حسن صیاد (عمدہ منتخبہ ۳۹۷) سید محمد تعشق (گلستان بے خزاں ۵۴ عمدہ منتخبہ ۱۵۸ گلشن بے خار ۴۳) ان کے شاگردوں میں ہیں۔

حکیم سید محمد تعشق

حکیم سید محمد تعشق ابن حکیم ابو محمد شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد سے تھے۔ فاضل کامل عالم محقق اور ذہین و ذکی تھے باریک بینی اور جوہر شناسی میں کمال تھا۔ حکیم میر عزت اللہ عشق کے شاگرد اور داماد تھے۔ طب میں مولوی رشید الدین خاں اور حکیم قدرت اللہ قاسم سے تلمذ تھا۔ تمام مشرقی علوم میں استحضار خاص طور پر طب میں مہارت تام تھی۔

---

[1] سرور نے حکیم قدرت اللہ قاسم سے درسی کتابیں پڑھی تھیں اور شاعری میں حکیم عزت اللہ سے اصلاح لی تھی۔ طبقات شعرائے ہند ص ۴۰۴

[2] یہ حکیم قدرت اللہ قاسم کے بیٹے تھے۔ گلشن بے خار ص ۱۷۶ گلستان بے خزاں ص ۲۱۴

[3] گلستان بے خزاں میں غلام حسن نام ہے، دہلی کے رہنے والے اور حکیم ابو علی خاں کے بیٹے تھے (سخن شعرا ۲۷۸ طبقات شعرا ۳۱۷) عمدہ منتخبہ میں ان کے والد کا نام حکیم محمد علی خاں درج ہے (ص ۳۹۷)

حکیم قدرت اللہ قاسم نے قرابت قریبہ کی وجہ سے ان کی تعلیم و تربیت میں بے حد دلچسپی لی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ معالجہ کے باب میں ان سے ایسے عجیب نکتے اور فائدے حاصل ہوتے کہ بعض اوقات ان کی حسن تدبیر پر اتفاق تقدیر کا گمان ہوتا تھا۔ اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور حکیم صاحب کی نذر اصلاح سے گزارتے تھے۔ مدرسہ سرکاری (دہلی کالج) میں سو روپیہ ماہانہ پر عربی کے استاد رہے[1] شاہ جہاں آباد کے ممتاز لوگوں میں تھے اور فن طب میں کمال تھا[2]

لالہ سری رام نے انہیں نامور ادیب بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ معالجات میں خوب دخل رکھتے تھے۔ طبیعت میں غضب کا استحضار تھا۔ ان کو ہمہ دانی کا دعویٰ تھا اور فی الحقیقت جامع کمالات انسان تھے[3] دہلی کے کسی طبیب کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اچھا شعر سن کر بیتاب ہو جاتے تھے اور خود بھی اچھے شعر کہتے تھے[4]

۷۵ برس کی عمر میں ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں فوت ہوئے[5] دو کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

۱. علم فرایض کی مشہور کتاب سراجی کا ترجمہ و شرح۔

۲. منطق کی کتاب شمسیہ کا عربی سے اردو ترجمہ۔ یہ دونوں کتابیں طبع ہو چکی ہیں[6]

حکیم مولوی عبداللہ خاں علوی

مشہور عالم، طبیب اور شاعر تھے۔ اصل وطن خورجہ تھا۔ لیکن زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں

---

[1] گلستان سخن ص ۱۷۵

[2] بزم سخن ص ۴۳

[3] خمخانہ جاوید جلد ۲ ص ۱۰۵

[4] دہلی کی آخری شمع ص ۷۷

[5] نزہۃ الخواطر جلد ۷ ص ۴۱۰ دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۸۸

[6] طبقات شعرائے ہند ص ۳۶۶

میں گزرا۔ سید احمد شہید کی تحریک اور دعوت حق سے تعلق تھا۔ آخر میں شمس آباد میں ایک رئیس کے ہاں ملازم ہو گئے تھے۔ وہیں ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں انتقال ہوا[1] غالباً یہ وہی صاحب ہیں جنہیں لالہ سری رام نے حکیم عبداللہ خاں رسا دہلوی کے نام سے بیان کیا ہے[2]

حکیم نصراللہ خاں وصال

حکیم ثناء اللہ فراق کے بیٹے تھے۔ ابتدا میں فنون درسیہ اور طب کی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ شاہ عبدالعزیز سے بھی استفادہ کا موقع ملا[3] اس کے بعد حدیث، فقہ، اصول، منطق، معانی، فلسفہ، ہندسہ و ہیئت شاہ رفیع الدین سے اور علم طب حکیم شریف خاں سے کسب کیا، کتاب دانی، فراست اور مرض شناسی میں بے مثل تھے[4] صاحب گلستان سخن نے ان کی بڑی تعریف کی ہے وہ لکھتے ہیں "حکمت مآب فضایل اکتساب سلالہ اماجد کرام زبدہ افاضل عظام قدوہ اکابر آوان، حکیم نصراللہ خاں سلمہ الرحمن خلف جناب مستطاب غفران پناہ مغفرت دستگاہ یگانہ آفاق حکیم ثناءاللہ فراق۔ عقل باور نہیں کرتی کہ یہ حدس صایب درگاہ علی الاطلاق سے کسی اور کو عطا ہوا ہو، بیماری چشم نرگس اور جوشش خون لالہ کی علت دریافت کرنا ایک امر سہل ہے صبا اگر ان کے شفا خانہ میں چلے دل صنوبر کو خفقان سے نجات دے اور اگر نسیم ان کے دستورالعمل کے موافق کام کرے شکم غنچہ کو نفخ سے بچالے، طلار شبنم اگر ان کی تدبیر سے

---

[1] سرگذشت مجاہدین جلد ۴ ص ۱۷۴

[2] خمخانہ جاوید جلد ۳ ص ۳۸۵

[3] طبقات شعرائے ہند ص ۴۵۲

[4] آثار الصنادید ص ۵۱۳ واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۴۰۶

ہوتا رگ گل میں خون نہ مرتا اور اگر لخلخہ گل ان کی تجویز سے عمل میں آتا تو بلبل کا مرض دماغ اتنا طول نہ کھینچتا۔ ان کمالات سے قطع نظر او قات شبانہ روزی میں بیشتر عبادت وطاعت میں مصروف۔ ایسا عالم با عمل روز گار پر کم مشاہدہ ہوا۔ موزونی ذاتی اور مناسبت طبیعی سے فکر شعر بھی دامنگیر تھی[۱]

وہاں علوم متداولہ میں بہت دخل رکھتے تھے[۲] ہیئت ہندسہ اور منطق کے فاضل تھے[۳] طب میں دست قدرت حاصل تھا۔ متعدد رسائل بحران اور دریافت مزاج نسخہ مرکب وغیرہ تصنیف کئے ہیں[۴] ایک شرح تشریح الافلاک (علم ہیئت) عربی میں ہے۔ اردو میں امام حسین کے حالات میں ان کی ایک کتاب ہے جو ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء کی مطبوعہ ہے[۵] حکیم نصراللہ خاں فن طب کے ماہرین میں تھے[۶] انہوں نے فیروز پور جھرکہ میں طبی خدمات انجام دیں، باطن کی ۱۲۴۶ھ یا ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۰ یا ۱۸۳۱ء) میں نواب شمس الدین خاں والی فیروز پور جھرکہ کی سرکار میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں مولوی عزیزاللہ حسینی اور مولوی کرامت علی وغیرہ کا جلسہ رہتا تھا۔ ہر ایک شائق سخن آپس میں اپنے اور بیگانے شعر کہنا۔ چرچا شعر و سخن کا ہونا۔ ہر جوہری سخن کے موتی پرونا[۷]

حکیم صاحب پہلے نواب فیض محمد خاں رئیس جھجھر کی سرکار میں عہدہ طبابت پر مامور

---

[۱] گلستان سخن ص ۴۷۲

[۲] سخن شعرا ص ۵۵۳

[۳] نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۴۹۹

[۴] آثار الصنادید ص ۱۵۴ واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۴۰۶

[۵] طبقات شعرائے ہند ص ۴۵۲

[۶] گلشن بے خار ص ۲۳۷

[۷] گلستان بے خزاں ص ۲۸۱

تھے۔ اس کے بعد اور عمدہ ہائے روزگار کی سرکار میں منسلک رہے۔ پھر بنظر قدامت نواب عبدالرحمٰن خاں والی جھجھر کے ہاں سابقہ عہدہ پر فائز ہوئے[1] نواب عبدالرحمٰن خاں نواب فیض محمد خاں کے نبیرہ تھے۔ چنانچہ ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں وہ وہاں کے نواب کے ہاں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ پر ملازم تھے[2] وصال نے کسب سخن اپنے والد سے کیا تھا۔ قاسم نے انہیں حلیم، مہذب، نہایت سنجیدہ اور باادب بیان کیا ہے[3]

کریم الدین نے ۱۸۴۷ء میں ان کی عمر ۶۰ برس کے قریب لکھی ہے[4] اس کی رو سے ۱۷۸۷ء کے قریب ان کی تاریخ پیدائش قرار پاتی ہے۔ حکیم صاحب بہت متقی تھے اور کافی وقت عبادت میں گزارتے تھے۔ حکیم نصراللہ خاں کے حقیقی چھوٹے بھائی حکیم فتح اللہ خاں جی کامیاب طبیب اور نامدار معالج تھے، طب کی تحصیل اپنے برادر گرامی سے کی تھی ایک عرصہ تک نواب اکبر علی خاں رئیس پٹودی کی سرکار میں عہدہ طبابت پر رہے۔ دہلی میں درس و افادہ کا سلسلہ تھا[5] رموز الاطبا میں حکیم نصراللہ خاں وصال کے متعدد نسخے نقل ہیں[6]

حکیم محمد علی خاں وصل

حکیم نصراللہ خاں وصال کے بیٹے حکیم محمد علی خاں کامیاب طبیب اور شاعر تھے۔

---

[1] یادگار شعرا ص ۱۸۳۔ آثار الصنادید ص ۵۱۳ واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۴۰۶

[2] عمدہ منتخبہ ص ۸۰۸ گلشن بےخار ص ۲۳۷

[3] مجموعہ نغز ص ۲۹۶

[4] طبقات شعرائے ہند ص ۴۵۲

[5] نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۳۶۷

[6] رموز الاطبا جلد ۲ ص ۲۲۶

صاحب خمخانہ جاوید نے غلطی سے انہیں ثناء اللہ فراق کا بیٹا لکھا ہے۔ فن شعر میں اپنے والد وصال سے مشورہ کیا تھا[1] علوم رسمی اور فن طب کے فارغ التحصیل اور صحیح معنی میں فرزند رشید تھے[2] صاحب مرات الاشباہ نے ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے "نباض لاثانی، مشخص امراض ابدانی، ارسطو فطرت، فلاطون حکمت، مسیح الزماں حکیم محمد علی خاں ابن حکیم نصراللہ خاں مرحوم فن طب میں یکتائے جہان اور استعداد حکمت میں علامہ زمان ہیں۔ ان کا دامن اخلاق وسیع اور کشادہ ہے۔ طبیعت ہمیشہ بتواضع وتحریم آمادہ ہے۔ بالفعل نواب والی دوجانہ کی سرکار میں مامور ہیں فن طبابت میں مشہور نزدیک و دور ہیں"[3]

حکیم محمد علی خاں کے پوتے حکیم بشیر محمد خاں راحت ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ دادا کے سایہ عاطفت میں تعلیم وتربیت پائی اور انہی سے فن سخن میں اصلاح لی۔ کئی منظوم رسالے ان کی یادگار ہیں[4]

حکیم محمود علی خاں فرحت

حکیم نصراللہ خاں وصال کے دوسرے بیٹے تھے، فرحت تخلص کرتے تھے۔ اپنے دوسرے اراکین خاندان کی طرح کامیاب طبیب تھے اور شاعری سے تعلق تھا[5]

---

[1] سخن شعرا ص ۵۵۴

[2] گلستان سخن ص ۴۰۳

[3] مرات الاشباہ ص ۶۷

[4] خمخانہ جاوید جلد ۳ ص ۳۰۸

[5] گلستان سخن ص ۳۸۶ سخن شعرا ص ۳۶۳

حکیم اسلام بیگ شیدا

جالینوس زماں بقراط دوراں حکیم نصر اللہ خاں کے نواسے تھے۔[1] طب سے خاندانی تعلق کی بنا پر بڑے انہماک اور دلچسپی سے اس کی تحصیل کی۔ اور ممتاز طبیبوں میں شمار ہوتے۔ خوش صورت، نیک سیرت، تیز طبع اور صاحب فکر سلیم تھے، بسبب موزونی طبع فکر شعر بھی کرتے تھے[2] کلام مزیدار ہوتا تھا۔ ریاست پٹیالہ میں بھی ملازم رہے[3]

مولوی حکیم امان علی

حکیم امان علی علوی دہلوی اطبائے حاذقین میں تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالقادر سے حدیث اور دوسرے علوم کی کتابیں پڑھیں۔ درس و افادہ اور معالجہ میں عام شہرت تھی[4]

سرسید نے انہیں عالم اکمل، فاضل اجل، صاحب اطوار صدق و صفا، زبدہ کملا و اسوہ اتقیا لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ قناعت و استغنا کے سبب انہوں نے کبھی اہل روزگار کی طرف رجوع نہیں کیا۔ اور ہمیشہ بے پروایانہ زندگی بسر کی، علم وعمل میں طب میں مہارت رکھتے تھے اور دست شفا حاصل تھا۔ سرسید کو ان کی

---

[1] سخن شعرا ص ۲۶۴ صاحب خمخانہ جاوید نے نبیرہ لکھا ہے۔ جلد ۱ ص ۱۲۹

[2] گلستان سخن ص ۲۹۹

[3] خمخانہ جاوید جلد ۵ ص ۱۲۹

[4] نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۷۷

خدمت میں نیاز و اعتقاد بدرجہ کمال حاصل تھا، اور وہ بھی سرسید سے لطف و مرحمت سے پیش آتے تھے[1]

حکیم امان علی نے حکیم محمد صادق خاں کی فرمایش پر خزینۃ المجربات کے نام سے حکما متقدمین و متاخرین کے نسخے مرتب کئے ہیں. حکیم صادق خاں کا نام کافی احترام سے لیتے ہوئے انہیں حکمت پناہ لکھا ہے کتاب کی ترتیب امراض کے لحاظ سے قایم کی گئی ہے اس کا مخطوطہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے، یہ مخطوطہ بھوپال کے افسر الاطبا حکیم سید نور الحسن کا نقل کردہ ہے[2]

مولانا حکیم رستم علی

ہیئت ہندسہ اور طب کے مشہور عالم تھے فنون ریاضی سرسید کے نانا دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین سے پڑھے، حدیث اور فقہ کی تکمیل شاہ محمد اسحٰق سے کی. طب میں معقول مہارت رکھتے تھے. اور مریض ان کے علاج سے شفا پاتے تھے. فارسی کتابوں کے درس میں امتیاز تھا. عالم مستعد اور فاضل اجل تھے. وقایع نگاری پر بہادر شاہ ظفر کے دربار میں مامور رہے. اور مصلح الدولہ حکیم محمد رستم علی خاں بہادر کے خطاب سے ممتاز ہوئے سراج الاخبار جو بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ تھا اور ہر ہفتہ مطبع سلطانی سے چھپتا تھا. ۱۸۴۱ء میں جاری ہوا تھا، اس میں ان کی چیزیں شایع ہوتی تھیں[3]

---

[1] آثار الصنادید ص ۵۸۰ دہلی کے قدیم مدارس و مدرس ص ۱۳۶

[2] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۱۲۷/ ۱۲۸

[3] آثار الصنادید ص ۵۸۲ نزہتہ الخواطر جلد ۷، ص ۱۷۵

حکیم سید اکبر علی شبّون

ہمشیرہ زادہ مفتی محمد اکرام الدین، اوایل عمر میں حافظ تخلص تھا. علوم متداولہ میں تحقیق و تدقیق کا رتبہ بلند اور سخن سنجی، شعر گوئی اور تہذیب اخلاق میں یکتائے روزگار تھے. طب اور شاعری پر قدرت کا یہ حال تھا کہ علاء الدین قرشی کی مشہور کتاب موجز القانون کا فارسی نظم میں طرز دلپسند کے ساتھ ترجمہ کیا ہے. ۱۲۶۸ھ/۵۱-۱۸۵۰ء میں سفر آخرت اختیار کیا[۱]

حکیم آغا خاں عیش

حکیم آغا علی خاں عرف آغا جان المتخلص بہ عیش خلف الصدق حکیم محمد عیسی خاں فن طب میں دستگاہ کامل رکھتے تھے. دست شفا حاصل تھا. لا علاج مریض ان سے رجوع کرتے تھے[۲]
بادشاہی اور خاندانی طبیب تھے. زیور علم سے آراستہ اور لباس کمال سے پیراستہ صاحب اخلاق خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ صورت اور لطیفہ سنج تھے[۳] باطن نے طب اور شاعری دونوں میں ان کی تعریف کی ہے[۴] صاحب گلستان سخن نے حکیم حاذق ارسطوئے وقت، لقمان دوراں، شاعر خوش کلام، سخنور بلند مقام، صاحب ذہن سلیم وحداوند طبع قدیم یگانہ جہان حکیم آغا جان لکھ کر ان کی صنایع لفظی، محاورہ بندی، اور شستگی زبان کا اعتراف کیا ہے[۵] عیش کو شعر سے عشق تھا. طبیعت بہت ظریف

---

[۱] گلستان سخن ص ۳۰۷

[۲] مرات الاشباہ ص ۶۹

[۳] دہلی کی آخری شمع ص ۱۱۰

[۴] گلستان بے خزاں ص ۱۶۹ [۵] گلستان سخن ص ۲۷۲

پائی تھی۔ ان کی غزل کی خاص خوبی صفائی کلام، شوخی مضامین اور حسن محاورہ ہے۔ حکیم آغا جان نے ایک طرحی مشاعرہ میں جس میں غالبؔ بھی تھے۔ ان کے کلام کی دقت کی شکایت کرتے ہوئے کہا تھا ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے   مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے اور کلام مرزا سمجھے   مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

شیخ اکرام نے لکھا ہے کہ اردو ادب کو ایسے لوگوں کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے تنقید و تمسخر سے مرزا کو ان سرخ و سپید خرف ریزوں کے جمع کرنے سے روکا[1]

محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ ایک دفعہ قلعہ میں مشاعرہ تھا۔ حکیم آغا جان عیشؔ کہن سال مشاق اور نہایت زندہ دل شاعر تھے استاد ذوق کے قریب ہی بیٹھے تھے زمین غزل تھی یار دے بہار دے۔ روزگار دے۔ حکیم آغا جان نے ایک شعر اپنی غزل میں پڑھا ؎

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لیے   تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

ان کے ہاں بھی اسی مضمون کا ایک شعر تھا۔ باوجود اس رتبہ کے لحاظ اور پاس مروت حد سے زیادہ تھا۔ آزاد کے والد پہلو میں بیٹھے تھے۔ ذوق ان سے کہنے لگے کہ مضمون لڑ گیا۔ اب میں وہ شعر نہ پڑھوں۔ انہوں نے کہا کیوں نہ پڑھو۔ نہ پہلے سے انہوں نے آپ کا مضمون سنا تھا نہ آپ نے۔ چنانچہ حکیم صاحب کے بعد ہی ذوق کے آگے شمع آئی۔ انہوں نے پڑھا[2] ؎

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات   رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

آزاد نے ان کی شوخی اور ظرافت طبع کا ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔ ایک شخص عبدالرحمٰن نام پورب سے دلی آئے اور حکیم صاحب کے مکان کے قریب ایک مکتب

---

[1] غالب نامہ ص ۱۸۱

[2] آب حیات ص ۴۶۲

میں بچوں کو پڑھانے لگے. حکیم صاحب کے خاندان کے بعض لڑکے بھی وہاں پڑھتے تھے
ان میں ایک لڑکا سکندر نامہ پڑھ رہا تھا. حکیم صاحب کا معمول تھا کہ آٹھویں ساتویں
دن ہر لڑکے کا رات کو سبق سنا کرتے تھے. سکندر نامہ کا سبق جو سنا تو عجایب وغرایب
مضامین سننے میں آئے. مولوی صاحب سے ملنے کی خواہش کی. حکیم صاحب نے پہلی
ہی ملاقات میں اندازہ کر لیا کہ شد بد سے زیادہ مادہ نہیں. اور یہ طرفہ انسان تھوڑی
سی ترکیب میں رونق محفل ہو سکتا ہے. پوچھا آپ کچھ شعر کا بھی شوق رکھتے ہیں، انہوں
نے کہا کیا مشکل بات ہے ہو سکتا ہے. حکیم صاحب نے کہا کہ ایک جگہ مشاعرہ ہوتا
ہے. یہ طرح کا مصرعہ ہے آپ بھی غزل کہیے. غزل کہہ کر لائے تو سبحان اللہ، اور مولوی
صاحب ہی تخلص رکھا. حکیم صاحب کی طبع ظریف کے مشغلہ کو خدا نے خوب دیا.
غزل کی بہت تعریف کی اور جا بجا اصلاح دے کر خوب لون مرچ چھڑکا. مولوی
صاحب کی چپکی داڑھی لمبی اور نیلی، سر منڈا ہوا. حکیم صاحب نے کہا کہ شعرا کو تخلص
بھی ایسا ہونا چاہیے کہ ظریفانہ و لطیفانہ ہو اور خوش نما ہو اور شان و شوکت کی
عظمت سے تاجدار ہو. بہتر ہے کہ آپ ہدہد تخلص کریں. حضرت سلیمان کا رازدار
تھا اور قاصد خجستہ کام تھا. مولوی صاحب نے بہت خوشی سے منظور فرمایا. مشاعرہ
کے دن جلسہ میں گئے. جب شمع ان کے سامنے آئی تو حکیم صاحب نے ان کی تعریف
میں چند فقرے مناسب وقت فرمائے. سب متوجہ ہوتے. جب انہوں نے غزل
پڑھی تو مسخرے نے تالیاں بجائیں، ظرافت نے ٹوپیاں اچھالیں اور قہقہوں نے اتنا
شور مچایا کہ کسی کی غزل پر اتنی تعریف کا جوش نہ ہوا تھا. مولوی صاحب بہت
خوش ہوتے. اور اسی طرح مشاعرہ اور بعض امرا کے جلسوں کو رونق دیتے رہے
مگر مکتب کے کام سے جاتے رہے. حکیم صاحب نے ان کے گزارہ کے لیے سوچا اور
ان سے کہا کہ بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ کہو تو تمہیں ایک دن دربار میں
لے چلیں. قصیدہ تیار ہوا اور حکیم صاحب نے ہدہد کو اڑا کر دربار میں پہنچا دیا. دو تین
شعر ملاحظہ ہوں ؎

جو تیری مدح میں چونچ اپنی واکر دوں — تو رشک باغ ارم اپنا گھونسلہ کر دوں
جو سرکشی کرے آگے مرے ہما آکر — تو اس کے نوچ کے پر شکل نیولا کر دوں
جو آکے بیز کرے میرے آگے مو سیقار — تو ایسے کان مروڑوں کہ بے سرا کر دوں

بادشاہوں اور امیروں بلکہ زمانہ کی طبیعت کو یہ غذا موافق ہے۔ بادشاہ نے طائر الاراکین، شہپر الملک، ہدہد الشعراء، منقار جنگ بہادر خطاب اور سات روپیہ مہینہ بھی مقرر کر دیا۔

حکیم صاحب ہمیشہ فکر سخن میں رہتے تھے۔ اس میں جو ظرافت کے مضامین خیال میں آتے انہیں موزوں کر کے ہدہد کی چونچ میں دے دیتے تھے حکیم صاحب کے اشارے پر ہدہد بلبلان سخن کو ٹھونگیں بھی مارتا تھا چنانچہ بعض غزلیں سر مشاعرہ پڑھتا اور کہتا کہ یہ غزل غالب کے انداز میں لکھی ہے۔ غالب تو ہنسنے دریا تھے سنتے اور ہنستے تھے۔ مومن خاں وغیرہ نے ہدہد کے شکار کو ایک باز تیار کیا۔ انہوں نے اس کے بھی پر نوچے مشاعرہ میں خوب خوب چھینٹے ہوتے، چند روز بعد باز اڑ گیا۔ یاروں نے ایک کوا تیار کیا۔ زاغ تخلص رکھا۔ انہوں نے اس کی بھی خوب خبر لی۔ جو جانور ہدہد کے مقابل ہوتے تھے چند روز میں ہوا ہو جاتے تھے[1] غرض حکیم صاحب کے مذاق طبیعت نے دہلی کی شعری دنیا میں ہدہد کے ذریعہ اچھا خاصہ ہنگامہ گرم رکھا۔

حکیم صاحب کا شاگردی کا سلسلہ تھا۔ ان کے شاگردوں میں محمد علی تشنہ (گلستان سخن ص ۱۷۲ سخن شعرا ص ۷۸) عبدالواحد واحد دہلوی (گلستان سخن ص ۲۷۰ سخن شعرا ص ۵۳۸) مرزا غلام فخر الدین بادی، نبیرہ شاہ عالم (سخن شعرا ص ۵۵۹) وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ عیش کے اردو دیوان کے دو مخطوطے ایک لندن اور ایک بنارس ہندو یونی ورسٹی میں محفوظ ہیں۔

---

[1] آب حیات ص ۴۶۴ تا ۴۷۰

"عیش کے قصائد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بادشاہی حکیم تھے اور ان کو لال قلعہ سے درماہہ ملتا تھا لیکن باقاعدہ طور پر نواب عبدالرحمٰن خاں والی جھجر سے وابستہ اور ان کے ذاتی معالج تھے۔ اس کے علاوہ ان کے دو مطب بھی تھے۔ ایک دہلی میں اور دوسرا جھجر میں جہاں عوام الناس کو دیکھتے تھے۔ جھجر میں ان کا مطب قصبہ سے باہر ایک چھوٹے سے باغ میں تھا جو باغیچی حکیم کے نام سے مشہور تھا، چونکہ نواب لگ بھگ چھ مہینہ دہلی میں اور چھ مہینہ جھجر میں رہتے تھے، لہٰذا عیش بھی ان کے ساتھ دہلی اور جھجر میں رہنے پر مجبور تھے۔ طب کے پیشہ میں عیش کو کافی شہرت حاصل تھی اور قدرت نے ان کے ہاتھ میں شفا بخش رکھی تھی ان کے متعلق ہریانہ میں ایک روایت ہے کہ ایک بار مہاراجہ پٹیالہ سردار زیندر سنگھ کے کندھے پر ورم آگیا۔ جب ان کے ذاتی حکیم کالے خاں اس زخم کو ٹھیک نہ کر سکے تو مہاراجہ کو ساتھ لے کر حکیم آغا جان عیش کے پاس جھجر آئے اور اپنے مربی وآقا زیندر سنگھ کی طویل بیماری کے متعلق ان کو آگاہ کیا۔ عیش نے مہاراجہ کے زخم کا بغور معائنہ کیا اور بھیڑ کے گوشت کا ایک چھٹانک قیمہ تیار کر کے ان کے کندھے پر باندھ دیا۔ اگلی صبح جب مہاراجہ بیدار ہوئے تو قیمہ کا نام و نشان بھی کندھے پر موجود نہ تھا۔ اسی رات حکیم صاحب نے ایک چھٹانک قیمہ زہر ملا کر مہاراجہ کے کندھے پر پھر باندھ دیا۔ صبح یون چھٹانک سے زیادہ قیمہ کندھے پر بندھا ہوا تھا۔ مہاراجہ، نواب جھجر اور حکیم کالے خاں نے جب عیش سے استفسار کیا تو مسکراتے ہوئے کہا، "زخم کے اندر کیڑے تھے، وہ کندھے کا گوشت کھاتے رہتے تھے اور گھاؤ بھرنے نہیں دیتے تھے۔ پہلی شب قیمہ اس لیے باندھا گیا تھا تاکہ کیڑوں کی موجودگی کا یقین حاصل ہو جائے۔ کل رات قیمہ میں زہر ملا کر باندھا جس کو کھا کر کیڑے ہلاک ہو گئے۔ اب یہ زخم ایک معمولی زخم کے طور پر باقی رہ گیا ہے جو مرہم سے ٹھیک ہو جائے گا۔[1]

---

[1] حکیم آغا جان عیش اور ہریانہ کے مشاہیر ص ۷۴ و ۵

حکیم صاحب نے ۱۸۵۷ء میں غدر کے چند روز بعد انتقال کیا۔ ان کے بیٹے حکیم مرزا جان علی گڑھ میں بصیغہ طبابت ملازم سرکار انگریزی ہو گئے تھے، غالب نے اپنے شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر کو وہاں تحصیل دار مقرر ہونے پر ان کا خیال رکھنے کے لیے خط میں لکھا ہے "ان کے والد ماجد میرے بچاس پچپن برس کے دوست ہیں۔ ان کو بھائی کے برابر جانتا ہوں اس صورت میں حکیم مرزا جان میرے بھتیجے اور تمہارے بھائی ہوئے"[1]

لالہ کھیم نرائن کھتری

دہلی میں شاعری اور طب دونوں میں جن لوگوں نے امتیاز پیدا کیا، ان میں لالہ کھیم نراین کھتری دہلوی نبیرہ لالہ لچھمی نرائن ہیں۔ یہ طب میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں ٹکیت رائے کے ہاں کچھ عرصہ رہے، کلکتہ بھی گئے تھے۔ فارسی میں کہتے تھے[2]

حکیم مرزا محمد عشق

دہلی کے کامیاب معالج اور صاحب فن طبیب تھے۔ شاعری سے ذوق تھا۔ عشق تخلص کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مرزا جعفر دہلوی بھی اچھے شاعر تھے، جنہوں نے حیدر آباد جاکر انتقال کیا[3]

---

[1] سہ ماہی اردو ص ۳۸۰

[2] سخن شعرا ص ۱۹۲

[3] ایضاً ص ۲۴۲

حکیم محب اللہ جواں

دہلی کے پرانے باشندے تھے، بنی اسرائیل خاندان سے تعلق تھا طب کی تعلیم حکیم عزت اللہ عشق سے حاصل کی تھی، کامیاب طبیب تھے عشق کے علاوہ شاعری میں ذکا اور قایم سے بھی تلمذ تھا، تذکرہ سرور میں اسرائیل کے بجائے بزرگ زادہ لکھا ہوا ہے[1] معلمی کے فرایض انجام دیتے تھے[2]

حکیم غلام نقشبند

حکیم غلام نقشبند عالی نسب اور عالی خاندان تھے۔ ان کے بھائی حکیم قطب الدین والد حکیم محمد صادق خاں اور خاندان کے دوسرے بزرگ دربار شاہی سے وابستہ رہے۔ حکیم غلام نقشبند کا دربار شاہی سے وابستگی کے علاوہ عوامی مطب کا سلسلہ تھا، دہلی کے شرفا اور اعلیٰ طبقہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

۱۸ جون ۱۸۴۷ء کے روزنامچہ کے مطابق مرزا خرم بہادر کی مختاری کا عہدہ انہیں مرحمت کیا گیا تھا اور ان کو خلعت پنج پارچہ اور سہ رقم جواہر بہادر شاہ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔[3]

حکیم محمد اسمٰعیل خاں

حکیم اسمٰعیل خاں بہادر شاہ ظفر کے عہد کے ممتاز طبیب اور ارا کین خاندان

---

[1] یادگار شعرا ص ۵۴ [2] خمخانہ جاوید جلد ۲ ص ۲۸۰

[3] ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ ص ۲۵۰

شاہی کے معالج تھے۔ ان کا قیام معالجہ کی وجہ سے قلعہ ہی میں رہتا تھا۔ ۲۳ اپریل ۱۸۴۷ء کے روز نامچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا شاہ رخ کے علاج میں حکیم صاحب کی طرف سے کمی محسوس کرکے ان کے بیٹے مرزا عبداللہ نے بہادر شاہ سے شکایت کی اور مرزا شاہ رخ خاں کی وفات کی کیفیت، علاج کی ناموافقت اور حکیم محمد اسمٰعیل خاں کی بے جہی بیان کی۔ یہ سنتے ہی بادشاہ کا مزاج جادہ اعتدال سے منحرف ہوگیا۔ اور حکیم اسمٰعیل خاں کو برطرف کرتے ہوئے انہیں قلعہ خالی کرنے کا حکم دیا گیا۔

روز نامچہ کے مطابق "شہر میں مشہور ہے کہ حکیم محمد اسمٰعیل نے علاج میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی تھی بلکہ ان کے علاج سے کسی قدر اضافہ ہی ہوا تھا۔ حکیم صاحب کی دواؤں کے اثر سے یہ حالت تھی کہ شہزادہ مرحوم دس سیر دودھ اور پانچ سیر گوشت کی یخنی روزانہ نوش کرتے تھے۔ حکیم محمد اسمٰعیل واقعی حکیم حاذق اور تجربہ کار ہیں۔ اور فن طب میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ خیال بھی نہیں کیا جاسکتا کہ حکیم صاحب نے علاج کرنے میں بے پروائی اور ناتجربہ کاری کی بنا پر ایسی دوائیں استعمال کرائی ہوں جن کی وجہ سے شہزادہ نے داعی اجل کو لبیک کہا ہو۔ افتراپردازوں نے حکیم صاحب کے خلاف اس قسم کی باتیں کی تھیں۔ اور قلعہ میں اس قسم کی سازشیں عام تھیں۔"

حکیم اسمٰعیل خاں غالباً دواخانہ شاہی کے داروغہ بھی تھے۔ ۸؍مئی ۱۸۴۶ء کے روز نامچہ کے مطابق "حکیم محمد اسمٰعیل خاں کی عرضی پہنچی کہ فدوی نے تنخواہ کی تقسیم میں تین ہزار روپیہ کی بچت کی ہے۔ لیکن شہزادہ مرزا غلام فخرالدین بہادر اپنی تین سو روپیہ کی کمی سے ناراض ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس مرتبہ ملازموں کی تنخواہ دواؤں کے اخراجات وضع کرنے کے بعد تقسیم کی جائے گی[۱]۔"

---

[۱] بہادر شاہ ظفر کا روز نامچہ ص ۷۷

حکیم قاسم علی خاں

صاحب مرأة الاشباہ (تالیف ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) نے ان کا تعارف ان الفاظ میں پیش کیا ہے "حکمت مآب کمالات انتساب عیسیٰ دم مسیحا قدم کملای زماں زبدہ حکمای جہاں حکیم محمد قاسم علی خاں خلف الرشید حکیم غلام حسن خاں مرحوم ابن حکیم بو علی خاں مغفور، اس صاحب کمال کی صفت نہ زبان قلم سے ادا ہو سکتی ہے اور نہ حیطہ خیال میں سما سکتی ہے۔ سلسلہ طب کا ان کے خاندان میں قدیم سے جاری ہے۔ یہ اور ان کے والد ریاست جھجر میں بعہدہ طبابت بمشاہیر بیش قرار ممتاز تھے، فی زمانہ یہ کمیٹی اطبائے یونانی میں کہ جو خاص شہر دہلی میں بہ تجویز حکام عالی مقام قرار پائی ہے بعہدہ افسر کمیٹی سرافراز ہیں"[1]

ان کے جد امجد حکیم ابو علی خاں دہلی کے وہ مشہور طبیب ہیں جن کا اکثر تذکرہ ملتا ہے اور جن کی ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء کی یادگار مسجد اور مکان کا پیش نظر کتاب کے دوسرے صفحہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

مرأت الاشباہ کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی میں انگریزوں نے اپنی شروع عملداری میں طب یونانی کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی جس کے ذمہ دار حکیم قاسم علی خاں مقرر کیے گئے تھے۔

حکیم مرزا آغا علی خاں

حکیم قاسم علی خاں کے بھائی اور حکیم بو علی خاں کے پوتے تھے، فاضل طبیبوں میں

---

[1] مرأت الاشباہ ص ۶۶

شمار تھا، معالجہ میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ دور دور سے طلبہ ان کی خدمت میں تحصیل فن کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں ان کے داماد حکیم سید قاسم علی بھی تھے انہیں جب طب کی تعلیم کا شوق پیدا ہوا تو ان سے طب کی درسی کتابیں پڑھیں اور کئی برس ان کے مطب میں شریک ہوئے [1]

حکیم پیر بخش خاں

صاحب ذہن رسالہ حکیم پیر بخش خاں کا سلسلہ نسب حضرت فاروق اعظم تک پہنچتا ہے، مادری سلسلہ سے حضرت شیخ عبد القادر جیلانی سے وابستگی تھی۔ آبا و اجداد اگرچہ تھانیسر کے رہنے والے تھے لیکن خود ان کا مولد و مسکن شاہ جہاں آباد تھا۔ علم طب کی تعلیم حکیم نصر اللہ خاں سے اور مشق نسخہ نگاری اور معالجہ مرزا حکیم احسن اللہ خاں کی خدمت میں حاصل کی اور اس فن میں دستگاہ کامل بہم پہنچائی۔ اکبر شاہ ثانی کے دربار میں رسائی ہوئی اور حکیم دوراں کا خطاب پایا۔ عرصہ دراز تک نواب بہادر جنگ رئیس بہادر گڑھ کی سرکار میں طبیب رہے [2]۔ دہلی اور اس کے نواح میں ان کا وجود مغتنم تھا۔ سرسید کے بقول لوگوں کو ان کی ذات سے وہ منافع حاصل ہوتے جو نفس عیسوی سے بھی متصور نہوں، سرسید سے ان کا اخلاص کا رابطہ تھا انہوں نے ان کے اخلاق اور کمال کی بہت تعریف کی ہے [3]

حکیم حسن بخش خاں

ان کے بزرگوں کا وطن بھی تھانیسر تھا لیکن ان کی پیدائش اور اقامت دہلی میں

---

[1] رموز الاطبا جلد ا ص ۲۷۹ [2] واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۷۰۴

[3] آثار الصنادید ص ۱۵۴ (نزہتہ الخواطر جلد ۷، ص ۱۰۴ بحوالہ آثار الصنادید)

رہی۔ تمام علوم و فنون مثل معقول و منقول، فلسفہ، ہیئت و ہندسہ میں مہارت تمام رکھتے تھے۔ حافظہ غضب کا تھا، طبی کتابیں قانونچہ سے قانون ابن سینا تک بلا تشبیہہ قرآن مجید کی طرح از بریاد تھیں، عقلی علوم میں کمال کی وجہ سے کسی معاصر کو ان سے مباحثہ کا یارا نہیں تھا۔ سرسید نے لکھا ہے کہ جس مجلس میں وہ بولتے تھے حاضرین تصویر کی طرح خاموش اور ساکت رہتے تھے۔[۱]

پہلے نواب فیض محمد خاں رئیس جھجھر سے منسلک رہے۔ ان کی وفات کے بعد کچھ عرصہ خانہ نشینی اختیار کی۔ اس کے بعد حضور بہادر شاہ ظفر میں صاحب عالم مرزا فخر الدین کی سرکار میں عہدہ طبابت پر سرفراز ہوئے۔[۲]

حکیم عبدالحق

حکیم محمد عبدالحق بن محمد حسن بخش دہلی کے رہنے والے تھے، راجہ ناہر سنگھ والی بلب گڑھ نے دیوانی پر مامور کیا تھا، میوٹنی ریکارڈس میں ہے کہ وہ بہادر شاہ ظفر کے ایڈیکانگ بن گئے تھے۔ اور کئی سو سواروں کا دستہ ان کی ماتحتی میں تھا وہ دربار میں آتے جاتے تھے۔ بہادر شاہ کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ بلب گڑھ نے ۲۲ راگست کو ایک عرضی میں مختلف لوگوں پر الزام لگایا تھا کہ وہ روپیہ لے کر دہلی چلے گئے۔ اس میں حکیم عبدالحق کے خلاف دس لاکھ روپیہ کا الزام لگایا گیا تھا۔ انگریزوں نے ان کو پھانسی کی سزا دی تھی۔[۳] منشی جیون لال کے روزنامچہ میں حکیم عبدالحق کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے۔ ۲ ستمبر ۱۸۵۷ کے روزنامچہ میں

۱؎ آثار الصنادید ص ۵۱۵

۲؎ ایضاً ص ۵۱۵۔ واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۷۰۴، نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۱۳۳ (بحوالہ آثار الصنادید)

۳؎ ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۹۷ دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۱۱

جیون لال نے لکھا ہے "بادشاہ دربار عام میں تشریف فرما ہوئے۔ مولانا فضل حق (خیرآبادی)، میر سید سعید علی خاں اور حکیم عبدالحق آداب بجالاتے"۔ ۷ ستمبر ۱۸۵۷ء بادشاہ دربار خاص میں رہے۔ حکیم عبدالحق، میر سعید علی خاں، مولوی فضل حق، بدرالدین خاں اور دیگر تمام امراو روسا شریک دربار رہے[۱]۔ چنی لال (جیون لال) کے روزنامچہ کے مطابق "۱۰ مئی ۱۸۵۷ حکیم عبدالحق نے حاضر ہوکر پانچ روپیہ نذر کے گزرانے[۲]" "۱۹ مئی حکیم عبدالحق اور ان کے بیٹے نے بھی دربار میں حاضر ہوکر پانچ روپیہ نذر کے گزارنے[۳]"

عبداللطیف کے روزنامچہ میں ایک اور طبیب حکیم سعدالدین احمد خاں کا بھی تذکرہ ہے۔ (ص ۹۵)

حکیم رضی الدین خاں

غیاث الدین ارکانیس زماں حکیم رضی الدین خاں ارسلان جنگ مغلیہ نسل سے تھے اسرار حکمت اور رموز طب کے واقف کار اور نہایت درجہ کے خلیق تھے[۱]

عمدۃ الملک بھی ان کا خطاب تھا۔ دہلی کے مشہور طبیبوں میں شمار ہوتے تھے

۸ مئی ۱۸۴۶ء کے احسن الاخبار میں لکھا ہے "صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ روانہ کیا گیا کہ حکیم امام الدین خاں بہادر نواب زینت محل بیگم کے علاج معالجہ میں مصروف ہیں ان کو نواب صاحب فرخ آباد کے معالجہ کے واسطے روانہ نہیں کیا جا سکتا۔

---

[۱] باغی ہندوستان ص ۱۵۵ بحوالہ غدر کی صبح و شام روزنامچہ منشی جیون لال ص ۲۴۰، ۲۴۷

[۲] چراغ دہلی ص ۷۷

[۳] ایضاً ص ۷۹

[۴] ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ ص ۹۰

اگر ان کو رخصت کر دیا جائے گا تو بیگم صاحبہ کے علاج میں مشکل واقع ہو جائے گی"
خاکسار اڈیٹر اخبار کی یہ راتے ہے کہ حکیم امام الدین صاحب کی بجائے حکیم رضی الدین خان بہادر کو بھیج دیا جائے کہ یہ بڑے معرکہ کا علاج کرتے ہیں۔ مایوس مریضوں کو بھی ان کے علاج سے شفائے کلی حاصل ہو جاتی ہے۔ دہلی میں تو ان کی تشخیص اور علاج لوگوں کو بہت راس آگیا ہے[1]

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں شہید ہوئے۔ انتقال کے وقت عمر ۷۰ برس سے زیادہ تھی۔ غالب لکھتے ہیں۔ "کیوں کر لکھوں حکیم رضی الدین خاں کو ایک خاکی نے گولی ماردی اور احمد حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔"[2]

غالب کو ان کے مرنے کا بہت غم ہوا۔ یوسف مرزا کے نام ایک خط میں بہت سے قریبی لوگوں کی موت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں، میرا احمد حسن میکش اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں"[3]

حکیم رضی الدین کے چھوٹے بھائی حکیم مرزا بہادر بیگ بھی طبیب اور فخر خاندان تھے۔ اعتماد الدولہ مہابت خاں بہادر سے بالواسطہ قرابت تھی۔[4]

حکیم مومن خاں مومن

حکیم مومن خاں کے آباواجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ اور طب سے ان کا خاندانی تعلق تھا۔ ان کے دادا حکیم نامدار خاں اپنے بھائی حکیم کامدار خاں کے ہمراہ

---

[1] ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ ص ۶۵ و ۶۶

[2] ایضاً ص ۱۹۳

[3] غالب۔ غلام رسول مہر ص ۳۰۹

[4] ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ ص ۹۰

سلطنت مغلیہ کے دور آخر میں کشمیر سے دہلی آئے اور اپنی حذاقت اور مہارت فن کی وجہ سے دہلی میں مقبولیت حاصل کی۔ شاہ عالم کے خاص طبیبوں میں شمار ہوا، اور شاہی طبیب کا مرتبہ ملا۔ خان صاحب کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ کوچہ چیلان، (چہل امیران) میں جہاں ان دنوں اکابر روزگار کا مسکن تھا قیام کیا[۱] مرزا سنگین بیگ نے کوچہ چیلان میں ان کی مسجد اور حویلی کا تذکرہ کیا ہے[۲]۔ شاہ عالم کے زمانہ میں موضع بلاہا پرگنہ نارنول میں جاگیر پائی۔ جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا کی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل تھا۔ نواب نے ان کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن ورثا حکیم نامدار خاں کے نام مقرر کر دی۔ پنشن مذکور میں حکیم غلام نبی خاں نے اپنا حصہ لیا اور اس میں سے حکیم مومن خاں نے بھی اپنا حق پایا۔ اس کے علاوہ ان کے خاندان کے چار طبیبوں کے نام پر سو روپیہ ماہوار پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی اس میں سے ایک چوتھائی ان کے والد کو اور ان کے بعد مومن خاں کو ان کا حصہ ملتا رہا[۳]۔

مومن کے والد حکیم غلام نبی اور ان کے چچا حکیم غلام حیدر خاں، حکیم غلام حسن خاں اور چچازاد بھائی سب اپنے زمانہ کے مشہور طبیب تھے اور ہر شخص انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس خانوادہ طب میں ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء میں مومن خاں پیدا ہوئے۔ حکیم غلام نبی کو شاہ عبدالعزیز سے بہت عقیدت تھی۔ شاہ صاحب نے ان کی پیدائش پر کان میں اذان دی اور انہی کے پسند سے محمد مومن نام تجویز کیا گیا۔ مومن نے شاہ عبدالقادر کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر درسیات کی تکمیل کی۔ اور شاہ عبدالعزیز سے فیض اٹھایا۔ طب کی تحصیل اپنے والد اور دونوں چچا سے کی۔ اور انہی کے مطب

---

[۱] مومن اور مطالعہ مومن ص ۱۶

[۲] سیر المنازل ص ۲۷

[۳] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۲۴۴

میں نسخہ نویسی کرتے رہے، مومن نے بہت جلد طب میں کمال پیدا کیا، اور تھوڑے ہی عرصہ میں دہلی کے اطبا، حاذقین میں شمار ہونے لگے۔ تقریباً سبھی تذکرہ نگاروں نے فن طب میں ان کے درجہ کمال کی تعریف کی ہے۔

صاحب گلستان بے خزاں نے لکھا ہے "ان کے انا مل نباضی کے قابل مدرکہ میں تشخیص ہے، شیخ الرئیس کو ان سے کیا تخصیص ہے۔ قارورہ شناسی کی تمیز ہے سدیدی، موجز و شرح اسباب ان کے ذہن رسا کی طفل مکتب کی کتاب[1]"

مطب کے علاوہ طب سے انہیں عالمانہ دلچسپی تھی۔ طب کے بارے میں انہوں نے جہاں کہیں بھی اظہار خیال کیا ہے اس میں ایک عالمانہ شان ضرور پائی جاتی ہے ان کے دیوان میں بھی ایسے قطعات ہیں جن میں انہوں نے طب کی اصطلاحوں کو واضح کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے طب کے مختلف پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور یہ "نکتہ ہائے لقمانی" ان تک اگرچہ وراثتہً پہنچے تھے لیکن انہوں نے خود بھی ان پر خاصی محنت کی تھی۔ انشائے مومن میں حکیم احسن اللہ خاں کے نام بعض ایسے خط ہیں جن میں انہوں نے طبی معاملات و مسائل پر بہت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے، ان میں ان کا انداز تمام تر عالمانہ ہے، اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کو علم طب میں مہارت حاصل تھی اور وہ اس کے ہر پہلو پر قدرت رکھتے تھے۔ اور یہ علم ان کی شخصیت کا جزو بن گیا تھا، اور وہ زندگی کے کسی پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے بھی اس کا ذکر چھیڑ دیتے تھے[2]۔

ایک قصیدہ کے اشعار میں اپنی شخصیت اور طب سے خاندانی تعلق کو ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے ؎

مجھ تلک پہنچے ہیں اب وجد سے ۔۔۔ وراثتہً نکتہ ہائے لقمانی

---

[1] گلستان بے خزاں ص ۲۲۳

[2] مومن اور مطالعہ مومن ص ۱۲۰

وہ خرد مند ہوں کہے ہے مجھے　　عقل اول حکیم لاثانی
ہوں وہ نباض جس کے ناخن میں　　حرکات عروق شریانی

مومن نے تیز طبیعت پائی تھی۔ ایک فن پر قانع نہیں رہے۔ علم نجوم کو اہل کمال سے حاصل کیا طب کی طرح نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ اس فن کے ماہرین میں شمار کئے جاتے تھے۔ ایسی مہارت بہم پہنچائی تھی کہ ان کے احکام اور انکشافات سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے، سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے پھر برس دن تک ستاروں کے مقام اور ان کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پیش کرتا تو نہ زائچہ کھینچتے اور نہ تقویم دیکھتے، سایل سے مختلف باتیں پوچھتے اور وہ اکثر باتیں تسلیم کرتا۔ اپنی نجوم دانی کو اس شعر میں ظاہر کیا ہے ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس　　آسمان بھی ہے ستم ایجاد کیا

مومن کو رمل، جفر، ریاضی اور موسیقی میں بھی بڑی مہارت تھی، شطرنج بہت عمدہ کھیلتے تھے۔ انگلستان سے شطرنج کے نقشے حل کے لیے آتے تھے اور وہ انہیں بڑی خوبی سے حل کرتے تھے۔ حکیم سکھانند رقم شطرنج میں ان کے شاگرد تھے، دہلی میں شطرنج کے ایک بے مثل کھلاڑی حکیم اشرف علی خاں بھی تھے[1] مرزا رحیم الدین حیا شطرنج میں ان دونوں کے شاگرد تھے۔ مومن کو شطرنج کا اس قدر شوق تھا کہ جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو نہایت ضروری کام بھی بھول جاتے تھے۔ دہلی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت تھی اور شہر کے دو ایک مشہور شطرنج بازوں کے سوا کسی سے کم نہ تھے۔

مومن کی اردو شاعری پر یہاں اظہار خیال مقصود نہیں ہے۔ وہ اردو کی صف اول کے ان شعرا میں ہیں جن کی شاعری پر بہت لکھا گیا ہے، اور آئندہ

---

[1] دہلی کی آخری شمع ص ۱۱۳

بھی بہت لکھا جاتے گا، ان کے کلام میں اگرچہ مثنویاں، قصیدے، قطعے، رباعیاں سب کچھ ہیں، لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں انہوں نے تصوف، فلسفہ اور دوسری چیزوں کا سہارا نہیں لیا ہے۔ انہوں نے کوچہ عشق میں قدم رکھا تھا، وہ اس کے انگنت پہلوؤں کا شعور رکھتے تھے، انہوں نے جذبات و واردات کو جس سلیقہ سے پیش کیا ہے اور عشق و محبت کے مضامین کی جس خوبصورتی سے عکاسی کی ہے، اس نے ان کی شاعری میں بڑی جدت اور رنگینی پیدا کی ہے اور اس میں دلآویزی اور کشش کے بہت سے سامان ہیں، گیسوئے غزل سنوارنے میں ان کی کاوشیں اردو ادب کی تاریخ کا ہمیشہ اہم حصہ بنی رہیں گی۔

مغلوں کے دور آخر کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں رندی اور مذہبیت کا ایک عجیب و غریب امتزاج تھا۔ اور یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ ایک طرف اس زمانہ کی تہذیب و معاشرت کے علمبردار رات دن بادہ و صنم میں مصروف رہتے تھے۔ دوسری طرف پرہیزگاری کا خیال بھی ان کا دامن نہیں چھوڑتا تھا۔ دنیا کی ہوس اور زندگی سے رس نچوڑ لینے کی خواہش، روحانیت اور معرفت کے خیالات کے ساتھ ساتھ چلتی تھی، غرض یہ تضاد اس زمانہ کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں موجود تھا اور مومن اس کی صحیح نمایندگی کرتے تھے، ان کے ہاں صورت پرستی شاہد بازی اور عاشقی کے دوش بدوش ان دینی اور مذہبی تحریکوں سے بھی دلچسپی ملتی ہے جن کی بدولت اس زمانہ کی معاشرتی زندگی میں جولانی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ اور جن کے پیش نظر مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو بحال کرنا، ان کی معاشی حالت سدھارنا اور ان کی تہذیبی زندگی کو نکھارنا تھا، مومن پر اپنے مذہبی ماحول کے اثرات بہت گہرے تھے وہ بہت جلد ان تحریکوں کے قریب آ گئے۔ ان کے سب سے بڑے علمبردار سید احمد شہید تھے، مومن نے انہیں اپنا پیر و مرشد تسلیم کیا۔[1]

---

[1] مومن اور مطالعہ مومن ص ۲۸۱

مومن ولی اللہی تحریک حریت کے ممتاز مجاہد اور رہنما تھے۔ وہ سید احمد شہید کے مرید اور شاہ اسمٰعیل کے ہم سبق تھے۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک کا ان پر بہت اثر تھا، اس کی حمایت میں وہ کوشاں رہتے تھے۔ ہندوستان پر انگریزی قبضہ کے سخت خلاف تھے، ان کے کلام میں متعدد اشعار ان کے جذبہ جہاد اور آزادی کے ترجمان ہیں ؎

مومن حسد سے کرتے ہیں ساماں جہاد کا ترسا صنم کو دیکھ کر نصرانیوں میں ہم

شوق بزم احمد ذوق شہادت ہے مجھے جلد مومن لے پہنچ اس مہدی دوراں تلک

سید احمد شہید کی شان میں جو قطعے کہے ہیں ان میں سے ایک قطعہ کے کچھ اشعار ہیں ؎

وہ کون امام جہان و جہانیاں احمد کہ محض مقتدی سنت پیمبر ہے
زمیں کو مہر فلک سے نہ کیوں ہو دعوی نور کہ اس کا رایت اقبال سایہ گستر ہے
وہ بادشاہ ملایک سپاہ کو کب دیں کہ نور شمس و قمر جس کے گرد لشکر ہے
وہ برق خرمن ارباب شرک اہل ضلال کہ شعلہ خوشہ حاصل تو دانہ اخگر ہے

مومن کوچہ چیلان میں رہتے تھے۔ حکیم آغا جان عیش کے چھتے کے سامنے مکان تھا۔ اس کا نقشہ کریم الدین نے اس طرح کھینچا ہے "بڑا دروازہ ہے۔ اندر بہت وسیع صحن اور اس کے چاروں طرف عمارت ہے۔ دو طرف دو مینچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان۔ پہلے دالان کے اوپر کمرہ ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرہ کا صحن کر دیا ہے۔ لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے، دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا، قالین پر گاؤ تکیہ سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند رقم اور مرزا رحیم الدین حیا مودب دو زانو بیٹھے ہیں، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں "

مومن خاں کشیدہ قامت تھے۔ سرخ وسفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے ڈنڈ، پتلی کمر، چوڑا سینہ اور لمبی لمبی انگلیاں۔ سر پر گھونگھر والے لمبے لمبے بال، زلفیں بن کر پشت اور شانوں پر بکھرے رہتے تھے۔ کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی تھیں۔ کانوں کے قریب تھوڑے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ اس سراپا پر جو لباس وہ زیب تن کرتے تھے اس سے اس زمانہ کی اعلیٰ سوسائٹی اور اشراف کی طرز معاشرت کا پتہ ملتا ہے۔ وہ شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا پہنتے تھے۔ لیکن نیچے کرتا نہیں ہوتا تھا۔ اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتا، اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ، کاکریزی رنگ کے دوپٹہ کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیتے تھے۔ اور اس کے دونوں کونے سامنے پڑے ہوئے ہوتے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت، سرخ گلبدنی کا پاجامہ، مہریوں پر سے تنگ، اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا، کبھی کبھی ایک برکا پاجامہ بھی پہنتے تھے، مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا، چوڑا سرخ نیفہ، انگرکھے کی آستین آگے سے کٹی ہوئی۔ کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے، سر پر گلشن کی دو پلڑی ٹوپی، اس کے کنارہ پر باریک لیس، ٹوپی اتنی بڑی ہوتی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آجاتی تھی، اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے، غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے[1]

شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا تو حکیم صاحب کے پاس اس کا آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے ان کو عشق تھا۔ کوئی کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پرواہ نہیں

---

[1] دہلی کی آخری شمع ص ۲۹ و ۳۰

کرتے تھے۔ جو مانگتا وہی دیتے۔ جامہ زیبی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا درجہ حکیم مومن خاں کے بعد ہی آتا تھا[1]

بشیر الدین احمد نے بھی انہیں رنگین طبع، رنگین مزاج، خوش وضع اور خوش لباس لکھا ہے۔ لمبے لمبے بالوں میں ہر وقت انگلیوں سے کنگھی کرتے رہتے تھے ایسی دردناک آواز اور دل پذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا[2]

مومن بڑے غیرت مند اور خود دار تھے، دربار سے خاندان کے بزرگوں کا تعلق تھا اور حکیم احسن اللہ خاں سے قرابت قریبہ تھی، ان کے ذریعہ قلعہ تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن اس زمانہ کے دوسرے شعرا کی طرح وہ نہ قلعہ سے وابستہ ہوئے اور نہ کسی رئیس کے سرکار سے تعلق قایم کیا۔ مختلف دیسی ریاستوں ٹونک، بھوپال، رامپور، کپورتھلہ سے پیش کش ہوئی۔ مگر انہوں نے وہاں جانا قبول نہیں کیا۔ مہاراجہ کپورتھلہ نے ساڑھے تین سو روپیہ ماہانہ پر طلب کیا۔ انہوں نے زاد راہ تک واپس کر کے لکھا، جس دربار کا ایک گویا ساڑھے تین سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پاتا ہو وہاں میں اسی تنخواہ پر نہیں جا سکتا، مگر یہ سب بہانے تھے۔ ان کی طبیعت دراصل ملازمت کی پابندیاں برداشت نہیں کر سکتی تھی[3]

دلی کالج میں فارسی کی جگہ کے لیے مفتی صدرالدین نے لفٹنٹ گورنر ٹامسن سے کہا کہ اس شہر میں فارسی داں تین منتخب روزگار ہیں۔ ایک مرزا غالب دوسرے مومن خاں تیسرے صہبائی، مرزا غالب نے انکار کیا۔ مومن خاں نے کہا

---

[1] دہلی کی آخری شمع ص ۳۳ و ۳۶

[2] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۴۲۵

[3] مومن اور مطالعہ مومن ص ۸۶

کہ سو روپیہ ماہانہ سے کم قبول نہیں کروں گا. بالآخر صہبائی کا چالیس روپیہ ماہانہ پر تقرر ہوا. یہ ۱۸۴۰ء کی بات ہے[1]

شیفتہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کبھی دلی سے باہر نہیں نکلے۔ دلی اور دلی والوں کی محبت نے انہیں ایسا کرنے سے باز رکھا[2] دلی کو وہ اپنی دنیا سمجھتے تھے اور اس کو چھوڑنا انہیں کسی حال میں گوارا نہ تھا، کیونکہ دلی ان کے نزدیک زندگی، معاشرت اور تہذیب کی ایک علامت تھی[3]

مفتی انتظام اللہ شہابی نے لطایف الشعرا میں دلی کی ادبی صحبت میں لکھا ہے.
،،حکیم مومن خاں مومن کے یہاں احباب کا مجمع تھا، مرزا غالب، نواب شیفتہ، مفتی صدرالدین آزردہ، حکیم آغا جان عیش سے حضرات شریک صحبت تھے. قاضی نجم الدین برق سکندر آبادی بھی حکیم صاحب سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے. ناسخ لکھنوی کے کلام پر بحث تھی، میر تقی میر کا ذکر آگیا، مرزا غالب فی البدیہہ فرماتے ہیں ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

عیش کہنے لگے، استاد ناسخ نے کیا خوب شعر کہا ہے ؎

یوں نزاکت سے گراں سرمہ ہے چشم یار پر — جس طرح ہو رات بھاری مردم بیمار پر

ہر ایک نے توجہ سے سنا اور داد دی[4]

غالب نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے. مومن خاں نے جس وقت یہ مقطع سنا تو کہا کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے

---

[1] طبقات شعرائے ہند ص ۴۱۴
[2] گلشن بے خار ص ۱۹۶
[3] مومن اور مطالعہ مومن ص ۱۲۵
[4] لطایف الشعرا ص ۲۹ و ۳۰

مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔ ایک صاحب نے جو مومن کی تعلیوں سے خوب واقف تھے۔ یہ سن کر کہا کہ مومن نے یہ اس لیے کہا کہ وہ اپنا زنیہ یقیناً شیخ علی حزیں سے برتر اور بلند تر سمجھتے تھے۔ ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے[1]

مومن کی شرافت طبع کا اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نواب زین العابدین خاں سے اگرچہ ان کی صفائی نہیں تھی، لیکن ان کی علالت کا سن کر ان پر بہت اثر ہوا اور ان کی فرمائش کی تعمیل ضروری سمجھی۔ زین العابدین کو جب اس صورت حال کا علم ہوا تو ان کے آنسو نکل آئے اور کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے[2]

مومن ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء میں پیر پھسلنے سے منڈیر سے نیچے گر گئے۔ دست و بازو میں شدید چوٹ آئی۔ بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آنے پر اپنے علم کی رو سے بتایا کہ پانچ دن یا پانچ ماہ میں مر جاؤں گا، چنانچہ پانچ ماہ بعد انتقال ہوا۔ "دست و بازو بشکست" سے خود تاریخ نکالی تھی، قبرستان مہدیان میں دفن ہیں۔ غالب نے ان کی موت پر کہا تھا۔ ؎

شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر | خون نابہ برخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگ مومن | چون کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

غالب سے مومن کے تعلقات خوشگوار رہے۔ غالب کو ان کے انتقال کا صدمہ پہنچا، نبی بخش حقیر کے نام اپنے خط میں غالب نے اپنے دلی صدمہ کا اظہار کیا ہے "مومن خاں میرا ہم عصر تھا اور یار بھی تھا۔ ۴۲۔۴۳ برس ہوئے یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں اور ان میں ربط پیدا ہوا، اس عرصہ میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان میں نہیں آیا، حضرت چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا دوست تو کہاں سے ہاتھ آتا ہے" حکیم سید کرم حسین ناطق تجارہ کے استاد نثار علی خاں صدق میرٹھی نے "مومن آباد

---

[1] یادگار غالب ص ۲۰۰

[2] دہلی کی آخری شمع ص ۳۸

کرد خلد بریں،، مادہ تاریخ کہا تھا[1] ،، ماتم مومن خاں،، سے بھی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

مومن کی پہلی شادی ۱۸۲۳ء میں ہوئی تھی۔ دوسری شادی دہلی کے نامور خاندانِ ارشاد و ہدایت یعنی خواجہ میر درد کے گھرانہ میں ہوئی۔ ان کے خسر خواجہ محمد نصیر خواجہ میر درد کے نواسے[2] اور ان کی خوشدامن میر درد کی پوتی تھیں[3]۔ خواجہ محمد نصیر محمدی رنج سجادہ نشین و نواسہ میر درد علم موسیقی اور علم حساب کے ماہر تھے، ایک رسالہ نال میں لکھا ہے۔ علم حساب اور جبر و مقابلہ میں بھی کئی رسالے مرتب کئے تھے ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں انتقال ہوا، ان کی دوسری اہلیہ سے ایک بیٹا احمد نصیر خاں اور ایک بیٹی محمدی بیگم یادگار رہیں[4]

میر عبدالرحمن آہی خلف میر حسین تسکین شاگرد و برادرزادہ حکیم مومن خاں نے کتب درسیہ امام بخش صہبائی سے پڑھی تھیں سخن فہم اور طباع تھے مومن نے انہیں متبنی کر لیا تھا۔ ۱۸۷۵ء کے قریب انتقال کیا[5]

مومن کی تصانیف میں ایک اردو کلیات ہے، اسے ان کے شاگرد نواب مصطفی خاں شیفتہ نے مرتب کیا تھا۔

۲۔ دیوان فارسی۔ اسے عبدالرحمن آہی نے مرتب کیا تھا اور حکیم احسن اللہ خاں نے اس کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی تھی[6] ان کا فارسی کلام ان کی وفات کے تین برس بعد ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں حکیم احسن اللہ خاں نے مطبع سلطانی

---

[1] گلستان سخن ص ۴۲۹

[2] عمدہ منتخبہ ص ۲۸۵

[3] مقدمہ دیوان مومن۔ ضیاء احمد بدایونی ص ۲۷

[4] الواح الصنادید ص ۱۹۷

[5] خمخانہ جاوید جلد ۱ ص ۱۱۶

[6] گلستان سخن ص ۴۲۸

میں چھپوایا تھا[1]

۳۔ انشائے مومن۔ مومن کے خطوط اور ان کی تحریروں کا مجموعہ ہے، ان میں سے بیشتر خطوط حکیم احسن اللہ خاں کے نام ہیں۔ بعض خطوط احسن اللہ خاں کی والدہ کے نام بھی ہیں۔ جو مومن خاں کی پھوپھی تھیں[2]۔ خطوط کے اس مجموعہ کو حکیم احسن اللہ خاں نے مرتب کیا تھا اور یہ ان کے زیر اہتمام مطبع سلطانی سے چھپا تھا۔ طبی مسائل کے علاوہ شعر و شاعری کے بارے میں حکیم احسن اللہ خاں کے نام اپنی ان تحریروں میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ مومن کے مطالعہ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

مومن کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، ان میں بہت سے ایسے ممتاز شاعر شامل ہیں، جن کی اس زمانہ کی دلی کی زندگی میں اہمیت تھی اور انہوں نے وہاں ایک صحیح شاعرانہ ماحول پیدا کیا تھا، ان میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (گلشن بے خار صفحہ ۱۱۶) حکیم سید منور علی آشفتہ (گلستان سخن ص ۱۲۲) مرزا غلام فخر الدین نہور (گلستان سخن ص ۱۷۹ یہ مرزا قادر بخش صابر صاحب گلستان سخن کے حقیقی بھائی تھے) محمد بخش ثروت (گلستان سخن ص ۱۸۲) خورشید احمد خورشید (گلستان سخن ص ۲۱۲) محمود بیگ راحت (گلستان سخن ص ۲۳۶) سعادت علی خاں راسخ (گلستان سخن ص ۲۳۷) قربان علی سالک (گلستان سخن ص ۲۶۰ انہیں غالب سے بھی تلمذ تھا) امۃ الفاطمہ صاحب (طبقات شعرائے ہند ص ۳۷۱) عظمت اللہ عظمت بریلوی (گلستان بے خزاں ص ۱۶۵) سید عبدالواحد خاں مبتلیٰ خیرآبادی (مثنوی چشمہ شیریں کے مصنف ہیں۔ بھوپال قیام رہا۔ سخن شعرا ص ۴۳۲ یادگار شعرا ص ۱۵۸) میر حسین تسکین (یادگار شعرا ص ۴۵ گلشن بے خار ص ۴۲) غلام احمد شورش (طبقات شعرائے ہند ص ۳۶۸ یادگار

---

[1] مومن اور مطالعہ مومن ص ۳۵

[2] انشائے مومن ص ۳۰

شعراص ۱۰۲ گلستان بے خزاں ص ۲۷ ان کا تخلص شوؔر مذکور ہے) اکبر خاںؔ اکبر (گلشن بے خار ص ۲۴) غلام ضامن کرمؔ (گلشن بے خار ص ۱۶۱ گلستان بے خزاں ص ۱۹۶) غلام علی خاں وحشتؔ (گلشن بے خار ص ۲۳۵ گلستان سخن ص ۴۷۱ سخن شعرا ص ۵۴۱) نواب عباسؔ علی خاں بیتابؔ (گلستان بے خزاں ص ۱۴۰) میر جھجو جان شیداؔ (گلستان سخن ص ۲۹۹) اجودھیا پرشاد صبرؔ (گلستان سخن ص ۳۱۷) میاں جان صفیرؔ (گلستان سخن ص ۳۲۲) ظہور علی ظہورؔ (گلستان سخن ص ۳۴۷) غریب اللہ غریبؔ (گلستان سخن ص ۳۷۸) مرزا خدا بخش قیصرؔ (گلستان سخن ص ۴۰۵) کاظم علی کاظمؔ (گلستان سخن ص ۴۰۶) مرزا سنگی مضطرؔ (سخن شعرا ص ۴۴۶ گلستان سخن ص ۴۲۸) اصغر علی خاں نسیمؔ (سخن شعرا ص ۵۱۹) حکیم خیرالدین دہلوی[۴] (سخن شعرا ص ۵۶۷) جیسے نامی شاعر ہیں جنہوں نے اردو میں شعری روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ حکیم مولا بخش فلقؔ، شیخ علی بخش بیمارؔ، قاضی نجم الدین برقؔ، نواب مصطفی خاں شیفتہ ان کے ان شاگردوں میں ہیں جو مطالعہ کا مستقل موضوع ہیں۔

حکیم اکرام اللہ خاں اکرامؔ

دہلی کے پرانے باشندہ تھے، جامع مسجد کے قریب مکان تھا۔ ان کے والد حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ دہلوی بھی شہر کے اچھے طبیبوں میں تھے[۵]۔ حکیم اکرام اللہ خاں نے علم طب کی تحصیل اپنے حقیقی چچا حکیم مولوی سعادت اللہ سے کی تھی۔ شاعری سے

---

[۱] نواب مصطفی خاں شیفتہ کے چھوٹے بھائی۔

[۲] نبیرہ نواب فیض اللہ خاں والی رامپور۔

[۳] یہ ذوق کے بھی شاگرد تھے، مزید طبقات شعرائے ہند ۳۹۵۔ گلستان بے خزاں ص ۲۸۶

[۴] سخن شعرا ص ۱۴۲ بزم سخن ص ۵۲

دلچسپی تھی۔ اکرام تخلص کرتے تھے[1]۔ کلام میں شگفتگی تھی۔ مومن اور ذوق کے ہمعصر تھے[2]۔

حکیم امام الدین

حکیم امام الدین خاں علوم طب و فلسفہ میں نہایت بلند پایہ تھے اور وحید العصر مانے جاتے تھے۔ طب میں وہ درجہ کمال حاصل تھا کہ کسی ہمعصر سے ان کا مقابلہ مشکل تھا۔ غرض غدر سے پہلے وہ اس مرتبہ کے شخص تھے کہ اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ سرسید نے ان کے بارے میں لکھا ہے "قطع نظر کمالات طبی سے جامع معقول و منقول، حاوی فروع و اصول، اگر بالفرض انقلاب روزگار سے تمام عالم سے نسخ معتبرہ گاؤ خورد ہو جائیں اور سارے جہاں سے کتب سلف دریابرد ہو جائیں اس سرگروہ ارباب فضل کے حافظہ کی مدد سے پھر کتب خانہ روزگار کا معمور ہو سکتا ہے[3]۔"

بشیر الدین احمد نے تذکرہ اہل کمال دہلی کے ذیل میں لکھا ہے کہ حکیم امام الدین خاں بڑے نباض تھے ان کے بزرگوں کو سرکار شاہی سے مناصب جلیلہ اور مراتب بلند عطا ہوتے رہے۔ اور یہ خود بھی حضرت جہانبانی کی طرف سے عہدہ طبابت پر مامور تھے[4]۔

حکیم امام الدین حکیم غلام رضا خاں کے بیٹے اور حکیم ذکاء اللہ خاں کے بھتیجے تھے۔ معقولات میں مولانا فضل امام (وفات ۵ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء) کی شاگردی کا موقع ملا۔

---

[1] گلستان سخن ص ۱۴۲

[2] خمخانہ جاوید جلد ۱ ص ۳۹۱

[3] آثار الصنادید ص ۵۱۲

[4] واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۴۰۶

حکیم عبدالحی حسنی نے مولانا فضل حق ابن مولانا فضل امام سے تلمذ کا لکھا ہے [1] طب میں اپنے چچا حکیم ذکاء اللہ خاں سے تلمذ تھا۔ خاندان بقائی کے نہایت ممتاز اراکین میں ان کا شمار ہے، ان کا تبحر علمی معالجات میں بہت بڑھا ہوا تھا، فن طب کے تمام جزئیات و کلیات نوک زبان تھے، درس کا وسیع سلسلہ تھا، حکیم الٰہی بخش (سکندرہ) ان کے شاگرد تھے انہوں نے ان سے مفرح القلوب پڑھی تھی۔ حکیم الٰہی بخش صاحب عالم مارہروی کے بھی شاگرد تھے۔ غالب نے منشی نبی بخش حقیر کو ان کے لیے سفارشی خط لکھا ہے [2] غالب نے حکیم امام الدین خاں کے ایک اور شاگرد نسیم اللہ کا بھی ذکر کیا ہے [3] اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ان کو شاہی طبیب مقرر کیا گیا تھا۔ اس وقت پانچ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ یہ تقدیر ہی امر ہے کہ ان کے مقابلہ میں بادشاہ کے علاج میں حکیم احسن اللہ خاں کو کامیابی ہوئی اور کلک قدرت نے غسل صحت ان کے ہاتھ پر لکھا اور وہ حکیم امام الدین کی جگہ شاہی طبیب کے منصب پر فائز ہوئے دہلی میں حکیم احسن اللہ خاں سے پہلے انہیں نہ صرف شاہی طبیب کا اعزاز حاصل تھا بلکہ پورے شہر میں ان کے علاج کی دھوم تھی۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کی موجودگی میں جب احسن اللہ خاں کو درباری طبیب مقرر کیا تو یہ بہت بددل ہوئے [4]

بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں یہ نواب زینت محل کے طبیب خاص تھے، بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کا پیام اور خیر و عافیت پہنچاتے تھے۔ عبد اللطیف نے ان کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ حقایق حکمت اور دقایق علمی میں کمال

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد ۷، ص ۵۷

[2] سہ ماہی اردو ص ۳، ۳۷

[3] غالب کے خطوط جلد ۳ ص ۱۰۸۷

[4] گنجینہ سلیمانی ص ۱۲

کا درجہ رکھتے تھے۔ اور بے نظیر حکیم تھے[1] دلی میں ان پر اس علم کی ریاست ختم تھی۔[2] دہلی سے بد دل ہو کر نواب فرخ آباد کی دعوت پر کچھ عرصہ کے لیے فرخ آباد چلے گئے تھے۔ مگر دہلی علاج کے لیے طلب کئے جاتے تھے۔ یکم مئی ۱۸۴۷ کے روزنامچہ کے مطابق "نواب فرخ آباد نے گورنر جنرل کی ہدایت کے بموجب اپنے طبیب خاص حکیم امام الدین خاں کو زینت محل بیگم صاحبہ کے علاج کے لیے دہلی بھیجا ہے"[3]

۸ مئی کے روزنامچہ میں مذکور ہے "صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ روانہ کیا گیا کہ حکیم امام الدین خاں بہادر نواب زینت بیگم کے علاج معالجہ میں مصروف ہیں ان کو نواب صاحب فرخ آباد کے معالجہ کے واسطے روانہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ان کو رخصت کر دیا جائے گا تو بیگم صاحبہ کے علاج میں مشکل واقع ہو جائے گی"[4] ۲۲ مئی کے روزنامچہ میں اندراج ہے "حکیم امام الدین خاں نے نواب زینت محل بیگم کے علاج سے فرصت پائی ان کا مزاج اب رو بہ صحت ہے۔ حکیم صاحب نواب فرخ آباد کے معالجہ کے واسطے رخصت لے کر جانے والے ہیں"[5]

۱۸۵۷ کے ہنگامہ میں جب لوگ شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے تو یہ بھی دہلی سے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد ہی رن کے حکم سے اپنے گھر واپس آ گئے۔ بعد میں جان منکاف نے انہیں شہر بدر کر دیا اور وہ قطب صاحب میں رہنے لگے۔ پھر بنارس چلے گئے۔ ۱۸۵۸ء میں والی ٹونک کی طلبی پر ٹونک چلے گئے تھے[6] دہلی میں ان کے درس

---

[1] ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۰۳

[2] نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۵۷

[3] ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ ص ۷۴

[4] ایضاً ص ۷۷

[5] ایضاً ص ۸۲

[6] ایضاً ص ۸۲

کا بھی بڑا شہرہ تھا۔ علامہ وقت اور علوی خاں ثانی کہلاتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں حکیم ملا نواب ولایتی (وفات جمادی الثانی ۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۲ء) جیسا فاضل زمانہ طبیب ہے۔ حکیم ملا نواب نے دہلی پہنچ کر حکیم امام الدین سے فن طب کی تحصیل کی تھی۔ حکیم فرزند علی شاہ آبادی جنہیں واجد علی شاہ نے معالج الدولہ کا خطاب عطا کیا تھا اور جو ریاست بھوپال میں افسر الاطباء رہے انہوں نے بھی دہلی جاکر حکیم امام الدین خاں سے طب کی تکمیل کی۔ ان کے زمرۂ تلامذہ میں حکیم نجم الدولہ محمد جان بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی میں علم وفضل میں ان کا بھی کوئی ثانی نہیں تھا۔ حکیم امام الدین کے شاگردوں میں حکیم عبد الصمد امروہوی بھی ممتاز ہیں انہوں نے بھی دہلی حاضر ہوکر ان سے طب کی کتابیں پڑھی تھیں[1]

حکیم امام الدین کے دو فرزند حکیم فضل حسین خاں اور حکیم غلام حیدر خاں تھے۔ یہ دونوں ٹونک میں نواب صاحب کے ہاں ملازم رہے۔ ان کی اولاد میں حکیم احتشام الدین اور حکیم غیاث الدین اس صدی کی تیسری دہائی میں دہلی کے کامیاب معالجین میں تھے۔

صاحب گنجینہ سلیمانی نے لکھا ہے کہ حکیم امام الدین خاں کی تصنیفات میں بعض رسائل قابل دید ہیں[2] راقم سطور کے علم میں کسی کتاب کا نام نہیں آسکا۔ ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء میں حکیم صاحب کا انتقال ہو۔ نام اور زمانہ کی یکسانیت کی بنا پر حکیم کوثر چاند پوری نے غلطی سے حکیم امام الدین خاں دہلوی اور حکیم امام الدین پانیپتی کو ایک شخصیت سمجھ کر دونوں کے حالات یکجا کر دیے ہیں[3]۔ اس سے ان کے مطالعہ میں بڑی غلط فہمی واقع ہوتی ہے۔

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ۷ ص ۲۶۶

[2] گنجینہ سلیمانی ص ۱۳

[3] اطباء عہد مغلیہ ص ۵۵

حکیم غلام محمد خاں

حکیم غلام محمد خاں حکیم صادق علی خاں کے بڑے بیٹے، عالی دماغ، صاحب نظر اور فاضل طبیب تھے، ان کی متعدد کتابیں مختلف علوم و فنون پر لکھی ہوئی موجود ہیں۔ جن سے ان کی قابلیت اور تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے[1] ان کا رسالہ وبا، رسالہ چوب چینی، رسالہ ستہ ضروریہ، رسالہ ماکول و مشروب، رسالہ زبدۃ الاخلاق، رسالہ حنتنی تالیف شریفی کے حاشیہ پر طبع ہو چکے ہیں[2] ان کی ایک کتاب شرح موجز کا نسخہ خدا بخش پٹنہ میں محفوظ ہے[3]

ریاست پٹیالہ سے خاندان شریفی کا تعلق حکیم شریف خاں ہی کے زمانہ سے شروع ہو گیا تھا، ان کے منجھلے صاحبزادہ حکیم شرف الدین خاں ریاست پٹیالہ میں سب سے پہلے طبیب مقرر ہوئے۔ ایک عرصہ تک ملازم رہ کر ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۵ء میں لاولد فوت ہوئے۔ ان کی جگہ حکیم غلام محمد کا تقرر عمل میں آیا۔ پٹیالہ میں انہوں نے ایک عقد بھی کیا تھا۔

حکیم غلام محمد خاں کو حج کی سعادت میسر آئی، یمن ہوتے ہوئے واپسی پر راستہ میں ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں اپنے والد حکیم صادق علی خاں کی وفات سے چھ برس قبل انتقال کیا۔ کل ۴۴ برس کی عمر تھی۔ ان کے بعد ان کے بھائی غلام مرتضیٰ خاں اور پھر بیٹے حکیم غلام اللہ خاں جو مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے خسر تھے، پٹیالہ میں طبیب ریاست مقرر ہوئے، حکیم غلام محمد کے سب سے چھوٹے بیٹے حکیم عبدالعزیز خاں

---

[1] سیرت اجمل ص ۴

[2] تالیف شریفی مطبوعہ اکمل المطابع دہلی ۱۲۸۰ھ

[3] قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین ص ۱۸۰

کے انتقال کے بعد ریاست پٹیالہ سے اس خاندان کا تعلق ختم ہوا۔[1]

حکیم غلام مرتضیٰ خاں

حکیم غلام مرتضیٰ خاں نے طب کی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ اور جلد ہی مبادیات طب پر عبور حاصل کیا۔ حکیم غلام محمد خاں کے انتقال کے بعد پٹیالہ میں مہاراجہ کے طبیب مقرر ہوئے، حکیم صاحب کا قیام پٹیالہ میں تھا کہ ۱۸۵۷ کے ہنگامہ کی وحشت ناک اطلاع ملی۔ یہ پریشان ہوئے اور دہلی آنا چاہا۔ مہاراجہ نے اطمینان دلایا ان کی فوج ایسٹ انڈیا کمپنی کی حمایت کر رہی تھی، چنانچہ ان کے حکم پر دہلی میں شریف منزل کی حفاظت کی گئی اور نہ صرف ان کے اہل خاندان بلکہ اس علاقہ کے لوگوں کو اس سخت ابتلا و فساد کے زمانہ میں عافیت نصیب ہوئی۔ دہلی کے بہت سے معززین نے شریف منزل میں پناہ لی اور پٹیالہ کی فوج کی وجہ سے وہ تباہی سے محفوظ رہے، یہ اہل شہر پر ان کا بڑا احسان ہے۔

حکیم صاحب کو خاندانی وضع کا بڑا خیال رہتا تھا۔ انہوں نے پٹیالہ میں بڑی شان سے زندگی بسر کی۔ وہیں ۵۴ برس کی عمر میں ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء وفات پائی۔

غالب کے حکیم غلام مرتضیٰ خاں سے تعلقات تھے، غالب کا ان کے نام ۱۸۶۵ء کا ایک سفارش نامہ بھی ملتا ہے[2] حکیم غلام رضا خاں اور حکیم احمد سعید خاں دو صاحبزادہ یادگار رہے۔

حکیم احسن اللہ خاں

حکیم احسن اللہ خاں بن حکیم عزیز اللہ صدیقی ابن نظام الدولہ عین الملک حکیم محمد احمد خاں

---

[1] تذکرۂ الخواجگان ص ۹۴ حکیم اجمل خاں ص ۱۲۴

[2] سہ ماہی اردو (کراچی) غالب نمبر ۱۹۶۹ ص ۳۷۳

دہلوی شیخ زین الدین ہروی کی اولاد سے تھے۔ ان کے بزرگ ہندوستان میں پہلے کشمیر آئے، وہاں سے دہلی پہنچے[۱] شیخ زین الدین کا مزار کشمیر میں چشمہ ڈل کے کنارے واقع ہے اور بنام زمیندار شاہ موسوم ہے۔ ان کے خاندان میں جہاں پیری مریدی کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا وہاں ان کے اجداد ہمیشہ مناصب جلیلہ پر سرفراز رہے۔

حکیم محمد عزیز اللہ خاں کے بارے میں سرسید نے لکھا ہے کہ "کمالات ان کے حیّز تحریر اور حیطہ تقریر سے خارج ہیں، اپنی ذات سے تحصیل علم طب کی طرف متوجہ ہوئے اور اس فن شریف کو احکم الحکما حاذق الملک حکیم محمد ذکاء اللہ خاں سے حاصل کیا اور ابنائے نامی شہر شاہ جہان آباد سے اس فن میں سبقت لے گئے[۲]"

حکیم احسن اللہ خاں ۱۲۱۲ھ ۸-۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے، منطق، فلسفہ، ہندسہ اور ہیئت دہلی کے اساتذہ سے اور طب اپنے والد سے پڑھی حکیم ذکاء اللہ خاں سے بھی تلمذ تھا۔ انہوں نے بہت جلد دہلی میں ایسی طبی حیثیت حاصل کی کہ سرسید کے بیان کے مطابق اہل شہر کسی اور کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے، وہ مغلیہ عہد کے آخری عظیم المرتبت طبیب ہیں۔

ابتداء میں فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں والی فیروز پور جھرکہ کی ملازمت میں منصب طبابت پر مامور ہوئے ان کی وفات کے بعد اسد الدولہ نواب فیض محمد خاں والی جھجھر کے معالج خاص بنے اور ان کی آخر زندگی تک جھجھر میں طبی خدمات انجام دیں۔ پھر اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں شاہی طبیب کا اعزاز ملا، عطائے خلعت کے ساتھ عمدۃ الملک، حاذق الزماں کے خطاب سے نوازے گئے۔ بعد میں بہادر شاہ ظفر کے طبیب خاص مقرر ہوئے، احترام الدولہ، عمدۃ الحکما، معتمد الملک ثابت جنگ کے

---

[۱] نزہتہ الخواطر جلد ۷، ص ۲۱

[۲] آثار الصنادید ص ۵۰۸

خطابات عطا ہوتے۔ اور وزیر اعظم کے عہدہ پر سرفراز کئے گئے۔ یہ بڑے دانش مند صاحب تدبیر و سیاست تھے۔ ان کے اثر و اقتدار کا یہ عالم تھا کہ کوئی کام بدون ان کی صلاح و مشورہ کے نہیں ہوتا تھا[1] اور تمام بادشاہی امور کا ان پر انحصار تھا۔ ان کا اخلاق اس قدر وسیع تھا کہ ہر صاحب غرض کی التماس پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے، سرسید کے الفاظ میں "اہالی شہر سے کم ہو گا کہ ان کو اپنا محسن نہ سمجھتا ہو"[2]

عبداللطیف نے اپنے تاریخی روزنامچہ میں ان کی حذاقت، خلق اور سخاوت کی خاص طور پر تعریف کی ہے[3]

حکیم احسن اللہ خاں کی معارف پروری، علم دوستی اور قدر افزائی کے بہت سے واقعات ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کے اہل علم کو دربار سے وابستہ کرنے اور ان کے اعزاز و اکرام کا پورا خیال رکھا۔ غالب اور سرسید کو دربار سے متعلق کرانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ غالب سے خصوصی تعلق تھا۔ ۱۸۵۰ء میں ان کی سفارش سے غالب بہادر شاہ کے دربار میں تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر مامور ہوئے اس پر انہوں نے یہ شعر کہا تھا ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا　　　وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

حالی کا بیان ہے "۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) میں مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ اور چھ پارچہ کا خلعت مع تین رقوم جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ و حمایل مروارید کے دربار عام میں مرحمت فرمایا اور خاندان تیمور کی تاریخ نویسی کی خدمت پر بہ مشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار کے مامور کیا

---

[1] واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۲۰۰

[2] آثار الصنادید ص ۵۰۸

[3] ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ ص ۶۲

اور یہ قرار پایا کہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں مرحوم مختلف تاریخوں سے مضامین الفاظ کر کے مرزا کے حوالہ کیا کریں اور مرزا ان تمام مطالب کو اپنی طرز خاص کی فارسی نثر میں بیان کریں۔ مرزا نے تمام کتاب کا نام پرتوستان اور اس کے پہلے حصہ کا نام مہر نیم روز اور دوسرے کا ماہ نیم ماہ تجویز کیا تھا۔ ماہ نیم ماہ بالکل نہیں لکھا گیا۔ مہر نیم روز ختم ہونے کے بعد غدر ہو گیا[1]۔" اس سلسلہ میں محمد حسین آزاد نے لکھا ہے "حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے تھے۔ انہیں تاریخ کا شوق تھا اور اہل کمال کے ساتھ عموماً تعلق خاطر رکھتے تھے۔ مرزا نے ان کے ایما سے اول کتاب مذکور کا ایک حصہ لکھا۔ اسی کے ذریعہ سے ۱۸۵۰ء میں باریاب حضور ہو کر خدمت تاریخ نویسی پر مامور ہوتے[2]۔" مالک رام نے مرزا کی قلعہ میں رسائی کے تعلق سے میاں کالے صاحب کا بھی نام لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "مولانا نصیر الدین میاں کالے بہادر شاہ کے پیر تھے اور غالب کے بھی دلی دوست اور پرانے مہربان۔ ان کے علاوہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں مدار المہام بھی ان کے قدردان تھے۔ ان صاحبوں نے سفارش کی اور بہادر شاہ نے منظور کر لیا کہ مرزا خاندان تیموری کی تاریخ فارسی زبان میں لکھیں[3]۔"

غالب کی کتاب پنج آہنگ کے منظوم اشتہار سے جو ہفتہ وار اسعد الاخبار میں مورخہ ۲ مارچ ۱۸۴۹ء کو شایع ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب حکیم احسن اللہ خاں کے توسط سے مطبع سلطانی میں چھپی تھی۔

اسی طرح حکیم احسن اللہ خاں نے مرزا غالب کو ان کے کلکتہ کے زمانہ قیام

---

[1] یادگار غالب ص ۳۳، ۳۴، ذکر غالب ص ۱۴۸ تا ۱۵۰

[2] آب حیات ص ۵۰۰ (مہر نیم روز ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۴ء میں شایع ہوئی تھی۔ غالب، غلام رسول مہر ص ۲۴۰)

[3] ذکر غالب ص ۹۰

میں خط لکھ کر ان کی نثر کو شایع کرنے خواہش کی تھی۔[1]

"ایک دفعہ بہادر شاہ سخت بیمار ہوئے۔ مرزا حیدر شکوہ نے جو اکبر شاہ ثانی کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے صحت یابی کی خوشی میں مجتہد العصر (سید محمد) کے ہاتھ سے علم چڑھوایا۔ اس واقعہ کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہو گئی کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے۔ اس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا اور حکیم احسن اللہ خاں نے اس کے تدارک کے لیے کچھ رسالے شایع کرائے اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کئے گئے۔ بادشاہ کے حکم سے مرزا غالب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی، جس کا نام دمغ الباطل رکھا گیا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔ اس مثنوی میں غالب نے جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔ مجتہد العصر نے جب غالب سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا لکھا ہے، غالب نے لکھ بھیجا کہ بادشاہ کا جو حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں"[2] حکیم صاحب غالب کے علاوہ ذوق کے بھی قدرداں تھے، مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں "حکیم احسن اللہ خاں طبیب شاہی تھے اور بڑے مقرب تھے۔ انہی کے پاس بادشاہ کی غزلیں جمع ہوا کرتی تھیں۔ یہی دیوان ظفر ترتیب دیتے اور مرتب کر کے چھپواتے تھے۔ مطبع سلطانی انہی کے اہتمام میں تھا۔ سخن کے جوہر شناس تھے۔ استاد ذوق کا کلام بھی شوق سے لکھوا لیتے تھے۔ کلام کی محبت سے استاد کی محبت رکھتے تھے"[3]

ایک دن دربار میں ایک شہزادہ آیا اور آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ

---

[1] یادگار غالب ص ۳۰۵   [2] ایضاً ص ۸۷

[3] دیوان ذوق مرتبہ آزاد ص ۱۳۷

کہا اور رخصت ہو گیا۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ انہوں نے عرض کیا صاحب عالم اس قدر جلدی یہ آنا کیا تھا اور تشریف لے جانا کیا تھا، صاحب عالم کی زبان سے اس وقت نکلا اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے، بادشاہ نے ذوق کی طرف دیکھ کر کہا استاد کیا صاف مصرعہ ہوا ہے۔ استاد نے توقف کر کے عرض کیا[1]

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے　　　اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

حکیم احسن اللہ خاں نے مومن کے فارسی خطوط مرتب کئے تھے۔ خطوط کا یہ مجموعہ انشائے مومن کے نام سے ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں مطبع سلطانی سے چھپا تھا۔ اس کے شروع میں حکیم احسن اللہ خاں کا دیباچہ ہے۔ اس میں خطوط کے علاوہ مومن نے جو دیباچے اور تقریظیں تحریر کی تھیں، انہیں بھی شامل کیا گیا ہے۔ انشائے مومن کے بیشتر خطوط حکیم احسن اللہ کے نام ہیں۔ مجموعہ کے پہلے خط میں امراض اور ان کے اسباب سے بحث کی گئی ہے۔ اس سے مومن کی مسایل طب سے دلچسپی اور فنی آگاہی کا اظہار ہوتا ہے۔ مومن خاں کا فارسی دیوان بھی حکیم صاحب نے ۱۲۷۱ھ میں مطبع سلطانی سے چھپوایا تھا، اس کا دیباچہ بھی حکیم صاحب نے لکھا تھا۔

اس طرح اس دور کے دہلی کے تینوں نامور شاعروں ذوق، مومن اور غالب سے حکیم صاحب کے گہرے ذاتی مراسم قایم تھے۔

حکیم احسن اللہ نے بڑی قدردانیاں کی ہیں۔ میر ابوالقاسم محبؔ برادر زادہ میر نظام الدین ممنونؔ کے بارے میں مرزا قادر بخش صابرؔ نے لکھا ہے کہ جالینوس زماں بقراط دوراں حکیم احسن اللہ خاں کی قدردانی سے وقایع نگاری خاص سلطانی کے عہدہ سے ممتاز اور تادم مرگ یہی منصب ان کے واسطے موجب امتیاز رہا۔[2]

---

[1] آب حیات ص ۴۶۳ و ۴۶۴

[2] گلستان سخن ص ۴۱۵

مرزا ابو سف علی خاں عزیز (وفات ۱۸۷۲ در بھوپال) جو مرزا غالب سے کے شاگرد تھے، انہیں احترام الدولہ نے بہادر شاہ سے یہ نذر مرثیہ و قصیدہ خدمت چار پارچہ مع گوشوارہ و خطاب سراج الشعرا، سلطان الذاکرین دلوایا۔ اور تیس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کرایا۔[1]

ظہیر دہلوی نے حکیم صاحب کی فرمائش سے قصہ شہزادہ ممتاز کا فارسی سے سلیس اردو ترجمہ کیا تھا۔ اس کے صلہ میں شاہ دہلی نے خطاب و خلعت مرحمت کیا تھا۔ وہ قصہ حکیم صاحب نے بندا مل عطار کو چھاپنے کے لیے دیا تھا۔[2]

حکیم صاحب نے ایک کتاب عجایب القصص جو انبیا کے حالات میں ہے مولوی فخر الدین سے مرتب کرائی تھی۔

برٹش میوزیم لندن میں مرات الاشباہ کا فارسی مخطوطہ ہے۔ فہرست نگار ڈاکٹر چارلس ریو نے اس کا مصنف فخر الدین حسین کو قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ فخر الدین حسین نے اسے حکیم احسن اللہ خاں، مصور غلام علی خاں اور بابر علی خاں کی اعانت سے سرانجام دیا ہے،، اس کتاب کا ایک مخطوطہ صولت پبلک لائبریری رامپور میں بھی ہے۔

مرآت الاشباہ کا اردو ترجمہ ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں مطبع مرتضوی محمد ارتضیٰ خاں سے چھپا ہے۔ یہ ترجمہ مطبع کے مہتمم محمد ارتضیٰ خاں نے کیا ہے اور میرے پیش نظر ہے انہوں نے لکھا ہے ،، محمد ارتضیٰ خاں مہتمم مطبع مرتضوی دہلی نے رسالہ مرات الاشباہ سلاطین خاندان تیموریہ مؤلفہ احترام الدولہ عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق العہد والآوان حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر ثابت جنگ کو بہ تکلیف بعض احباب زبان فارسی سے اردو میں بعبارت سلیس عام فہم خلاصہ کیا اور کچھ کچھ حال مختصر دیگر کتب

---

[1] تلامذہ غالب ص ۲۳۷

[2] خمخانہ جاوید جلد ۵ ص ۵۸۷

تواریخ بھی ایزاد کیا گیا[۱]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکیم احسن اللہ خاں کی تصنیف ہے، اس کتاب میں فرمانرواؤں کے علاوہ اطبا اور شعرا کے حالات بھی درج ہیں۔ مرزا غالب کا بھی تذکرہ ہے اور یہ غالب کا وہ تذکرہ ہے جو ان کی حیات میں شایع ہوا ہے۔ اطبا میں حکیم احسن اللہ خاں کا بھی تذکرہ شامل ہے جو مترجم کا اضافہ کردہ معلوم ہوتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے حالات سے متعلق حکیم احسن اللہ خاں کی یادداشتیں MEMOIRS ہیں جنہیں انہوں نے سر جان کے JHON KAYE کی خواہش پر قلمبند کیا تھا۔ جان کے نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا ہے جو انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کی طرف سے ۱۹۵۸ء میں یہ شایع ہوا ہے۔ معین الحق اس کے مرتب ہیں۔

حکیم صاحب شاعر بھی تھے۔ نساخ نے سخن شعرا میں ان کا نمونہ کلام پیش کیا ہے[۲]۔

علم اور اہل علم سے حکیم صاحب کا بڑا تعلق تھا، مشاہیر کی ان کے ہاں آمد و رفت رہتی تھی۔ نواب زین العابدین خاں عارف حکیم صاحب کے مکان سرکی والان میں جاتے رہتے تھے[۳]۔

خود ان کی سرکار سے بھی بہت سے صاحب کمال وابستہ تھے، شیخ ہدایت اللہ اور حافظ امام الدین جو ۱۸۵۷ء سے قبل انگریزی فوج میں رسالدار تھے، انگریزوں سے نفرت ہوئی تو ملازمت سے استعفیٰ دے کر چلے آئے۔ حکیم احسن اللہ خاں کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے تھے[۴]۔

۱؎ مرات الاشباہ ص ۱

۲؎ سخن شعرا ص ۱۴۱

۳؎ دہلی کی آخری شمع ص ۱۱

۴؎ دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۴۹

حکیم احسن اللہ خاں محض سلطنت کے انتظامی امور ہی نہیں انجام دیتے تھے۔ بادشاہ کے علاجی فرایض بھی ان سے متعلق تھے۔ وہ صبح بادشاہ کے برآمد ہونے پر ان کی نبض ملاحظہ کرنے[1] اور دریافت مزاج واحوال کرتے تھے[2] ارا کین خاندان شاہی اور بیگمات کا علاج بھی ان کے ذمہ تھا، ۴ جون ۱۸۴۷ کے روزنامچہ کے مطابق "بادشاہ نے حکیم احسن اللہ خاں سے ارشاد کیا کہ نواب عزیزآبادی بیگم کی طبیعت ناساز ہے دوسرے اطبا کے مشورے سے آپ ان کا علاج کریں"[3] ۱۸۵۷ میں ان کا کردار مشکوک رہا، جس سے ان کی شخصیت اور عظمت متاثر ہوئی۔ غلام رسول مہر نے لکھا ہے "حکیم احسن اللہ خاں کے ایک پروردہ نے ناجائز طریقوں سے روپیہ جمع کر لیا تھا۔ حکیم صاحب اس راز سے آگاہ تھے۔ پروردہ نے اپنی بد دیانتی کو پردہ اخفا میں رکھنے کی غرض سے یہ افواہ اڑادی کہ حکیم صاحب انگریزوں کے بہی خواہ ہیں اور ان کے لیے جاسوسی کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ باغی بگڑ گئے اور حکیم صاحب کے قتل کی نیت سے ان کے مکان پر چڑھ دوڑے۔ حسن اتفاق سے حکیم صاحب اس وقت قلعہ میں بادشاہ کے پاس موجود تھے، باغی قلعہ میں پہنچے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ خادم نواز بادشاہ نے اپنے آپ کو حکیم صاحب پر ڈال دیا اور اس طرح مظلوم کی جان بچائی۔ باغیوں نے حکیم صاحب کا سامان لوٹ لیا، مکان کو آگ لگادی۔ سارا مکان جل کر خاک ہوگیا، دیواریں دود آلود ہوگئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیواریں مکان کے ماتم میں سیاہ پوش ہیں[4]"

۱۸۵۷ کے ہنگامہ میں حکیم صاحب کو ہر قسم کا نقصان برداشت کرنا پڑا انگریزوں

---

[1] بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ ص ۷

[2] ایضاً ص ۱۷

[3] ایضاً ص ۲۰۲

[4] غالب ص ۲۵۸

کے بھی وہ معتوب رہے اور سلطان جی میں نظر بند کئے گئے[1] غالب کے خطوط سے کچھ اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھا ہے "حکیم احسن اللہ خاں کو ان کی حویلیاں مل گئی ہیں اب وہ مع قبایل ان مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں" حکیم غلام نجف خاں کے نام خط میں انہوں نے قدرے تفصیل سے کام لیا ہے "میاں تم کو مبارک ہو کہ حکیم پر سے وہ سپاہی جو ان کے اوپر متعین تھا، اٹھ گیا اور ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتہ میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔ چنانچہ وہ کچے باغ کے پچھواڑے مرزا جاگن کے مکان میں آ رہے ... جی ان کے دیکھنے کو چاہتا ہے، مگر از روئے احتیاط نہیں جا سکتا"[2] مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد دیسی ریاستوں نے ان کی پذیرائی کی۔ وہ جے پور مہاراجہ کے طبیب خاص ہو کر گئے، وہاں سے کبھی کبھی دہلی آیا کرتے تھے۔ غالب کے انتقال سے ایک روز پہلے ۱۴ فروری ۱۸۶۹ کو جب حالت بگڑی اور وہ بے ہوش ہوئے تو فوراً حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں کو اطلاع دی گئی، پھر ۱۵ فروری مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کو ان کے جنازہ میں بھی انہوں نے شرکت کی[3]

ریاست قرولی سے بھی حکیم صاحب کا تعلق رہا۔ وہاں سے سات سو روپیہ ماہوار پاتے تھے[4] رموز الاطبا کے مطابق وہ وہاں وزارت کے منصب پر فائز تھے[4] ریاست بھوپال میں اگرچہ نواب سکندر بیگم کے عہد میں یکم محرم ۱۲۸۰ھ / ۲۹ جون ۱۸۶۳ء کو طب یونانی سے متعلق ایک قانون جاری کیا گیا تھا، جس میں افسر الاطبا

---

[1] اردوئے معلیٰ غالب نمبر جلد ۲ ص ۴۱۴

[2] یادگار غالب ص ۱۰۰

[3] گنجینہ سلیمانی ص ۲۲۸ مرات الاشباہ ص ۲۵

[4] رموز الاطبا جلد ۲ ص ۴۲۰

کے اختیارات، طبیبوں کے فرایض اور دواسازی کے احکام تھے۔[1] لیکن میرا خیال ہے کہ نواب سکندر بیگم کی وفات ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء تک اس محکمہ کو ترقی نہیں دی جا سکی تھی اور افسر الاطبا کے عہدہ پر کسی کا تقرر عمل میں نہیں آیا تھا۔ یہ میں اس لیے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ حیات سکندری یا ریاست بھوپال کی کسی تاریخ میں نہ افسر الاطبا کے عہدہ پر فایز کسی طبیب کا نام ملتا ہے اور نہ حکیم احسن اللہ خاں کے بھوپال پہنچنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نواب سکندر بیگم کے طبیب خاص اور اس عہد کے ممتاز طبیبوں میں دوسرے اطبا کے نام لیے گئے ہیں۔ شروع ۱۸۶۹ء میں غالب کی وفات تک حکیم صاحب دہلی کے آس پاس جے پور اور قرولی میں نظر آتے ہیں۔ صاحبِ گنجینہ سلیمانی کا یہ بیان اور بھی کسی طرح درست نہیں کہ حکیم صاحب ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں بھوپال سے مستعفی ہو چکے تھے۔[2] بھوپال سے نکلنے والے عمدۃ الاخبار کا ۱۸۷۱ء کا فایل میرے پیش نظر ہے۔ اس کی اشاعتوں میں بھوپال سے مستعفی ہو کر ان کی بڑودہ روانگی کا حال درج ہے۔

"تصریح خبر روانگی عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزماں حکیم محمد احسن اللہ خاں صاحب تخمیناً چار ماہ گزری کہ حکیم صاحب موصوف کو نواب نور الدین حسن خاں صاحب کہ منجملہ اراکین اور جاگیر دار ریاست (بڑودہ) ہیں۔ تحریک و ترغیب اختیار روزگار اس سرکار کے تحریر کرتے تھے۔ اور حکیم صاحب کو جو حفظ آبرو زائد تر ہے اور جس ریاست میں حسب الطلب وہاں کے رئیس مثل قرولی و کوٹہ یا جس رئیس سے ملاقات ہوئی ہے مانند مہاراجہ صاحب بہادر والی گوالیار کہ دہلی میں انہوں نے حکیم صاحب کو بلایا تھا تو پہلے استفسار رعایت مراسم تعظیم و توقیر کیا۔ اس لیے پہنچنے میں کئی مہینے گزرے۔ عرصہ ایک مہینہ کا ہوا کہ ایک معتمد اس سرکار کا بھوپال

---

[1] حیات سکندری ص ۲۱۹

[2] گنجینہ سلیمانی ص ۲۲۸

میں آیا اور سب امور تنقیح طلب خصوصاً رعایت تعظیم و توقیر اور بروز دخول بڑودہ ادائی رسم استقبال وغیرہ وہاں سے سب لکھوا منگائے اور بابت رقم زاد راہ کے چند ہزار روپیہ اور نوشتہ تعداد تنخواہ بارہ سو روپیہ ماہوار کے تفویض کیا۔ چنانچہ ۱۸ ربیع الاول ۱۲۸۸ کو حکیم صاحب نے استعفائے روزگار اس سرکار کا بخدمت جناب رئیسہ معظمہ پیش کیا اور اس میں ایسی وجوہ موجہ لکھیں کہ جناب موصوفہ (شاہ جہاں بیگم) نے اس کو منظور فرمانا مناسب سمجھا اور کمال تاسف ان کی اجازت و روانگی پر فرمایا کس واسطے کہ عموماً ہر قسم کے مریضوں کو اور خصوصاً غربائی بیدرسنگاہ کو نسبت ان کی غایت توجہ بسوئی مرضائی غریب نہایت آسایش و آرام تھا۔ غرض کہ حکیم صاحب بتاریخ ۲۹ ربیع الاول (۱۲۸۸ھ) روانہ جانب اٹارسی مع احمال و اثقال ہوئے وہاں سے بسواری ریل بخط مستقیم بڑودہ کو تشریف لے جائیں گے[1]۔ تقویم کے حساب سے ۱۸ ربیع الاول کو ۷ جون اور ۲۹ ربیع الاول ۱۲۸۸ھ کو ۱۸ جون ۱۸۷۱ء تھا۔

رجب ۱۲۹۰ھ مطابق ستمبر ۱۸۷۳ء بڑودہ میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ نواب ضیاء الدین احمد نیر درخشاں (وفات ۱۸۸۵ء) نے "حکیم غریب" سے تاریخ وفات نکالی ہے ۔ "بود سال فوتش حکیم غریب"

نواب ضیاء الدین احمد نے سال ولادت اس مصرعہ سے نکالا تھا "سن مولدش بود لفظ غریب" (۱۲۱۲) سر ولیم بیل نے دہلی میں ان کے انتقال کا لکھا ہے[2] جو درست نہیں ہے۔ "وائی بقراط وقت مرد افسوس" سے بھی تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے[3]

---

[1] عمدۃ الاخبار جلد ا شمارہ ۲۶۵ ۲۸ جون ۱۸۷۱ء

[2] اورینٹل بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۴۵

[3] نزہۃ الخواطر جلد ۷ ص ۲۲ ۱

سید محمد علی جویا کا یہ پورا قطعہ اس طرح ہے ؎

احسن اللہ خاں طبیب اجل — جاں بجان آفریں سپرد افسوس
از دہان دل ایں صدا آمد — وای بقراط وقت مرد افسوس

مرزا فرحت اللہ بیگ نے حکیم صاحب کا نقشہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے "گورے چٹے تھے۔ سفید بھری ہوئی ڈاڑھی، گول چہرہ، اس میں کچھ کچھ چیچک کے داغ۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنتے تھے"[1]

حکیم صاحب حسن معالجہ اور درس میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ جہاں رہے درس کا سلسلہ جاری رہا۔ حکیم سید ابراہیم کے تذکرہ میں جو ہاپوڑ سے بھوپال پہنچ کر ملازم ہو گئے تھے۔ حکیم فیروز الدین نے تحریر کیا ہے "حکیم سید ابراہیم (ہاپوڑ) کو حکیم احسن اللہ خاں سے زمانہ قیام دہلی سے سلسلۂ تلمذ تھا۔ کیونکہ جب حکیم صاحب دہلی میں قیام پذیر تھے یا جب قرولی سے دہلی تشریف لاتے تھے تو یہ ان کے مطب میں شریک ہوتے تھے۔ ان کو حکیم صاحب کے بھوپال تشریف لانے کی نہایت خوشی ہوئی اور ان کی خدمت میں بعد فراغ امورات ملازمت حاضر ہو کر معالجات قانون اور شرح معالجات قانون حکیم علی گیلانی، تا معالجات حمیات پڑھی اور صبح شام مطب میں حاضر رہ کر نسخہ نویسی اور تشخیص امراض کرتے رہے۔ بالمرہ تا ہنگام قیام حکیم صاحب موصوف کے حلقہ درس میں جو طلبہ فن طب شریک ہوتے تھے ان کی تعلیم و تدریس بھی حکیم سید ابراہیم سے متعلق تھی، وہ پڑھایا کرتے تھے اور حکیم احسن اللہ خاں صاحب سنا کرتے تھے۔ تقریباً دو سال تک یہ مشغلہ اور صحبت رہی۔ اور حکیم صاحب موصوف نے ان کو غوامض و دقائق فن طب کے سکھلانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا"[2] حکیم احسن اللہ خاں کے بے شمار شاگردوں میں حکیم

---

[1] دہلی کی آخری شمع ص ۱۲

[2] رموز الاطبا جلد ۲ ص ۱۵۹

محمد بدر الدین خاں اور حکیم بلدیو سہائے میرٹھ مشہور ہیں۔ حکیم سید کرم حسین نجار ہ کو حکیم بلدیو سہائے سے تلمذ کی نسبت تھی۔

حکیم احسن اللہ خاں کی تصنیفی یادگاروں میں ایک احسن القرابادین ہے۔ یہ ان کے معمولات و مجربات کا بہترین مجموعہ ہے۔ کتب خانہ محل مہاراجہ جے پور، نواب صابر علی خاں نواب محمد گڑھ، ڈاکٹر عبدالمجید راجہ لاتل پور اور رضا لائبریری رامپور میں اس کے نسخے ہیں۔ نسخہ رامپور کی اہمیت یہ ہے کہ اس کا سال کتابت ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء ہے جو قرابادین کا سال تصنیف ہے۔ راقم الحروف کے ذخیرہ میں اس قرابادین کا ایک انتخاب محفوظ ہے۔[۱]

حکیم احسن اللہ خاں کو تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی۔ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء میں انہوں نے بدل بیگ خاں کی پرانی حویلی کو خرید اتھا۔ یہ بہت وسیع اور بڑی حویلی تھی۔ اسی سنہ میں انہوں نے اس کا دروازہ بنوایا تھا۔ غالب نے اس کے کتبہ کے لیے قطعۂ تاریخ لکھا تھا ؎

نہادہ بنا احسن اللہ خاں | سرراہ بدانساں در دلکشا
کہ غالب پئے سال تاریخ او | رقم زد در دلکشا حبذا

حکیم صاحب نے حویلی کے احاطہ میں ایک حمام تعمیر کرایا تھا۔ اس کے اندر سنگ مرمر کی تختی پر یہ کتبہ تھا، ھوالحکیم

مرتب گشت ایں حمام دلخواہ | بہ تعمیر فقیر احسن اللہ
محمد امیر رضوی

حمام کے باہر کی دیوار پر سنگ مرمر کا دوسرا کتبہ یہ تھا ؎

بدہلی احسن اللہ خاں بنا کرد | یکی گرمابۂ با قدسی نشیمن[۲]

---

[۱] علی گڑھ کے طبی مخطوطات ص ۴۴/۱۲۸۔

[۲] یکی گرمابۂ قدسی نشیمن۔ واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۲۰۰

پی سالش کہ یارب جاوداں باد	بفرق بانی خود سایہ افگن
نبشتم[1] روی لفظ آنگاہ گفتم	شدہ تعمیر این حمام احسن

۳۰ ۱۲۶۸ = ۳۰ - ۱۲۹۸

غالب نے بھی اس گرمابہ کی تاریخ بنا لکھی تھی ؎

احترام الدولہ فرمان داد تا	دلکشا گرمابۂ انجام یافت
بامداد ان رفت آں جا بہر غسل	آنکہ در گفتار غالب نام یافت
قطعہ تاریخ آں فرخ بنا	ہم در آنجا صورت ارقام یافت
شست با چوں "راحت و آرام" جست	ہر دو را در "گوشہ حمام" یافت

۳ ۶۰۹ ۲۴۲ ۴۲۰

گوشہ حمام کے اعداد ۴۲۰ میں راحت کے ۶۰۹ اور آرام کے ۲۴۲ جمع کرنے پر ۱۲۷۱ ہوئے اس میں "با" کے ۳ عدد کم کر کے ۱۲۶۸ھ سال تعمیر برآمد کیا ہے۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ سے متصل حکیم صاحب نے ایک خوشنما مسجد اور حویلی بنوائی تھی، ان پر یہ کتبے نصب تھے۔

تاریخ مسجد

مسجدی ساخت چوں بحسن عمل	احسن اللہ خاں پاک سرشت
اے ظفر بہر سال تاریخش	خامہ ام "خانہ خدا" بنوشت

۱۲۶۱ھ

تاریخ مکان

از سال بنائے نو بدرگاہ	ہیر خردم نمود آگاہ
برداشت سراز دیار دہلی	تعمیر فقیر احسن اللہ

۱۲۶۳ھ

سید نے آثار الصنادید میں اور بشیر الدین احمد نے واقعات دار الحکومت دہلی میں

---

[1] بشتم۔ واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۲۰

مسجد اور مکان کی تصویریں دی ہیں۔[1]

حکیم غلام نجف خاں

حکیم غلام نجف خاں فاروقی خاندان سے تھے سلسلہ نسب بابا فرید الدین گنج شکر سے ملتا ہے۔ ان کے اجداد میں شیخ قطب الدین حضرت شیخ سلیم چشتی کے پوتے تھے۔[2] مؤلف اقبال نامہ جہانگیری نے انہیں شیخ سلیم چشتی کا دختر زادہ لکھا ہے۔

شیخ قطب الدین کا شمار اکبر کے امرا میں تھا، جہانگیر سے انہیں خاص تعلق رہا۔ جہانگیر کو ان کی والدہ نے ایام طفولیت میں پرورش کیا تھا۔ جس کی وجہ سے جہانگیر ان سے بھائیوں کی طرح محبت کرتا تھا۔ جہانگیر نے اکبر سے روگردانی کے زمانہ میں بعض مقامات پر قبضہ کر کے اپنے آدمیوں کو ان کا انتظام سونپا تھا۔ شیخ قطب الدین کو صوبہ بہار کا صوبیدار مقرر کیا تھا۔[3] جہانگیر نے اپنے دور فرمانروائی میں انہیں پنج ہزاری منصب اور بنگال و اڑیسہ کی امارت عطا کی۔ شیخ قطب الدین کی والدہ کے انتقال پر جہانگیر نے ان کی نعش کو کندھا دیا اور کئی دن کھانا نہیں کھایا اور کپڑے بھی نہیں بدلے۔[4]

جہانگیر کو جب شیر افگن کے باغیانہ طرز کی اطلاع ملی تو شیخ قطب الدین کو بنگال کا حاکم بنا کر بھیجا۔ بردوان میں شیر افگن ان سے ملنے آیا اور موقع ملتے ہی ان پر تلوار کے

---

[1] آثار الصنادید ص ۳۵۷ و واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۲۸۸ و ۲۸۹

[2] نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۳۶۳

[3] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۴۸ ۳ / بحوالہ تاریخ ہند ذکاء اللہ جلد ۶ ص ۵

[4] تزک جہانگیری ص ۴۱

دار کئے اور یہ جان بحق ہوئے[1]

شیخ قطب الدین کے بیٹے شیخ محمد فرید المخاطب محتشم خاں عہد جہانگیری و شاہجہانی کے امرا میں تھے۔ جہانگیر نے پنج ہزاری منصب ذات اور پنج ہزاری سوار عطا کیا تھا چار ہزار بیگھہ اراضی موضع مولیا میں دی تھی۔ وہاں انہوں نے ایک قلعہ کی بنیاد ڈالی اور جہانگیر کے نام پر شیخو پورہ اس جگہ کا نام رکھا[2] یہ ضلع بدایوں میں ہے شیخ فرید کا شیخوپورہ ہی میں انتقال ہوا۔

حکیم غلام نجف خاں کے والد کا نام حافظ محمد مسیح الدین تھا۔ یہ اوایل عمری میں فوت ہوئے۔ صاحب مراۃ الاشباہ نے انہیں بھی طبیب لکھا ہے[3]

غلام نجف خاں اپنے خالو میر سید علی کے ساتھ پانچ برس کی عمر میں دہلی آ گئے۔ میر سید علی سرکار انگریزی میں تحصیلدار اور آخر میں گورنر جنرل کے میر منشی ہوئے۔

غلام نجف خاں نے فن طب کی تحصیل حکیم صادق علی خاں ابن حکیم محمد شریف خاں سے کی اور مشق نسخہ نویسی و علاج معالجہ حکیم احسن اللہ خاں کی خدمت میں بہم پہنچائی۔ حکیم احسن اللہ خاں سے قرابت قریبہ بھی تھی اور حکیم احسن اللہ خاں کی بہن ان سے منسوب تھیں۔ ان کی تعلیم میں احسن اللہ خاں نے کمال کوشش کی یہاں تک کہ یہ دہلی کے مشاہیر اطبا سے ہو گئے۔ بہادر شاہ نے عضد الدولہ اعتماد الملک کا خطاب دیا۔ کمپنی کی حکومت قائم ہونے پر عہدہ طبابت پر مامور رہے اور اعزاز و اکرام برقرار رہا۔ قدرت نے ید دست شفا پایا تھا کہ وہ امراض جو لا علاج سمجھے جاتے تھے ان کی توجہ سے زایل ہو جاتے تھے[4] ۱۸ جون ۱۸۴۷ کے روزنامچہ کے مطابق مرزا مظفر بہادر کی

---

[1] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۳۰۵ بحوالہ اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۷

[2] واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۱۸۳

[3] مرات الاشباہ ص ۶۷

[4] آثار الصنادید ص ۱۵۰ و ۱۵۱ واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۲۰۶

مختاری کا عہدہ حکیم غلام نجف خاں کو مرحمت کیا گیا، اور ان کو خلعت پنج پارچہ اور سہ رقم جواہر حضور انور کی طرف سے عطا کیا گیا[1]

مرزا غالب سے حکیم صاحب کا مہر و محبت کا رشتہ تھا۔ غالب کے متعدد خطوط ان کے نام ہیں ایک خط میں غالب نے ان سے کسی کی سفارش کرتے ہوتے لکھا ہے "حکیم غلام نجف خاں سنو اگر تم نے مجھے بنایا ہے یعنی اسناد اور باپ کہتے ہو، یہ امر ہے از روئے تمسخر تو خیر، اور اگر از روئے اعتقاد ہے تو میری عرض مانو اور ہیرا سنگھ کی تقصیر معاف کرو۔ بھائی انصاف کرو اس نے حکیم احسن اللہ خاں سے رجوع کی اور وہ تمہارے بھائی بھی ہیں اور تم کو ان سے استفادہ بھی ہے۔ اگر گھبرا کر حکیم محمود خاں کے پاس گیا تو ان کے باپ (حکیم صادق علی خاں) سے تم کو نسبت تلمذ ہے، ابتدا میں ان سے پڑھے ہو۔ پس یہ غریب سوائے تمہارے اگر گیا تو تمہارے ہی علاقہ میں گیا۔ وہ بھی گھبرا کر اور خفقان سے تنگ آکر۔ اب جو حاضر ہوتا ہے تو لازم ہے کہ اس پر بہ نسبت سابق توجہ زیادہ فرماؤ اور بدل اس کا معالجہ کرو۔ الطاف کا طالب غالب۔"[2]
غلام نجف خاں کا دہلی میں انتقال ہوا۔ قدم شریف میں دفن ہیں۔

حکیم رکن الدین خاں

رکن الدولہ حاذق الملک حکیم رکن الدین خاں بہادر دہلی کے ممتاز اور صاحب اثر لوگوں میں تھے۔ اور شاہی خطاب کا اعزاز رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو میں خاص کر فارسی میں شعر کہتے تھے۔ مرزا سنگین بیگ نے در بہ خرد میں ان کی حویلی کا ذکر کیا ہے[3]

---

[1] ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ ص ۲۰۵
[2] یادگار شعرا ص ۸۶ (بحوالہ تذکرہ ذکا)
[3] سیر المنازل ص ۴۰

حکیم مرزا رحیم بیگ رحیم

حکیم مرزا رحیم بیگ رحیم شاہجہاں آبادی ولد مرزا امیر بیگ نے ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں میرٹھ پہنچ کر حکمت مآب کمالات انتساب حکیم بوعلی خاں کی خدمت میں تحصیل طب کی حکیم صاحب نے اہلیت ذاتی پر نظر کر کے فرزندی میں لیا اور شفقت پدرانہ ان کے حال پر کی۔ محمد بخش ناداں کے شعر و سخن میں شاگرد تھے پہلے شرر تخلص تھا بعد میں رحیم اختیار کیا۔ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں حسب فرمایش حکیم احسن اللہ خاں قصص الانبیا کو نظم کیا تھا[1] شعر و سخن کا مذاق شستہ تھا، فارسی شعر بھی خوب کہتے تھے۔ آخر میں سردھنہ میں قیام رہا[2]

حکیم عبداللہ خاں منتظر

حکیم خواجہ عبداللہ خاں محمدی خاں کے بھتیجے تھے۔ دہلی کے کامیاب طبیبوں میں گنے جاتے تھے۔ منتظر تخلص تھا۔ سکتہ کے عارضہ میں انتقال ہوا[3]

حکیم سکھانند رقم

حکیم سکھانند صاحب پایہ ارجمند دہلی کے کالیتھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

---

[1] گلستان سخن ص ۲۴۱

[2] خمخانہ جاوید جلد ۳ ص ۳۷۴

[3] یادگار شعرا ص ۱۶۷ (بحوالہ شورش)

محلہ دھرم پورہ میں سراؤگیوں کے بڑے مندر کے قریب رہتے تھے۔ فضیلت علمی کے ساتھ شعر بھی عمدہ کہتے تھے۔ فن طبابت میں وحید العصر اور صناعت شعر میں شاہ نصیر سے مستفید تھے۔[1]

مرض کی تشخیص کا یہ عالم تھا کہ صورت دیکھ کر مرض کو دریافت کرتے تھے۔ ایام ضعیفی تک فارغ البالی سے زندگی بسر کرتے رہے۔ علم نجوم اور رمل میں بھی عمدہ مہارت تھی۔ اس فن کو حکیم مومن خاں سے کسب کیا تھا، کتب درسیہ فارسی و عربی مختلف اساتذہ سے پڑھیں اور مدت تک طالبان کمال کو پڑھائیں، حق پسند و حق شناس، وجاہت ظاہری و باطنی سے پیراستہ تھے۔ وضع ایسی رکھتے تھے کہ خاص و عام کی نظروں میں ادب و احترام قائم کرتی تھی۔ خوش پوشاک، خوش وضع، خوش اخلاق، ظریف الطبع اور شکیل آدمی تھے۔ اپنے استاد مومن خاں کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا باپ کا کرتا ہے[2] ان کمالات پر مزاج میں مسکینی بہت تھی۔ ہر فرد بشر کے ساتھ خلوص سے پیش آتے تھے۔

بعد ایام غدر بسبب دلشکنی و مایوسی امور دنیوی دست بردار ہو گئے تھے، خانہ نشینی اختیار کی تھی البتہ مطب جاری تھا، ۶۳ برس کی عمر میں ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء انتقال کیا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور خوب پڑھتے تھے۔ دیوان نوعدر میں تلف ہو گیا تھا مگر صدہا کاغذات پر ان کا کلام ان کے بیٹے کے پاس موجود تھا[3]

حکیم سکھانند کے ہاں شعرا اور اہل علم کی آمد و رفت رہتی تھی۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ انہوں نے لالہ گھنشیام داس عاصی کو جو شاہ نصیر کے شاگرد تھے دلی میں سکھانند کے مکان پر دیکھا تھا[4]

---

[1] گلستان سخن ص ۲۴۷ سخن شعرا ص ۱۹۰

[2] دہلی کی آخری شمع ص ۳۱

[3] خمخانۂ جاوید جلد ۳ ص ۴۹۴ ۔ [4] آب حیات ص ۴۶۰

حکیم امیر سنگھ

حکیم سکھانند کے پوتے تھے۔ ان کا شمار دہلی کے نامور طبیبوں میں تھا۔ یہ مدرسہ طبیہ کے پہلے ہندو سند یافتہ اور حکیم عبدالمجید خاں کے رشید تلامذہ میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے آبائی مطب کی جانشینی کے فرائض انجام دیئے۔[1]

حکیم سید منور علی آشفتہ

حکیم سید منور علی خلف سید علی نواز رضوی دہلی میں پیدا ہوئے۔ فن طب میں دست بلند اور پایہ عالی رکھتے تھے، بلند فکر تھے۔[2] اس فن میں انہیں حکیم غلام حیدر خاں سے جو مشاہیر اعیان دہلی میں تھے۔ استفادہ کا موقع ملا تھا۔[3]
باطن اور کریم الدین نے بھی طب میں ان کی اچھی مہارت کا ذکر کیا ہے۔[4] فن شعر میں شیفتہ کے علاوہ مومن سے بھی تلمذ تھا، تخلص کی تاثیر سے آشفتہ مزاج اور شوریدہ طبع تھے۔ مزاج میں پیدائشی طور پر بے باکی تھی۔ نہایت ذکی و فہیم اور فن سخن سے قدرتی مناسبت رکھتے تھے، ان کی طبیعت کی رسائی، فکر کی استقامت اور ذہن کی تیزی کی سبھی نے تعریف کی ہے۔[5] کریم الدین سے ۱۸۴۶ء میں میرٹھ میں ملاقات

---

[1] خمخانہ جاوید جلد ۳ ص ۴۹۵

[2] بزم سخن ص ۲۱

[3] گلشن بے خار ص ۱۴

[4] گلستان بے خزاں ص ۱۰ طبقات شعرائے ہند ص ۳۵۸

[5] گلستان سخن ص ۱۲۲

ہوئی تھی اس نے ان کو بہت ذی ہوش اور عقلمند لکھا ہے اور چالیس برس کے قریب عمر بیان کی ہے[1] صاحب خم خانہ جاوید کے مطابق ۱۸۰۸ء کے آس پاس یہ پیدا ہوتے تھے[2] اسپرنگر کی تالیف کے وقت یہ زندہ تھے۔ میرٹھ میں رہ رہے تھے[3] اور سررشتہ دار کے عہدہ پر فائز تھے[4]

حکیم عبدالکریم سوز

امام بخش صہبائی کے بیٹے تھے۔ پدر بزرگوار سے کتب درسی فارسی کی تحصیل کی۔ اس کے بعد علوم عربیہ کو تحقیق اور دقت نظر سے پڑھ کر طب کی تکمیل کی، اور دہلی میں طبیب اور شاعر کی حیثیت سے شہرت پائی[5] گلستان سخن میں سوز کے متعدد شاگردوں کا تذکرہ ہے۔ ان کے شاگردوں میں محمد یعقوب تبسم (گلستان سخن ص ۲۵۷)، میر قطب علی تعلی دہلوی (سخن شعرا ص ۳۳۵)، رحیم بخش طرب (ایضاً ص ۳۰۴) حکیم مرزا رضا قلی آشفتہ (ایضاً ص ۲۸) ابن حکیم محمد شفیع اکبرآبادی) فردوس علی خلش (سخن شعرا ص ۵۰) وغیرہ ہیں۔

حکیم اکرام الدین رند

حکیم عبدالکریم سوز خلف امام بخش صہبائی کے ماموں زاد بھائی تھے۔ سوز

---

[1] طبقات شعرائے ہند ص ۳۵۸

[2] خمخانہ جاوید جلد ا ص ۷۲

[3] یادگار شعرا ص ۱۶

[4] سخن شعرا ص ۲۹ [5] گلستان سخن ص ۲۶۹

سے ہی تلمذ تھا۔ طب میں دخل رکھتے تھے۔ ایام غدر میں جوان قضا کر گئے۔[۱]

حکیم محمد عبد الحکیم بسمل

جالینوس زماں بقراط دوراں حکیم پیر بخش کے بیٹے اور فاضل عصر امام بخش صہبائی کے بھتیجے تھے[۲] فارسی میں ملکہ حاصل تھا۔ کامل طبیب تھے، مرزا قادر بخش صابر نے انہیں وجیہہ، خوش قیافہ، فصیح زبان، پاک طینت اور صاف دل لکھا ہے۔ اور ان کے کلام میں خوبی معنی، خوش اسلوب تراکیب اور حسن استعارہ کی تعریف کی ہے[۳] صاحب بزم سخن کے مطابق معتبر شاعر تھے، کلام پختہ تھا، فن طب اور حکمت میں دخل رکھتے تھے[۴]

حکیم غلام حسین بیدل

حکیم خواجہ غلام حسین بیدل خلف حکیم خواجہ محمدی خاں نبیرہ خواجہ رحمت اللہ خاں باطن حکیم زادہ ہونے کی وجہ سے طب سے طبعی مناسبت تھی۔ غدر کے بعد چند سال تک دہلی میں مطب کرتے رہے، شاعری میں عبد الرحمن خاں احسان کے شاگرد تھے[۵] کلام کے دیکھنے سے طبیعت کی پختگی اور مشاقی کا پتہ چلتا ہے[۶]

---

[۱] خمخانہ جاوید جلد ۲ ص ۵۱۷

[۲] سخن شعرا ص ۶۶

[۳] گلستان سخن ص ۱۵۰ [۴] بزم سخن ص ۳۸

[۵] گلستان سخن ص ۶۰؛ نساخ نے خواجہ رحمت اللہ کا تخلص ناطق لکھا ہے (سخن شعرا ص ۷۵)

[۶] خمخانہ جاوید جلد ۱ ص ۷۱۰

حکیم میر علی جان

حکیم میر علی جان اپنے زمانہ میں دہلی کے ممتاز طبیبوں میں تھے۔ ان کے والد حکیم مہتاب خاں کا شمار بھی اچھے طبیبوں میں تھا۔ حکیم میر جان کے بیٹے میر نصیر الدین عرف میر نواب بشیر بن سخن تھے۔ نواب تخلص تھا۔ ناسخ سے شاگردی کا افتخار رکھتے تھے آخر میں بنارس قیام رہا[1]

حکیم محمد احسن خاں احسن

حکیم محمد احسن خاں حکیم محمد حسن خاں کے بیٹے اور دہلی کے نامور اطبا میں تھے۔ مرزا قربان علی بیگ سالک کے شاگردوں میں درجہ اختصاص رکھتے تھے، عین جوانی میں ۱۸۷۲ء میں انتقال کیا[2] ان کے بھائی حکیم محمد محسن خاں بھی طبیب تھے۔ یہ بھی جوانی میں رخصت ہوئے۔

حکیم میر اکبر علی فروغ

میر شمس الدین فقیر کے شاگرد تھے، طب اور نجوم میں بہت دخل تھا[3]، ہیئت میں بھی اچھی استعداد تھی، اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے[4]

---

[1] سخن شعرا ص ۵۳۳ [2] خمخانہ جاوید جلد ۱ ص ۱۷۳

[3] یادگار شعرا ص ۴۴ (بحوالہ علی ابراہیم و عشقی)

[4] طبقات شعرائے ہند ص ۳۰۹ سخن شعرا ص ۳۶۶

حکیم شیخ رحیم بخش طربؔ

رحیم بخش طربؔ شیخ نور محمد تھانیسری کے نواسہ تھے۔ فارسی کتابیں امام بخش صہبائی سے پڑھی تھیں۔ فن شعر میں حکیم عبدالکریم سوزؔ سے تلمذ تھا۔ غدر کے بعد زندہ تھے اور طبابت کے ذریعہ بسر اوقات کرتے تھے۔ ڈیوڑھی صاحبہ محل میں ان کی طرف سے بزم مشاعرہ بھی منعقد ہوا کرتی تھی۔[1]

حکیم مرزا محمد علی بیگ عاقلؔ

حکیم صاحب قادر الکلام شاعر اور مضمون آفرینی اور لطف زبان میں مشاق تھے۔ ان کا دیوان معصوم علی خاں سوختہؔ نایب تحصیلدار علی گڑھ کی حسب فرمایش آگرہ میں چھپا تھا۔ ایک واسوخت بھی ان کی یادگار ہے۔[2]

حکیم غلام علی حیدریؔ

حکیم غلام علی حیدریؔ معروف بہ شیخ جمعہ دہلی کے باشندہ تھے آخر میں پٹنہ چلے گئے تھے۔ شعر و شاعری کا سلسلہ رہتا تھا[3] عشقیؔ نے انہیں اچھا طبیب بنایا ہے اور حسین آباد میں قیام کا لکھا ہے۔[4]

---

[1] خمخانہ جاوید جلد ۵ ص ۱۴۱۴ [2] ایضاً جلد ۵ ص ۵۵۴
[3] یادگار شعرا ص ۶۶ (بحوالہ علی ابراہیم)
[4] ایضاً ص ۶۶ بحوالہ (تذکرہ عشقی)

حکیم مولوی عبد القادر

حکیم مولوی عبد القادر مولوی عبد الخالق کے بڑے صاحبزادہ اور دہلی کے مشاہیر میں تھے ان کے چھوٹے بھائی مولوی عبد الرب جامع مسجد سہارنپور۔ کے بانی ہیں۔ مولوی عبد القادر محلات شاہی کے امام اور بیگم ولی عہد کے استاد تھے۔ قلعہ میں بڑی عزت تھی۔ طبیب تھے۔ علم طب باقاعدہ پڑھا تھا۔ لیکن مطب نہیں کرتے تھے۔ یوں علاج معالجہ سے انکار بھی نہ تھا۔ مولوی عبد الحامد خان بہادر ڈپٹی کلکٹر ان کے بیٹے اور شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد ان کے داماد تھے[1]

حکیم حسام الدین

۱۸۵۷ کے بعد حکیم ذکاء اللہ خاں کے صاحبزادہ حکیم حسام الدین عرف منجھلے صاحب نے خاندان کا نام روشن کیا۔ اور نہ صرف دہلی بلکہ اطراف و جوانب ہند میں اپنی خداداد قابلیت کا سکہ بٹھایا۔ انہوں نے بھی فن طب میں متعدد گراں قدر تصانیف چھوڑیں، جو طالبان فن کے لیے چراغ راہ ثابت ہوئیں[2]

مرات الاشباہ کے آخر میں چند طبیبوں کے احوال درج ہیں اس میں حکیم حسام الدین کو حکیم نجف بخش خاں کا خلف لکھا ہے جو درست نہیں ہے ... رنگ طبیب با فرہنگ فلاطون زماں حکیم حسام الدین خاں عرف حکیم منجھلے صاحب خلف الصدق حکیم نجف بخش خاں مرحوم و مغفور یہ صاحب نبض شناسی میں یگانہ

---

[1] واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۴۱۳

[2] واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۱۸۷

اور مرض دانی میں مشہور زمانہ ہیں۔ بیشتر علاج آنکھوں کا کرتے ہیں۔ نابینا کو چشم زدن میں بینا کرتے ہیں۔ گل نرگس ان سے چارہ یرقان چاہے تو بجا ہے اور صنوبر علاج خفقان کے واسطے ان سے رجوع لائے تو زیبا ہے"[1]

حکیم صاحب خاندان بقائی کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے آنکھوں کے علاج میں شہرت پائی۔ اور یہ روایت بعد میں ان کے خاندان کا طرۂ امتیاز بنی۔

حکیم حسام الدین دہلی میں فنی اور رفاہی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ پندرہ روزہ مرقع تہذیب لکھنؤ کی ۱۵ نومبر ۱۸۷۳ء کی اشاعت کے مطابق "دہلی میں حکیم محمود خاں اور حکیم حسام الدین صاحب حکمائے یونانی نے غربا کی تیمار داری کے واسطے چار دوکانیں عطار کی مقرر فرمائی ہیں۔ یہاں سے غربا کو دوا مفت ملا کرے گی"[2]

حکیم اسد علی خاں

حکیم ذکاء اللہ کے صاحبزادہ اور ذی علم طبیب تھے۔ ان کے مطب میں مریضوں کا اس قدر مجمع ہوتا تھا کہ طلبہ تشخیص و نسخہ نویسی کے لیے اس میں حاضر رہتے تھے اور انہیں وہاں عملی مشق کا موقع ملتا تھا۔ دہلی کے مشہور طبیب حکیم بدرالدین خاں کے متعلق ملتا ہے کہ انہوں نے تین برس ان کے مطب میں استفادہ کیا[3]۔ ان کے صاحبزادہ حکیم یوسف حسین خاں صاحب درس و افادہ تھے، حکیم بدرالدین نے ان سے قانونچہ پڑھا تھا[4]۔ اپنے زمانہ میں حکیم یوسف حسین خاں اور ان کے

---

[1] مرات الاشباہ ص ۶۷ [2] تاریخ صحافت جلد ۲ ص ۵۰۲

[3] امتحان الالبا لکافۃ الاطبا ص ۲۸۱

[4] ایضاً ص ۲۱۹

بھائی حکیم شجاعت علی خاں، خاندانی بقائی کے ممتاز طبیبوں میں گنے جاتے تھے۔
حکیم محمد یوسف حسین خاں کے شاگردوں میں حکیم جمشید علی خاں اختر (بجے پور)
قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے حکیم محمد سلیم خاں اور حکیم بدرالدین خاں سے بھی استفادہ
کیا تھا۔[1]

حکیم مرزا منور علی خاں

حکیم مرزا منور علی خاں کے جد امجد نواب علی مردان خاں رئیس قندھار شاہجہاں
کی دعوت پر ہندوستان آئے، شاہ جہاں کے حکم سے دارا شکوہ نے ایک
لاکھ روپیہ ان کے اوپر سے نچھاور کیا۔ ان کے ساتھ تین ہزار پیشہ ور اور اہل ہنر
اور ڈیڑھ سو علما آئے، انہی دستکاروں کے ہاتھوں جامع مسجد دہلی اور تاج محل کی
تعمیر ہوئی۔ ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں نواب علی مردان خاں جب دہلی پہنچے تو بادشاہ نے
نیم قد ہو کر مصافحہ کیا۔ ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار منصب تھا۔ ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء میں
شاہ جہاں نے دہلی میں ان کے مکان پر قدم رنجہ فرمایا تھا۔ علم نجوم کے ماہر تھے۔ ان کی
کتاب الشمس والقمر کا مخطوطہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔

حکیم مرزا منور علی خاں کے والد مرزا اشہوار خاں معتمد الملک ثابت جنگ تھے۔
حکیم صاحب نے فارسی کتب امام بخش صہبائی سے اور عربی درسیات مولانا فضل
خیر آبادی سے پڑھی تھیں۔ طب میں حکیم احسن اللہ خاں کے شاگرد تھے، اور وہ
ان پر خاص توجہ فرماتے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں جب شاہی معالجہ میں مصروف
ہوتے تو دار الشفا کا مطب ان کے اور حکیم غلام نجف خاں کے سپرد کرتے تھے۔

حکیم مرزا منور بڑے ذہین و ذکی تھے۔ حکیم محمد سلیم خاں داروغہ تبر سے بہت

---

[1] رموز حکمت ص ۶۵

دوستی تھی۔ انہوں نے ایک روز کسی مریض کا قارورہ ان کے معائنہ کے لیے بھیجا اور حامل قارورہ سے کہا کہ مریض کا کوئی حال نہ بتانا۔ حکیم صاحب نے قارورہ پر نظر ڈالی اور کہا کہ اس عورت کو اسقاط ہوا ہے اور کزاز کا اندیشہ ہے، چنانچہ دوسرے روز کزاز ہوگیا اور پانچ گھنٹے بعد وہ عورت فوت ہوگئی۔

حکیم صاحب ۱۸۵۷ء کے بعد جے پور چلے گئے تھے۔ مہاراجہ سوائی جے سنگھ نے بکمدان فوج مقرر کر دیا تھا۔ اس ذمہ داری کے ساتھ مطب کا سلسلہ برابر جاری تھا۔[1] جے پور منتقلی میں غالباً حکیم محمد سلیم خاں سے تعلق کو دخل تھا، جنہیں جے پور میں مہاراجہ کے ہاں بڑا مرتبہ اور اعزاز حاصل تھا۔ ۱۳۰۷ھ ۱۸۸۹ء کو فوت ہوئے[2]

حق آگاہ و حق جو و حق گو و حق داں	محمد منور علی خاں بکمدان
چو فرمود رحلت ازیں دار فانی	سوئے گلشن قدس اللہ گویان
شنیدم اختر کہ میگفت ہاتف	منور علی خاں مقبول یزدان

حکیم احمد علی احمدؔ

دہلی کالج میں فارسی کے استاد اور دہلی کے مشہور طبیب تھے۔ مرزا قادر بخش صابر کے مطابق ''ہر چند جمیع علوم میں دستگاہ تام ہے لیکن فن طبابت میں ید طولیٰ اور تشخیص امراض میں حدس صائب ایسے کہ بیماری نرگس کی علت اور سوسن کی گونگی زبان کا سبب دریافت کرنا ایک کار سہل ہے، سوائے تکمیل مدارج علمی کے اخلاق پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ اس طرح اس مجمع کمالات کی ذات میں فراہم ہیں کہ کتب اخلاق اگر تمام عالم سے محو ہو جائیں اس کی گفتار و کردار سے ہر کتاب کے بدلے

---

[1] دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۱۲۰

[2] رموز الاطبا جلد ۲ ص ۴۲۱

ایک اور کتب خانہ متن و شرح کا بہم ہو سکتا ہے، گاہ گاہ فکر شعر بھی دامنگیر ہے[۱] اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کرتے تھے۔ چشمہ فیض کے نام سے اردو کی قواعد پر ایک کتاب لکھی تھی[۲]

حکیم سید محمد سعید خنجر

حکیم سید محمد سعید، سید عبدالمجید کے بیٹے تھے، قدیم وطن دہلی تھا۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی چھوڑ کر قصبہ لونی جو دہلی سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر ہے سکونت اختیار کرنی پڑی۔ ننھیال سکندر آباد تھا، وہاں عربی فارسی کی تعلیم پانے کے بعد فن طب کی تحصیل کی۔ طب میں مہارت حاصل کر کے سکندر آباد ہی میں مطب کرتے رہے۔

شاعری میں اپنے ماموں قاضی غیاث الدین خورشید سے مشورہ کرتے تھے۔ چند ناول بھی لکھے جو جہاں نما اور دیگر اخبارات میں ہفتہ وار شایع ہوتے۔ رسالہ بد بیضا کے کئی برس اڈیٹر رہے ان کے شاگردوں میں قمر سکندر آبادی اور وحشت شاہ جہاں پوری صاحب دیوان تھے[۳]

حکیم غلام محمود خاں

حکیم محمود خاں اخلاق حمیدہ کی تصویر، شرافت و نجابت کا مجسمہ، فخر شہر، فرشتہ خصال۔ جب دلی کا جہاز تباہی میں آیا ہوا تھا، جب سیلاب بلا، گرداب فنا کے بھنور ...

---

[۱] گلستان سخن ص ۱۳۵

[۲] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۸۹

[۳] خمخانہ جاوید جلد ۳ ص ۵۵

نے اس بیڑے کے ٹکڑے اڑا دیئے تھے۔ اس کا ایک ایک تختہ نذر امواج حوادث تھا۔ کسی کو بھی کسی کا سہارا نہ تھا۔ ناخدا ہمت ہار چکے تھے، ملاحوں کو اپنی پڑی تھی۔ یہ کوہ راسخ مرد میدان جودی پہاڑ پر تھا۔ نوح بھی کشتی بھی تھا، ملاح بھی۔ بے ٹھکانوں کا ٹھکانا، بے سہاروں کا سہارا۔ دلی کی مٹتی ہوئی تہذیب کی امٹ یادگار، جب دلی میں غدر پڑ رہا تھا، اس شہر کو مصیبتوں نے گھیر رکھا تھا، زمانہ دلی والوں کا دشمن تھا، سر چھپانے کو بھی انہیں کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ اس وقت اس مرد شریف نے ان پر وہ احسانات کئے ہیں جن کے حق سے دلی والے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔[1]

حکیم محمود خاں کے بھائی حکیم غلام مرتضیٰ خاں پٹیالہ سے وابستہ تھے اور خود حکیم محمود خاں ریاست جند سے منسلک تھے۔ انگریزوں کے دہلی پر قبضہ کے وقت ان ریاستوں کی فوجیں ان کے ساتھ تھیں، ان کے فرمانرواؤں نے انگریزوں سے وعدہ لیا تھا کہ شریف منزل کی حفاظت کی جائے گی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے لرزہ خیز مناظر حکیم محمود خاں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے طوائف الملوکی کے اس دور میں انہوں نے عوام کے ساتھ بڑی ہمدردی کا برتاؤ کیا۔ معمولی شبہ میں لوگ پکڑ لیے جاتے تھے اور ان کی جائداد اور مال واسباب ضبط کر لیا جاتا تھا، مہاراجہ پٹیالہ کی فوج کی وجہ سے شریف منزل دلی کے مظلوم باشندوں کی جائے پناہ تھی، لاکھوں کی امانتیں بھی حکیم محمود خاں کے پاس جمع ہو گئی تھیں جن کو امن ہونے کے بعد نہایت دیانت داری کے ساتھ انہوں نے مالکوں کے حوالہ کیا، حکومت کو اطلاعات مل رہی تھیں کہ ان کے ہاں بڑی تعداد میں لوگ چھپے ہوتے ہیں ممکن ہے ان میں کچھ باغی بھی ہوں۔ اس نازک وقت میں کسی کے ساتھ رعایت ممکن نہ تھی۔ حکیم محمود خاں کو بھی گرفتار کیا گیا۔[2]

---

[1] دلی کا سنبھالا ص ۳۱ و ۳۲

[2] اجمل خاں ص ۱۲۵

۲ فروری ۱۸۵۸ء کو حاکم شہر چند سپاہیوں کے ساتھ آیا اور حکیم محمود خاں کو جن کی موجودگی سے لوگوں کو بڑا سہارا تھا. دوسرے ساٹھ آدمیوں سمیت اپنے ساتھ لے گیا. لیکن آبرو والوں کی آبرو کا بھی خیال رکھا گیا حکیم محمود خاں اور چند دوسرے معززین کو تین روز کے بعد جانے کی اجازت مل گئی. چند آدمی ایک ہفتہ کے بعد رہا ہوئے اور اپریل ۱۸۵۸ء میں باقی لوگ بھی چھوڑ دیے گئے[1]

حکیم محمود خاں اپنے خاندانی علمی اور طبی کمالات اور باطنی خوبیوں کے سبب تمام ہندوستان میں مشہور اور ہر دلعزیز تھے، انہوں نے شریف منزل کی شہرت کو سابقہ نشان سے باقی رکھا، دور دور سے لوگ علاج کے لیے آتے اور شفایاب ہوکر واپس جاتے. انہوں نے ایسی قابلیت سے خاندانی مطب سنبھالا اور حذاقت و مہارت فن کے وہ معجزے دکھائے کہ غیر ملکی حکومت کے عروج و اقبال کے زمانہ میں طب یونانی کا چراغ روشن رہا. وہ جامع معقول و منقول، حاوی فروع و اصول اور نبض شناسی اور مرض دانی میں بے عدیل و بے نظیر تھے[2]

حکیم صاحب کی پیدائش ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء کو ہوئی تھی، اپنے والد اور خاندان کے بزرگوں سے طب کی کتابیں پڑھیں، ان کی تصانیف میں ضیاء الابصار، کارنامہ عشرت اور قانون تشریحی ہیں. انہوں نے زندگی بھر بلا ناغہ اپنا روزنامچہ لکھا تھا. افسوس یہ روزنامچہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر تبرک کی طرح ان کی اولاد میں تقسیم ہوگیا.

دہلی اردو اخبار کی ۵ دسمبر ۱۸۴۱ء کی اشاعت میں حکیم محمود خاں کے ایک کامیاب علاج کی خبر شایع ہوئی ہے. "جے پور کے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ راؤ بجو صاحب راج بہت بیمار تھے اور امراض اس طرح کے متضادہ تھے کہ مدت مدید سے ان کا دفعیہ مشکل تھا، حکیم محمود خاں سے رجوع کیا. سوا ڈیڑھ مہینہ ان کا علاج ہوا تھا جو عنایت

---

[1] غالب نامہ ص ۸۷

[2] مرات الانشاہ ص ۶۶

الٰہی سے کامل صحت ہوگئی۔ اور ۱۱ نومبر حال کو غسل صحت کیا۔ حکیم صاحب موصوف کو خلعت بیش قیمت پانچ پارچہ کا دوشالا سات سو روپیہ کا سونا لگا ہوا بطریق انعام دیا گیا[1] ۲ برس کی عمر میں ۱۳۰۹/۱۸۹۲ بعارضہ فالج وفات پائی۔ ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ تاریخ پیدائش تھی۔ سید حسن رسول نما میں دفن کئے گئے، مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے تین شعر کہے تھے جو لوح مزار پر کندہ ہیں[2]

بکت العیون اما ترید جمودا	أبکت شریفا صادقا محمودا
أسفت لفقد الطب عمر قرانہ	فاست وصل باسا نحس ففیدا
أملت علی منتواد یوم معادہ	قبر الذی فی الطب کان حمیدا

مولانا حالی کا مرثیہ ان کی وفات کا مرثیہ نہیں، علم و فن کا مرثیہ ہے، حذاقت و کمال اور شرافت و تہذیب کا مرثیہ ہے اور سب سے بڑھ کر دہلی مرحوم کا مرثیہ ہے ؎

اے جہان آباد اے اسلام کے دار العلوم	اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنرور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم	تھا فاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم

زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا

نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاق علم و دیں	جیسے امی تجھ میں تھے، عالم نہ تھے ایسے کہیں
ہند میں تھا جو محدث تھا وہ تیرا خوشہ چیں	تھی محدث خیز اے پائتخت تیری سرزمیں

تھا تفقہ بھی مسلم تیری خاک پاک کا

بیہقیِ وقت تھا ایک ایک فقیہہ اس خاک کا

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم	آن کر اس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغ ارم	بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم

---

[1] تاریخ صحافت جلد ا ص ۱۶۰

[2] اجمل میگزین ص ۷۳

ہند میں جاری تجھی سے طب یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی

لیکے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم — جن میں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم
دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم — کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے ان کے جھوم جھوم
آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصل خزاں
تیری سرحد میں رہا ہے علم و دانش کا سماں

دور آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا — بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تو نے سنبھالا سا لیا
خاک نے یاں پھر تیری اگلے وہ لعل بے بہا — جن سے روشن ہو گیا کچھ دن کو نام اسلاف کا
عہد ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا
خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و مکنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی — پر نہ کی عرض ہنر میں تو نے اب بھی کوتہی
اس بزرگی سے گزاری تیرھویں تو نے صدی — پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دور اکبری
علم دین و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم
ڈال دی پھر تو نے اپنی چار سو ہر فن میں دھوم

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیے — واعظان قوم سوتوں کو جگا کر چل دیے
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیے — کچھ مسیحا تھے کہ مردوں کو جلا کر چل دیے
ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گیا سیل فنا اس کو بھی اے دلی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی — ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی — اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی
کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز کس پر کرے گا اے جہاں آباد تو

اس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دار الشفا — خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا

مفت بیماروں کو اس کے در سے ملتی تھی دوا　　فکر نذرانہ کا تھا اس کو نہ شکرانے کا تھا
اس کے استغنیٰ سے جھک جاتا تھا سر مغرور کا
اور عنایت سے کنول جاتا تھا کھل مزدور کا

بے حقیقت اس نے سمجھا مال و دولت کو سدا　　تھے برابر اس کے نزدیک اغنیا اور بے نوا
گو طبیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا　　کوئی مفلس کا نہ تھا پرسان حال اس کے سوا
کرتے ہیں جو دعوئ ہمدردئ نوع بشر
اس نے باطل کر دیئے تھے ان کے دعوے سربسر

گو کہ جاتے تھے شفا خانوں میں خاص و عام سب　　پر الجھ جاتے تھے سخت امراض میں بیمار جب
خلق کا پھر ملجا و ماویٰ اسی کا تھا مطب　　اس کے بیماروں کو گو مایوس ہوں یا جاں بلب
سوء تدبیر و معالج کی خطا کا ڈر نہ تھا
موت کا ڈر تھا مگر مہلک دوا کا ڈر نہ تھا

حکیم محمود خاں کی عالی ہمتی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس شاہکار مرثیہ میں حالی نے کہا ہے۔

وہ زمانہ جب کہ تھا دلی میں اک محشر بپا　　نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا
اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا　　باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا
موجزن تھا جبکہ دریائے عتاب ذوالجلال
باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھ کر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار　　ساتھ دینا تھا کسی کا موت سے ہونا دوچار
یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرمسار　　شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار
آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل نہ جائیں اس کے شعلہ سے کہیں سب خشک و تر

مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ　　عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا عذر خواہ
مجرموں کے جرم پر دیوار و در تھے سب گواہ　　پر نہ تھا کوئی شفیع ان کا کہ جو تھے بے گناہ

ایسے نازک وقت میں مردانگی اس نے جو کی
اہل انصاف اس کو بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی

بالیقین جن ملزموں کو اس نے سمجھا بے خطا — مارشل لا میں ثبوت ان کی صفائی کا دیا
چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اک اک رہا — جو کہ تھے نادار، کی ان کی اعانت برملا

زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا بے گھروں کو گھر دیا

حکیم صاحب کے جنازہ اور سیوم کی فاتحہ میں لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ اس زمانہ میں اس کی مثال نہیں تھی۔ ان کے انتقال پر دہلی کے شہریوں کی طرف سے ٹاؤن ہال میں ماتمی جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس کی صدارت ڈپٹی کمشنر دہلی نے کی تھی۔ مقررین میں مولوی لطف الرحمن بیرسٹر جو کلکتہ سے خاص تعزیت کے لیے آئے تھے، محمد اکرام اللہ خاں، بابو گردھاری لال اور ڈپٹی نذیر احمد تھے۔ ڈپٹی نذیر نے اپنی تقریر میں کہا تھا "حکیم محمود خاں نے انتقال فرمایا، وہ بھی مفاجات، گویا آسمان سے پہاڑ ٹوٹ پڑا، حکیم محمود خاں سے بھی مشہور طبیب ہو گزرے ہیں مگر ان جیسی شہرت کہ چہار دانگ ہندوستان میں ان کی حذاقت کا غلغلہ تھا، میرا خیال ہے کہ متقدمین میں سے کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ میں ان کی وفات کو قومی بلکہ ملکی مصیبت خیال کرتا ہوں۔ وہ مصیبت ہم دلی والوں پر سب سے زیادہ شاق ہے، دلی میں عالم، مشائخ، ہر فن کے استاد، ہر ہر ہنر کے کامل درجنوں کوڑیوں بااب لے دے کر ایک محمود خاں کا دم رہ گیا تھا۔ صد ہزار افسوس یہ نعمت بھی سلب ہو گئی۔ یہ فخر بھی چھن گیا، یہ چراغ بھی گل ہو گیا۔ حکیم محمود خاں طب یونانی کی صداقت کا مجسم ثبوت تھے[۱]۔ حکیم محمود خاں اور ڈپٹی نذیر احمد کے تعلق سے راشد الخیری نے نغمہ ناتمام کے عنوان سے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں "والد مرحوم نے انتقال سے پہلے حکیم محمود خاں اور ڈپٹی نذیر احمد کی ملاقات کا

---

[۱] لیکچروں کا مجموعہ جلد ا ص ۳۲۱

حال لکھنا شروع کیا تھا کہ وہ بیمار پڑ گئے۔ مضمون کا ذکر دوران گفتگو کچھ اس طرح کیا تھا
"محمود خاں جیسا طبیب اب کیا پیدا ہوگا۔ مگر نذیر احمد بھی بے مثل ادیب تھے، وہ اپنے فن میں یکتا تھے تو یہ اپنے فن میں بے مثل۔ حکیم صاحب نے مولوی نذیر احمد کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی۔ مولوی نذیر احمد کو یہ بات ناگوار گزری۔ حکیم صاحب اور سارا مطب دیکھتا رہا اور مولوی نذیر احمد یہ جا وہ جا۔ نا تمام مضمون کے الفاظ ہیں
"حکیم محمود خاں کی نازک مزاجی ہندوستان بھر میں مشہور تھی۔ ان کا مطب ایک میلہ تھا جہاں سیکڑوں مریض صحت یاب ہوتے تھے۔ نذیر احمد کی تنک مزاجی سے کون واقف نہیں۔ اتفاق سے سرسید نے ایک سب جج کو کسی مرضی شکایت کے سلسلہ میں دہلی بھیجا اور مولوی نذیر احمد کو لکھا کہ وہ خود حکیم صاحب کے پاس لے جائیں محمود خاں حکیم و رئیس تھے، نذیر احمد ادیب و عالم۔ مولوی نذیر احمد مطب میں داخل ہوئے ایک ایسی کڑک سے جو مطب میں گونج گئی کہا السلام علیکم۔ شریف خانی نفاست طبع اس کرختگی کی متحمل آسانی سے نہیں ہو سکتی تھی۔ نہایت دھیمی سروں میں وعلیکم السلام کی ایک آواز نکلی اور ختم ہو گئی۔ حکیم صاحب کے مطب میں اگر شہنشاہ ہفت اقلیم بھی موجود ہو تو وہ اس سے بات کریں گے نہ حال پوچھیں گے اور جب تک وار نہ آئے نبض نہ دیکھیں گے[1]

حکیم محمود خاں کے ہاں زندگی کی بلند اور اعلیٰ اقدار ملتی ہیں، دہلی میں معاشرتی اور تہذیبی اقدار کے فروغ میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔ نفاست پسندی، جمالیاتی ذوق، رہن سہن، نشست و برخاست اور آداب و معاشرت کا وہ اعلیٰ نمونہ تھے۔
حکیم صاحب، ڈاڑھی چڑھاتے تھے، دو کلیہ ٹوپی، کرتا، کرتہ پر کبھی ململ یا تن زیب کا انگرکھا۔ سخت جلے کے جاڑوں میں ایک نیم آستین اور صبح کے وقت ایک پتلی ادنی چادر۔ آڑی نزاش کا چست پاجامہ۔ یہ ان کا خاندانی لباس تھا جو کم و بیش بعد تک قائم رہا۔

---

[1] دلی کی آخری بہار ص ۱۴۲

حکیم محمود خاں جیسے خود صاحب کمال، صاحب دل، قوم کے سچے مونس اور مخلص خدمت گزار تھے اسی طرح ان کی اولاد بھی ویسی ہی فاضل، یگانہ روزگار، خاندانی رسم و روایات کی پابند اور ہمدرد و سربرست خلایق ہوئی [۱]

حکیم غلام رضا خاں

حکیم غلام مرتضیٰ خاں کے بڑے صاحبزادہ اور خاندان شریفی کے ممتاز رکن تھے۔ ابتدائی عمر سے درس و تدریس کا شوق تھا۔ درسی کتابوں کے علاوہ قدیم طبی کتابوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ بڑے وسیع المطالعہ اور متبحر طبی عالم تھے۔ خاندان کے بزرگوں کی موجودگی میں ان کے درس میں طلبہ کی بڑی تعداد شریک رہتی تھی۔ ان کے تینوں چچازاد بھائیوں حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں، حکیم واصل خاں اور حکیم اجمل خاں نے ان سے پڑھا تھا۔ اپنے وقت میں استاد الاساتذہ سمجھے جاتے تھے [۲]

علاج میں اصول کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اور قدما کے طرز پر علاج کرتے تھے ایک دن میں سات آٹھ مریضوں سے زیادہ نہیں دیکھتے تھے، لیکن ان کے معائنہ پر کافی وقت صرف کرتے تھے۔ عمر طبعی پر پہنچ کر بعارضہ سرطان وفات پائی۔ اپنے والد حکیم غلام مرتضیٰ کی طرح ریاست پٹیالہ میں کچھ عرصہ ان کا قیام رہا مولوی بشیرالدین احمد نے ۱۸۵۷ کے بعد دہلی کے جن نامی طبیبوں کے نام گنائے ہیں، ان میں حکیم غلام رضا خاں بھی شامل ہیں [۳]

حکیم صاحب خالص علمی آدمی تھے۔ ۱۸۶۵ میں دہلی سوسائٹی کے نام سے ایک علمی ادبی سوسائٹی قایم ہوئی تھی۔ یہ انجمن ماسٹر پیارے لال آشوب کی مساعی کی بہت

---

[۱] یہ دلی ہے ص ۳۰

[۲] تذکرۂ خواجگان ص ۱۰۷

[۳] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۴۰۷

ممنون ہے اس سوسائٹی کی میٹنگیں ہوتی تھیں۔ اس کی روئداد چھاپنے کے لیے ۱۸۶۶ء میں رسالہ دہلی سوسائٹی جاری کیا گیا تھا، سوسائٹی کی میٹنگوں میں شامل ہونے والے اور مضامین پڑھنے والے دہلی کے مقتدر اور اہل علم حضرات تھے۔ ان میں مرزا غالب مولانا ذکاء اللہ، ماسٹر رام چندر، مولانا حالی، ماسٹر پیارے لال وغیرہ کے علاوہ حکیم غلام رضا خاں بھی شامل ہوتے تھے[1]

یکم جنوری ۱۸۶۶ء سے محلہ بلی ماران دیوان خانہ حکیم محمود خاں سے ہفتہ وار اکمل الاخبار جاری ہوا۔ مالک و مہتمم سید فخرالدین تھے۔ یہ اخبار اکمل المطابع میں چھپتا تھا۔ اکمل الاخبار کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حکیم غلام رضا خاں، حکیم غلام نبی، حکیم محمود خاں اور میر فخرالدین کے آپس میں بہت گہرے تعلقات تھے۔ ان کا مشورہ ہوا کہ ایک اخبار نکالا جائے جس کے لیے پریس کا ہونا بھی ضروری ہے چنانچہ اخبار اور پریس کے نام پر غور ہوا اور طے پایا کہ اپنے جد امجد حکیم شریف خاں کے والد حکیم اکمل خاں کے نام پر اخبار جاری کیا جائے اس پریس میں زیادہ تر شریفی خاندان کی مستند کتابیں چھاپی گئیں۔ علاج الامراض اسی پریس میں چھپی تھی۔ مرزا غالب نے اس اخبار کی اشاعت میں دلچسپی لی تھی۔ مولوی سیف الحق کو لکھا تھا، "اقبال نشان سیف الحق کو دعا پہنچے۔ پانچ اشتہار اخبار کی خریداری کے اور تین اشتہار کتاب کی خریداری کے آپ کے پاس پہنچے ہیں۔ چھوٹے صاحب کو ملاحظہ کروائیے اور اطراف و جوانب دور و نزدیک بھیجیئے جو صاحب کتاب اور اخبار دونوں کے خریدار ہوں وہ دونوں کی خریداری کی اطلاع کا خط میر فخرالدین مہتمم اکمل المطابع کے نام لکھیں"۔ غالب ۲۲ مارچ ۱۸۶۶ء" اخبار میں مرزا غالب کے بھی مضامین چھپتے تھے۔ چنانچہ مرزا نے اکمل الاخبار میں اپنا مفصل حال چھپوایا تھا، برہان قاطع کے قضیے میں جو اعتراضات و جوابات کا

---

[1] تاریخ صحافت جلد ۲ ص ۲۷۱

سلسلہ چلا اس میں اکمل الاخبار مرزا غالب کا حامی تھا۔ مرزا غالب نے ۱۹ اپریل ۱۸۶۷ء کے اپنے خط بنام مولوی سیف الحق میں اس کا ذکر کیا ہے[۱]۔ یہ غالب کے خصوصی تعلق کی بات تھی کہ انہوں نے اردوئے معلی کا حق ملکیت "نور چشم اقبال نشان" حکیم غلام رضا خاں کے حوالہ کر دیا تھا[۲]۔ غالب نے رامپور سے ایک خط حکیم غلام رضا خاں کے نام لکھا ہے، اس سے غالب کی نگاہ میں حکیم صاحب کی قدر کا اظہار ہوتا ہے "سنو صاحب۔ میں فقیر آزادہ کیش ہوں، دنیادار نہیں، مکار نہیں، خوشامد میرا شعار نہیں جس میں جو صفات دیکھتا ہوں وہ بیان کرتا ہوں۔۔۔ تمہارے باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر بہ مثل میرا کوئی صلبی بیٹا ہوتا جیسے تم ہو تو میں اس کو اپنا فخر و شرف جانتا۔ علم و عقل و خلق و صدق و سداد و حلم کے جامع، تورع و تقوی کے حاوی۔ علم اخلاق میں حکمائے روحانی نے سعادت کے جو مدارج لکھے ہیں وہ سب تم میں پائے جاتے ہیں۔ پروردگار تم کو عمر طبیعی عطا کرے اور دولت و اقبال شمار سے زیادہ دے[۳]"۔ حکیم غلام رضا خاں دہلی سوسائٹی باعث ترقی علوم و رفاہ کے ممبر تھے۔ اس کے ۱۲ مارچ ۱۸۶۹ء کے جلسہ کے شرکا کی فہرست میں ان کا نام بھی شامل ہے۔ اس میں غالب کے انتقال پر باہر سے آیا ایک تعزیت نامہ پڑھا گیا تھا[۴]

حکیم محمد تقی خاں سوزاں

حکیم محمد تقی خاں دہلوی طبیب حاذق اور شاعر باخبر تھے۔ سوزاں تخلص کرتے

---

[۱] تاریخ صحافت جلد ۲ ص ۲۱۸

[۲] اردوئے معلی ص آخر مطبوعہ ۱۸۶۹ء

[۳] غالب کے خطوط جلد ۴ ص ۱۴۰۱

[۴] احوال غالب ص ۱۹۲

تھے۔ فغاں دہلی کے نام سے انہوں نے ایک طویل مسدس لکھا تھا۔[1]

حکیم میر نادر علی رعدؔ

حکیم میر نادر علی رعدؔ حضرت شہیدؔ دہلوی کے پوتے تھے۔ انہوں نے شاہ نصیر کا دیوان چھپوایا تھا۔ فنِ تاریخ میں گنجینۂ خیال کے نام سے ایک عمدہ کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ آخر میں حیدر آباد چلے گئے تھے۔[2]

حکیم محمد اسمٰعیل خاں ذبیحؔ

حکیم محمد اسمٰعیل خاں ذبیحؔ ابن مولوی ابراہیم خاں لائق طبیب تھے۔ دہلی میں شاندار مطب تھا۔ اشعار میں ظریفانہ مضامین اکثر لکھا کرتے تھے۔ افضل الاخبار میں کئی برس تک ضمیمہ میں ان کے مضامین نکلتے رہے، نواب احمد سعید خاں طالب جاگیر دار لوہارو کی سرکار میں بھی کچھ عرصہ ملازم رہے۔[3] اچھے میاں عرفیت تھی اور بریلی سے آبائی تعلق تھا۔[4]

صاحب خمخانہ جاوید نے بھی اچھے کامیاب شاعر اور باکمال طبیب کی حیثیت سے ان کا تعارف کرایا ہے۔[5] اسی کے ساتھ بہت خلیق اور متواضع تھے۔ شعرا کا جمگٹا

---

[1] خمخانہ جاوید جلد ۴ ص ۲۸۷

[2] ایضاً جلد ۳ ص ۴۷۰

[3] ایضاً جلد ۳ ص ۲۴۱

[4] سخن شعرا ص ۱۱۵

[5] خمخانہ جاوید جلد ۵ ص ۱۳۱

ان کے مطب میں نظر آتا تھا۔[1]

حکیم محمد حسن خاں شفا

دہلی کے باشندہ تھے۔ ذکا نے اپنے زمانہ میں انہیں جوان دیکھا تھا۔[2]

مرزا احمد اختر

مغل شہزادوں میں تھے۔ ان کے والد مرزا دارا بخت میراں شاہ آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد اول تھے۔ ۱۸۵۷ کے بعد دہلی سے نکلے۔ ۲۰۔۲۵ برس تک دارو گیر کے خوف سے گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ شمالی ہند کے مختلف شہروں میں رہنا ہوا، بھوپال میں بھی قیام رہا۔ طب اور تصوف میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ قصبہ کرانہ میں عرصہ تک مطب کرتے رہے۔ آخر میں طب اور تصوف کی کتابوں کی بدولت احباب کی کوشش سے کمشنر دہلی نے دس روپیہ ماہانہ پنشن مقرر کر دی تھی۔ ان کی تصانیف میں سوانح دہلی بھی ہے۔[3]

حکیم تجمل رسول خاں تجمل

حکیم تجمل رسول خاں تجمل ممتاز الدولہ نواب غلام رسول خاں دہلوی کے بیٹے اور حکیم

---

[1] یہ تھی دلی ص ۱۵۴

[2] یادگار شعرا ص ۱۰۱ بحوالہ ذکا

[3] خمخانہ جاوید جلد ا ص ۲۲۱

آغا جان عیش کے شاگرد[1] اور یکتائے زماں تھے[2]۔ مہاراجہ ہندو راؤ رئیس گوالیار مقیم دہلی کی سرکار میں بزمرہ اطبا ملازم رہے۔ بہت عمدہ خطاط تھے۔ مختلف قسم کے خطوں میں مہارت تھی اس فن کو خاص محمد امیر پنجہ کش سے حاصل کیا تھا۔ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں بعمر پچاس برس انتقال کیا، ان کے دو شعر ہیں[3] ؎

ہفت اقلیم میں اس شہر کی تھی دھاک بڑی — کوئی دنیا میں نہ تھا شہر بسان دہلی
ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں ہر جا — کیا ہوئے اہل کمال دہلی

حکیم غلام مولا بخش قلق

ان کے بزرگ نادر شاہ کے ہمراہ ہمدان سے دہلی آئے اور کلاں محل میں مقیم ہوتے، اور پھر واپس ایران نہیں گئے۔ حکیم مولا بخش فارسی میں امام بخش صہبائی کے شاگرد[4] تھے۔ صہبائی کے صاحبزادہ حکیم عبدالعزیز سوزان کے ہم سبق رہے، درسیات عربی مولوی انتظام علی سہارنپوری سے پڑھیں۔ اور طب کی تعلیم حکیم غلام نقشبند خاں سے حاصل کی۔ شاعری میں مومن خاں سے تلمذ تھا۔ اس طرح دہلی کے مشہور زمانہ اساتذہ سے انہیں اکتساب کا موقع ملا۔

آخر زمانہ میں میرٹھ میں سکونت اختیار کی تھی ؎

قلق کیوں چھوڑ تا دہلی کو، کیوں میرٹھ میں آ رہتا — گدائی کے بھروسے پر لٹایا بادشاہی کو

قلق دہلی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ میرٹھ کے علمی، ادبی اور دینی حلقہ میں بھی

---

[1] بزم سخن ص ۴۰ سخن شعرا ص ۸۳

[2] مرات الاشباہ ص ۷۰

[3] خمخانہ جاوید جلد ۲ ص ۳۹

[4] سخن شعرا ص ۳۸۷

وقعت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ ان کا شمار ہندوستان کے مشہور طبیبوں میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ میں شفا بھی دی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

اب اطبا کیا جئیں جاتی رہی وجہ معاش — بچ گیا بیمار غم، اور ہو گیا رسوا علاج

کلیات فلق پر الطاف حسین حالی، سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ اور عبدالحی بدایونی مؤلف تذکرہ شمیم سخن نے تقاریظ لکھی ہیں، عبدالحی فلق کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"زمانہ آخر میں ہر چند بہت شاعر ہوتے، مگر صاحب کمال کا کلام ہمیشہ اپنا جلوہ علاحدہ ہی دکھاتا رہا۔ اس کا گواہ دیوان فلق ہے۔ حضرت حکیم غلام مولا عرف مولا بخش فلق میرٹھ کے خطہ میں ایک باکمال سخن فہم، سخن سنج شاعر تھے۔ آپ کو تلمذ حضرت مومن دہلوی سے حاصل تھا۔ آپ کا کلام صاف و سلیس، محاورات دل پسند و تشبیہات مناسبہ سے مملو نظر آتا ہے۔"

مولوی سید احمد نے لکھا ہے "آپ کے شعر وہ تڑپتے ہوتے اور برجستہ ہوتے تھے کہ کیسا ہی ٹھنڈی طبیعت کا آدمی کیوں نہ ہو تڑپ ہی جاتا ہے۔۔۔ غرض معاملہ بندی، بلاغت، فصاحت، متانت ساری خوبیاں آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ مرثیہ بھی لکھا تو اس زور کا میاں انیس و دبیر کو پرے بٹھا دیا۔ اچھے اچھے سنگدلوں کو اپنی کیفیت بندی سے آٹھ آٹھ آنسو رلا دیا۔ رباعیات عمر خیام سے لگا کھاتی ہیں اور قصائد خاقانی و انوری کا لطف دکھاتے ہیں۔"

۷ شعبان ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء کو میرٹھ میں فلق کا انتقال ہوا، ان کے دوست اور شاگرد گلاب سنگھ مشتاق میرٹھی نے تاریخ وفات کہی ؎

مر گیا یکتائے عصر کی سن کر — ہر سخنور کا دل دو نیم ہوا
بولا مشتاق بے سر ابجد — حیف ہے اب سخن یتیم ہوا

فلق کا دیوان مرتب تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی منشی عبداللہ نے ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں مطبع انصاری دہلی میں طبع کرایا۔ عبدالحی صفا بدایونی نے

قطعہ کہا[1]

مشتاق تھا جس کا ایک عالم ۔۔۔ دیوان وہ خوش نما چھپا ہے
تاریخ طبع صفا یہ لکھو ۔۔۔ دیوان قلق کا خوش نوا ہے

کنور پال سنگھ سحاب (وفات ۱۸۸۵ء) ان کے ارشد تلامذہ میں تھے۔[2]

حکیم خیر الدین یاس

ساکن دہلی، مومن کے خوشہ چین تھے[3] صناعت طب میں حکیم احسن اللہ خاں کی توجہ سے مہارت تام اور معالجہ امراض میں دستگاہ تمام بہم پہنچائی تھی۔ فن شعر میں مومن کے علاوہ ذوق سے بھی اصلاح لیتے تھے[4] جالینوس زماں اور بقراط دوراں تھے۔[5]

حکیم مرزا محمد خاں مرزا

سرور، شیفتہ اور کریم الدین نے حکیم مرزا محمد خاں مرزاؔ کا تذکرہ کیا ہے اور انہیں ذوق کا بھانجہ اور مرزا رستم بیگ کا شاگرد لکھا ہے۔[6]

---

[1] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۲۹۲ تا ۲۹۴

[2] خمخانہ جاوید جلد ۴ ص ۸۷

[3] گلشن بے خار ص ۲۴۲

[4] گلستان سخن ص ۴۸۱ بزم سخن ص ۱۲۷

[5] دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۱۱۳

[6] طبقات شعرائے ہند ص ۳۴۹ یادگار شعرا ص ۱۵۵ بحوالہ عمدہ منتخبہ و گلشن بے خار

[7]

حکیم مہر علی ضابط

حکیم مہر علی ضابط دہلی کے باشندہ تھے۔ اور طب خوب جانتے تھے[1]

حکیم قیام الدین

حکیم حسام الدین کے دونوں بیٹوں حکیم حاجی قیام الدین اور حکیم حاجی لطیف حسین خاں نے خاندان کی فنی روایت کو آگے بڑھایا۔[2] دہلی کے معززین اور شرفا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ حکیم قیام الدین بڑے صاحب علم تھے اور قدما کی کتابوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کا مطب بہت کامیاب تھا۔ معالجہ چشم میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ حکیم ذکاء اللہ خاں کی کتاب قرابادین ذکائی ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۴ء میں دہلی سے ان کے اہتمام میں طبع ہوئی تھی۔ اس میں حکیم قیام الدین کے لیے "حکمت مآب اور حذاقت دستگاہ" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

حکیم لطیف حسین خاں

حکیم لطیف حسین خاں بھی آنکھ کے علاج میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ طب کے علاوہ دینی علوم سے خوب واقفیت تھی۔ گورنمنٹ اسکول میں عربی و فارسی کے مدرس تھے۔ بشیر الدین احمد مؤلف واقعات دار الحکومت نے بھی ان سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کا

---

[1] بزم سخن ص ۸۵

[2] امتحان الالباب لکافۃ الاطباء ص ۲۱۹

طریقۂ علاج اس قدر مؤثر تھا کہ دور و نزدیک سے مریض ان کے مطب میں کھنچے چلے آتے تھے۔ ان کی تجویز و تشخیص میں کسی بڑے سے بڑے طبیب کو معمولی ترمیم و تبدیلی کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں نے جب مدرسہ طبیہ جاری کیا تو ان کے علاوہ کوئی ایسا استاد کامل نظر نہیں آیا جس سے مدرسہ کے پرنسپل کا عہدہ جلیلہ سنبھالنے کے لیے کہا جاتا۔ انہوں نے محض خدمت کے خیال سے اس منصب کو قبول کیا اور آخر دم تک علم طب کی خدمت کرتے رہے[1]

امداد صابری کی کتاب دہلی کی یادگار شخصیتیں میں گورنمنٹ اسکول کی مدرسی اور مدرسہ طبیہ کی پرنسپلی حکیم لطیف حسین کے بجائے حکیم قیام الدین سے منسوب ہے[2]۔ جب کہ ان کی دوسری کتاب دہلی کی یادگار ہستیاں کے علاوہ بشیر الدین احمد کی واقعات دار الحکومت سے اس کی نفی ہوتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

حکیم ظہیر الدین خاں

حکیم غلام نجف خاں کے بیٹے اور حکیم احسن اللہ خاں کے بھانجے تھے۔ طب کی تعلیم خاندان کے بزرگوں سے حاصل کی۔ حکیم احسن اللہ خاں نے ان کو متبنیٰ کیا تھا۔ عبد اللطیف نے انہیں پسندیدہ روش اور نیک خصلت لکھنے کے ساتھ اپنے بزرگ احباب میں لکھا ہے۔ اور انہیں ایک بڑے ادیب، مہربان اور عظیم المرتبت ہستی کے طور پر یاد کیا ہے[3]۔ دہلی میں اپنے بزرگوں کی طرح طب میں بڑا نام پایا تھا۔ حکومت کی طرف سے ان کو خان صاحب کا خطاب تھا۔ آنریری مجسٹریٹ بنائے گئے تھے، دہلی میونسپل کمیٹی کے

---

[1] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۱۹۱ واقعات دار الحکومت ص ۱۸۷

[2] دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۱۱۸

[3] ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ ص ۶۲

بھی کئی برس ممبر رہے۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے "فہرست منظور شدہ درباریان قسمت دہلی لغایت ۳۱ دسمبر ۱۸۹۱" میں طبیبوں میں حکیم غلام رضا خاں ولد حکیم غلام مرتضیٰ خاں اور حکیم ظہیر الدین آنریری مجسٹریٹ ولد حکیم غلام نجف خاں کا نام درج ہے[1]

۱۸۹۲ء میں دہلی کے معززین اور سربرآوردہ لوگوں نے ایک انجمن مؤید الاسلام یتیم خانہ اور لڑکے لڑکیوں کا اسکول قائم کیا تھا، غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کا اسکول نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان بچے عیسائی اسکولوں میں داخل ہو کر عیسائی مذہب اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مسلم یتیم خانہ نہ ہونے کی وجہ سے لاوارث بچے عیسائی مشنریوں کے ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں۔ منشی کرم اللہ خاں دہلوی، عبدالرحمٰن ناسخ، حکیم اجمل خاں، مولوی عبدالاحد، مولانا عبدالحق حقانی وغیرہ کے ساتھ حکیم ظہیر الدین اور حکیم رضی الدین اس کے سرگرم کارکن اور سرپرست تھے[2]

حکیم ظہیر الدین نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی شادی اپنے خاندان میں شیخو پورہ میں کی۔ ان سے حکیم رضی الدین اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ اہلیہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی محمد میر کی بہن نور جہاں سے کی۔ ان سے ایک لڑکے ریاض الدین تھے، جو قبل شادی باپ کی حیات میں انتقال کر گئے[3]

حکیم عنایت اللہ خاں شوق

حکیم عنایت اللہ خاں شوق فرید آباد کے رؤسا میں تھے۔ شاہ جہاں آباد میں تکمیل علم کے بعد صہبائی سے فن سخن میں تلمذ اختیار کیا۔ استاد ان باکمال ذوق، مومن اور غالب

---

[1] رؤسائے با اختیار و نامی خاندان پنجاب ص ۱۶۴

[2] دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۵۰۹

[3] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۳۵۳

کی نشستوں میں شریک رہتے تھے۔ تحصیل علم طب کے بعد ایک مدت تک سرکار انگریزی کی ملازمت میں بسر کی علم طب میں دخل کامل تھا[1] سرکار انگریزی سے پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے تھے۔ مطب کا سلسلہ آخر تک جاری رہا اور لوگوں کو ان کے مطب سے بہت فیض پہنچا۔ خوش فکر اور سخن سنج تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے دیوان مرتب تھا۔ ۱۸۸۶ء میں بقید حیات تھے[2]

حکیم منولال ماہر شاد

حکیم ذوقی رام دہلوی کے فرزند اور ہوشیار طبیب تھے۔ طبع جدت طراز تھی۔ زور فکر سے مضامین کو شستگی سے ادا کرتے تھے۔ ریاست پٹیالہ میں بھی مطب کیا۔ پروفیسر رام چندر ریاضی داں ان کے ہم زلف تھے۔ ۱۸۹۲ء کے قریب انتقال کیا۔ تقریباً ۶۰ برس کی عمر پائی[3]

حکیم مدن لال مدن

حکیم مدن لال مدن دہلوی شاعری میں چندی پرشاد نجم شیدا دہلوی کے شاگرد تھے[4] شاعر اور طبیب دونوں حیثیتوں سے امتیاز تھا۔

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد ۵ ص ۹۲

[2] یادگار ضیغم ص ۱۸۴

[3] خمخانۂ جاوید جلد ۴ ص ۳۴۸

[4] تاریخ صحافت جلد ۴ ص ۵۴ ،

حکیم محمد حسن خاں

دہلی کے اس عہد کے ممتاز اطبا میں حکیم محمد حسن خاں بھی تھے۔ اپنے علم وفضل معالجہ اور ملکی کاموں میں دلچسپی کی وجہ سے قدر کا درجہ حاصل تھا۔ منشی بلاقی داس کے اخبار پندرہ روزہ لٹن گزٹ دہلی کے ۷ مئی ۱۸۷۷ء کے شمارہ میں خبر ہے کہ ڈپٹی کمشنر نے مرزا اسلیمان جاہ، نواب ضیاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو، خان محبوب بخش سوداگر، حاجی قطب الدین سوداگر، حافظ عزیز الرحمٰن وکیل، حکیم محمد حسن خاں، اور بخشی انعام اللہ خاں سات آدمیوں کو فتحپوری کی جائداد کا ممبر مقرر کیا۔ صاحبان مذکور کا ارادہ ہے کہ اس کی آمدنی سے ایک مدرسہ جاری کریں[1]، چنانچہ ان حضرات کی کوشش سے مدرسہ قائم ہوا۔ اور یہ فیض آج بھی جاری ہے۔

حکیم میر اشرف علی

حکیم اشرف علی کا شمار اپنے زمانہ کے مشہور طبیبوں میں تھا۔ بشیرالدین احمد نے لکھا ہے "موری گیٹ سے ایک لمبی سڑک جو کشمیری گیٹ کے پاس جا نکلتی ہے اس کی ایک گلی میں دلی کے مشہور طبیب حکیم اشرف علی کا مطب تھا ان کے بعد ان کے صاحبزادہ حکیم نذیر احمد مطب کرتے ہیں۔ باپ بیٹے دونوں دہلی کے مشہور معالجین میں شمار کئے جاتے ہیں[2]۔" ایک اور جگہ دہلی کے نامی اطبا کا ذکر کرتے ہوئے بھی بشیرالدین نے ان کا نام لیا ہے[3]

---

[1] تاریخ صحافت جلد ۳ ص ۵۳

[2] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۲۵۴

[3] ایضاً ص ۴۰۷

غالب نے میر مہدی مجروح، میر سرفراز حسین اور منشی نبی بخش حقیر کے نام خطوط میں ان کا ذکر کیا ہے۔ دہلی کے رہنے والے اور میر اسد علی کے صاحبزادہ تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں گرفتار ہوئے۔ رہائی کے باوجود جائداد ضبط ہو گئی۔ غالب نے مجروح کے نام خط میں ان کا خاکہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے "کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، منڈی داڑھی، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے۔ تمہارا خط دیا۔ صرف ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے ان سے اسم شریف پوچھا گیا، فرمایا اشرف علی۔ قومیت کا استفسار ہوا۔ معلوم ہوا سید ہیں۔ پیشہ پوچھا حکیم نکلے۔ یعنی حکیم میر اشرف علی۔ میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں"۔ مجروح نے ان کی وفات پر جو قطعہ لکھا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۰۸ھ/۹۱-۱۸۹۰ء میں بنارس میں ہیضہ میں انتقال ہوا۔ قطعہ یہ ہے[1]۔

میر اشرف علی دہلی زاد	در بنارس زہیضہ جان گذاشت
چونکہ در غربت انتقال نمود	"شد غریب الوطن" سنین وفات

۱۳۰۸

حکیم سعدالدین احمد خاں

حکیم سعدالدین احمد خاں ضیاء الدولہ بہادر کے شاہی خطاب سے مفتخر تھے۔ یہ نواب رکن الدولہ کے صاحبزادہ اور غالب کے حقیقی بھانجہ مرزا عاشور بیگ کے سالے تھے۔ غالب نے ان کا ذکر علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ایک خط میں کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد انگریزی حکومت کے عتاب کا شکار ہوئے۔ دہلی پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد یہ پانی پت میں روپوش ہو گئے۔ دہلی میں ان کی پانچ سو روپیہ

---

[1] غالب کے خطوط جلد ۴ ص ۱۶۶۱۔ بحوالہ نادرات غالب حواشی ص ۱۳۹ مظہر معانی ص ۲۳۴

ماہانہ کی املاک تھیں جسے حکومت نے ضبط کرلیا۔ نواب ضیاء الدولہ لکھنؤ گئے تاکہ مرزا عاشور بیگ کے بھائی مرزا عباس بیگ کی مدد سے اپنی جائداد واگذاشت کرائیں، مگر ناکامی ہوئی۔ پھر لاہور ہو گئے اور وہاں رتی گن نام کے ایک وکیل کے ذریعہ حکومت سے اپنی جائداد کا مطالبہ کیا۔ وکیل کی کوشش سے جائداد واگذاشت ہو گئی۔[1]

بشیر الدین احمد نے ۱۳۱۰ھ/۳-۱۸۹۲ء میں انتقال کا لکھا ہے حضرت نظام الدین میں مدفون ہیں۔[2]

حکیم خواجہ کاظم علی خاں

دہلی کے ایک ذی ثروت اور ذی حیثیت خاندان کے فرد تھے، ان کے والد خواجہ ہاشم علی خاں کا دہلی کے سربرآوردہ اصحاب میں شمار تھا اور ان کے دادا نواب زین العابدین خاں فہم و فراست، حسن تدبیر اور انشاء کی وجہ سے دبیر الدولہ کے شاہی خطاب سے مفتخر تھے۔

کامیاب مطب اور خاندانی وقار کے سبب عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ۵ ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء بروز جمعہ جہان فانی کو خیرباد کہا۔ ترکمان دروازہ کے باہر چونسٹھ کھمبے کی عالی شان عمارت کے ایک احاطہ میں ان کی اور ان کے بیٹے حکیم محمد مظفر علی خاں کی قبریں ہیں، جن پر سنگ مرمر کے کتبے نصب ہیں۔

حکیم محمد مظفر علی خاں نے درسی علوم کی تحصیل اور طبی فنون کی تکمیل کے بعد ۲۴ برس کی عمر میں ۲ محرم ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء بروز دوشنبہ وفات پائی۔[3]

---

[1] غالب کے خطوط جلد ۴ ص ۱۶۹۵ بحوالہ ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۶۱ کارنامہ سروری ص ۳۲ تا ۳۵

[2] واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۸۰۱

[3] ایضاً ص ۸۰۰

حکیم رام نراین حیرآن

شاعر فصیح البیان رام نراین حیرآن دہلوی منشی میگو سنگھ کھتری کے فرزند تھے شعر خوب کہتے تھے۔ نواب فصیح الملک داغ دہلوی کے ارادت مندوں میں تھے۔ علمی استعداد معقول تھی۔ فن طب میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ رکھتے تھے۔ حکیم بہاء الدین خاں سے اس فن میں استفادہ کیا تھا۔ دہلی کے علاوہ اجمیر میں بھی مطب کیا۔ مذاق سلیم اور فکر رسا کے ساتھ بے انتہا خلیق تھے۔ زبان پاکیزہ اور ٹکسالی، اسلوب بیان اچھا اور کلام سے معاملہ بندی ٹپکتی ہے۔ مضمون کی طرف بھی میلان پایا جاتا ہے[1]

حکیم سنبل پرشاد جینی

حکیم سنبل پرشاد ہدسیتوں کے نام سے مشہور ایک معزز خاندان کے رکن تھے، علاج معالجہ کا سلسلہ کئی پشت سے جاری تھا، ان کے جد امجد وید شری رام نواب فرخ نگر کے مشیر خاص اور معالج محلات تھے۔ آبائی وطن فرخ نگر تھا، ان کے دادا وید گردھاری لال فرخ نگر سے چھاونی دہلی آئے، بڑے فاضل اور لائق معالج تھے۔ تمام چھاونی ان کے زیر علاج رہتی تھی۔ زیادہ تر کشتہ جات اور بوٹیوں سے کام لیتے تھے، حکیم سنبل داس کے والد حکیم جمنا داس بھی نامی اطبا میں شمار ہوتے تھے۔ فقرا اور بوٹیوں کے جاننے والوں سے ملنے کا بے حد شوق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دو ہزار کے قریب بوٹیوں کے خواص سے واقفیت تھی۔ ۱۸۵۷ کے پرآشوب زمانہ کے بعد فرخ نگر سے یہ بھی دہلی منتقل ہوئے اور یہاں بڑے معرکے کے علاج کئے، بڑے نیک دل انسان تھے۔ لوگ انہیں دیوتا

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد ۲ ص ۵۳۸

ہے تھے۔

حکیم سیتل پرشاد نے ناگری کی ابتدائی کتابیں اپنی والدہ سے اور آیوروید ک کی کتابیں اپنے والد بزرگوار سے پڑھیں، اور ان کا مطب دیکھا، سرکاری مدارس میں اردو، فارسی اور انگریزی پڑھی۔ ابتدائی عمر سے تیز طبع اور ذہین تھے۔

حکیم سیتل پرشاد نے فاضل اجل اور طبیب حاذق حکیم مولوی خیر اللہ بیگ سے قانونچہ، مفردات ناصری، میزان الطب اور طب کی دوسری کتابیں پڑھی تھیں دہلی میں کامیاب مطب تھا۔[1]

حکیم غلام نبی خاں

حکیم غلام نبی خاں ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ چند ہی برس کے تھے کہ ان کے والد حکیم غلام محمد خاں نے وفات پائی۔ حکیم محمود خاں نے مرحوم بھائی کی اس نشانی کو جو ہر قابل سمجھ کر اپنے سایہ عاطفت میں لیا۔ عربی فارسی کی تعلیم کے بعد طب کی کتابیں حکیم محمود خاں نے خود پڑھائیں۔ انہی کے مطب میں انہوں نے نسخہ نویسی کی مشق کی، ان کی طبی قابلیت سے مطمئن ہوکر حکیم محمود خاں نے شریف منزل میں انہیں علاحدہ مطب کرنے کی اجازت دی۔ حکیم غلام نبی نے ان سے عرض کیا کہ آپ نے جس محبت وشفقت سے مجھے اپنے سایہ عاطفت میں رکھا اور آج میں جس لائق ہوں وہ آپ ہی کا فیضان ہے۔ لیکن چونکہ میرے والد جد امجد حکیم صادق علی خاں کی زندگی میں انتقال فرما گئے تھے اس لیے شریف منزل کے کسی حصہ پر میرا یا میرے بھائیوں کا کوئی شرعی حق نہیں ہے۔

دہلی میں کچھ عرصہ مطب کرنے کے بعد حکیم غلام نبی خاں کلکتہ منتقل ہوئے۔ کلکتہ میں

---

[1] رموز الاطبا جلد ۲ ص ۴۶۸

حکیم صاحب کو بڑا اعزاز و اکرام حاصل ہوا۔ وہاں کی مقتدر اور معزز ہستیوں میں ان کا شمار تھا۔ کلکتہ میں طب یونانی کو فروغ دینے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ ان سے پہلے وہاں یونانی طب کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ ان کے معجز نما علاج سے لوگ طب یونانی کے مداح اور معترف ہوئے۔ حکیم صاحب کے طبی معمولات بعد میں ان کے خاندان کے طبیبوں کے لیے نشان راہ بنے[1]

حکیم غلام نبی خاں علم و فضل، سخاوت اور اقبال مندی کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں ۲۶ برس کی عمر میں دہلی میں فوت ہوئے، قدم شریف میں مدفون ہیں لوح مزار پر ذرج ذیل اشعار کندہ ہیں ؎

غلام نبی طبیب و لبیب	سرافروز و اقبال مند و سخی
پس از شصت و شش سال بربست رخت	زدنیائے ناپائدار و دنی
بخاکش سپر دند اینجا کہ ہست	زیارت گہ نقش پائے نبی
ہمی رفت در سال فوتش سخن	کہ خود روح آن پیکر مردمی
بگفت از سر حق و صدق و یقین	بپائے نبی بہ غلام نبی

۱۳۲۵

حکیم بدرالدین خاں

حکیم حاجی محمد بدرالدین خاں دہلی کے ایک نہایت برگزیدہ طبی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد حکیم الملک قطب الدولہ حکیم محمد قطب الدین خاں ولد ارسطو زماں حکیم محمد حامد خاں خلف اکمل الکملا افضل الفضلا حاذق الزماں حکیم محمد احمد خاں ابن حکیم محمد احسن خاں ابن خواجہ محمد افضل ابن خواجہ محمد قاسم خواجہ عبید اللہ احرار کی اولاد سے تھے ان کے اجداد سلاطین مغلیہ کے ہمراہ ہندوستان آئے اول ان کے بزرگ طبیب

---

[1] مشاہیر الاطبا نمبر دہلی اپریل ۱۹۴۰ء ص ۳۲

روحانی رہے۔ خواجہ محمد قاسم اپنے نامور اسلاف کی طرح اولیائے کبار میں سے تھے۔ ان کا مزار دولت آباد کے موضع مثمٹہ میں ہے اور قاسم کی چوکی اور انبلی کی چوکی کے نام سے مشہور ہے۔ درگاہ کے مصارف کے لیے اس موضع کی آمدنی ریاست حیدر آباد کی طرف سے وقف تھی۔ اس خاندان کے بزرگ سلاطین مغلیہ کے ہمراہ آگرہ میں مقیم رہے اور فن طب میں مرتبہ کمال کے سبب یکے بعد دیگرے شاہان مغلیہ کے معالج خاص مقرر ہوتے۔ شاہ جہاں کے ہمراہ آگرہ سے دہلی آکر متوطن ہوتے۔ حکیم بدر الدین کے داد حکیم حامد خاں شاہ عالم بادشاہ کے معالج تھے۔ ان کے والد حکیم قطب الدین نے بہادر شاہ ظفر کے عہد میں آبائی منصب کے علاوہ امینی کا عہدہ بھی پایا[1]

حکیم بدر الدین یکم شعبان ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء کو شاہ جہاں آباد میں متولد ہوئے۔ تین ہی برس کے تھے کہ والد نے وفات پائی۔ طب کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابتدا میں حکیم اسد علی خاں خلف الصدق حکیم ذکاء اللہ خاں کے مطب میں تین سال استفادہ کیا۔ اس کے بعد اپنے عم نامدار حکیم غلام نقشبند خاں کے مطب میں بیٹھے، ۱۸۵۷ء کے بعد حکیم احسن اللہ خاں سے طب کی تکمیل کی، اور وہ حذاقت ولیاقت پیدا کی کہ دور دور تک ان کی شہرت پھیلی۔ ابتدا میں فارسی اور صرف ونحو وغیرہ مولانا سید حیدر علی پنڈوی اور معقول اور کسی قدر علم طب حکیم مرزا اسد بیگ مصنف "تنبیہ الایمان" سے پڑھا۔ آغاز عمر میں قانونچہ تک حکیم یوسف حسین خاں نبیرہ حکیم ذکاء اللہ خاں سے تعلیم حاصل کی تھی۔

حکیم احسن اللہ خاں کو اپنے اس شاگرد پر بہت ناز تھا۔ ابتدا میں انہوں نے انبالہ میں مطب شروع کیا۔ حکیم احسن اللہ خاں نے ان کی حذاقت اور فطانت دیکھ کر انہیں رئیس ضلع مین پوری کے علاج کے لیے بھیجا۔ پھر اپنے استاد کی ہدایت پر نواب صاحب ٹونک کے ماموں صاحبزادہ محمد خاں کے معالجہ کے واسطے ٹونک گئے۔ وہاں کے چار پانچ ماہ کے قیام میں عمائدین ریاست ان کے زیر علاج آتے۔ اس کے بعد دہلی میں مطب

---

[1] امتحان الالبا لکافتہ الاطباص ۲۱۸

شروع کیا۔ حکیم احسن اللہ خاں جب دہلی سے کسی ریاست کی طلبی پر باہر جانے تھے تو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ اپنا دہلی کا مطب ان کے سپرد کرتے تھے۔ حکیم بدر الدین خاں مہاراجہ جیند کے طبیب خاص رہے مگر شکل یہ تھی کہ حکیم صاحب دہلی میں معالجہ میں مصروف رہتے تھے اور حسب ضرورت و طلب ریاست جیند جاتے تھے۔ دہلی کے بعض طبی گھرانوں کا تذکرہ یہاں دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا۔

دلی کے طبی خاندان

دہلی میں اس زمانہ میں اطبا کے چند خاندان بہت مشہور تھے اور قدیم سے چلے آتے تھے۔ ان میں ایک شریف خانی جن کی یادگار حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں تھے۔ دوسرے علوی خانی جس کے اہم فرد اس وقت حکیم سید اشرف علی خاں تھے۔ تیسرے بقا خانی جس کی جانشینی کے فرائض حکیم حاجی لطیف حسین خاں اور حکیم حاجی قیام الدین خاں کے علاوہ حکیم یوسف حسین خاں اور حکیم شجاعت علی خاں انجام دے رہے تھے۔ چوتھا خاندان احسن خانی تھا جس کے ممتاز رکن حکیم بدر الدین خاں تھے جو اپنے فضل و کمال کی وجہ سے معاصرین میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ایک اور خاندان محسن خانیوں کا تھا۔ اس محسن خانی خاندان میں حکیم بدر الدین کی شادی ہوئی تھی، ان کے خسر حکیم محمد صادق علی خاں مشہور بہ حکیم آغا جان خلف حکیم محمد احسن خاں ابن حکیم محمد محسن خاں جن کا قدیم مسکن فیض بازار قریب دہلی دروازہ کوچہ تارا چند کٹرہ حکیم محسن خاں تھا جو زمانہ شاہ جہاں سے چلا آتا تھا۔ حکیم محسن خاں اپنی مسجد میں قریب مسکن دفن ہیں۔[1]

حکیم احسن اللہ خاں نے حکیم بدر الدین خاں کو جو سند عطا کی تھی، اس پر ۲۰ شعبان ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۸ دسمبر ۱۸۶۶ کی تاریخ اور مہر ثبت ہے، حکیم صاحب کی مہر "عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزماں حکیم محمد احسن اللہ خاں ۱۲۵۱" (۱۸۳۵ء) کی عبارت سے مزین ہے۔ حکیم بدر الدین

---

[1] امتحان الالباب لکافۃ الاطبا ص ۲۱۹

کا درس کا مشغلہ بھی تھا۔ ان کے تلامذہ میں حکیم سید نظیر حسین مشہور تھے۔ جنہوں نے ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں ان سے طب کی تکمیل کی تھی۔[1]

حکیم بدرالدین کا اہم علمی کام امتحان الالبا لکافۃ الاطبا کا اردو ترجمہ ہے، یہ ترجمہ بدرالدجیٰ کے نام سے باہتمام خواجہ مصلح الدین خاں مطبع مصلح المطابع دہلی سے محرم ۱۳۱۸ مئی ۱۹۰۰ء میں طبع ہوا ہے۔ گزارش مترجم میں انہوں نے لکھا ہے کہ یہ گوہر گراں بہا مجھے خزینہ کتب حضرت استاذی حکیم احسن اللہ خاں سے دستیاب ہوا۔ بلا مبالغہ ہندوستان کے تمام کتب خانے اس صحیفہ نایاب سے خالی ہیں۔ اس کے فضایل کی عمومیت اور فواید کی کثرت نے مجھے اس امر پر آمادہ کیا کہ میں اس کا ترجمہ اپنی ملکی زبان میں پیش کروں، اصل کتاب عبدالعزیز بن علی منتطب نے بعہد سید ابو زرا صفی الدین عربی میں لکھی تھی یہ دس ابواب پر مشتمل ہے۔ مخطوطہ ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء سے قبل کا نقل کردہ ہے۔ یہ مخطوطہ شاہان مغلیہ کے کتب خانہ کا ہے اور اس پر جلال الدین اکبر اور شاہ جہاں کی مہریں ثبت ہیں، اس کتاب میں چند ورق کم تھے۔ میں عرصہ سے اس فکر میں تھا کہ اس کا کوئی اور نسخہ ملے تو اس سے مقابلہ کر کے ترجمہ کی تکمیل کروں۔ ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں شائع کرانے کے باوجود اس کے دوسرے نسخے کی کہیں موجودگی کی اطلاع نہیں ملی۔ آخر اسی نسخہ سے ترجمہ کا کام شروع کیا، مولانا شبلی نعمانی علی گڑھ سے دہلی کسی تقریب میں آئے انہوں نے بھی اس کتاب کے کسی نسخہ سے اپنی عدم واقفیت ظاہر کی، کچھ عرصہ بعد جب وہ مصر اور قسطنطنیہ گئے اور وہاں کے کتب خانوں کی انہوں نے سیر کی تو اس کتاب کا ایک نسخہ خدیو کتب خانہ میں دیکھا اور ہندوستان آکر حکیم صاحب کو اس کی اطلاع دی، مولانا شبلی کے توسط سے حکیم صاحب نے اپنا نسخہ مصر بھجوایا اور جرجی زیدان کی معرفت کتب خانہ خدیویہ کے نسخہ سے گم شدہ اوراق کی باحتیاط نقل و مقابلہ کا کام انجام پایا۔ مولانا عبدالحق خیرآبادی اور مولانا عبدالحق حقانی سے ترجمہ میں حکیم صاحب کو مدد ملی۔[2]

---

[1] رموز حکمت ص ۱۷۰ [2] امتحان الالبا لکافۃ الاطبا ص ۱، ۲

صاحب نزہتہ الخواطر نے حسن معالجہ کے ساتھ ان کی سنجیدگی، متانت اور اعلیٰ اخلاق کی تعریف کی ہے۔ اور ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء میں ان کا انتقال لکھا ہے[1]

گوسوامی چنی لال

سمت ۱۹۲۳ کو پیدا ہوئے۔ آیورویدک اور طب کی کتابیں مختلف اساتذہ سے پڑھیں، ہندوستان کے بہت سے شہروں کی سیاحت کا اتفاق ہوا۔ اور مناسبت طبیعت کی وجہ سے جو وید یا طبیب صاحب کمال ملا ہر ایک سے کچھ نہ کچھ اکتساب کرنے کی کوشش کی، ویدک شاستروں کی تعلیم گنگا وشنو جی شاستری عرف گنگا بسوی رام جی سے حاصل کی۔ اور ان کی ہدایت کے بموجب پنڈت تارا چند جی وید سے بھی شاستروں کو تحصیل کیا۔ چنی لال جی نے ویدک شاستروں پر اس قدر محنت کی کہ ہزاروں اشلوک حفظ یاد تھے۔ مریضوں کے ساتھ خواہ امیر ہو یا غریب یکساں برتاؤ کرتے تھے۔
چنی لال جی نے اپنے والد سے فن موسیقی کی بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے والد گوسوامی پنا لال جی اس فن میں درجہ کمال رکھتے تھے۔ والد کے ہمراہ ملک کے متعدد راجوں اور نوابوں کے ہاں انہیں باریابی کا موقع ملا۔ ۱۸۹۹ء میں کمشنر دہلی کی معرفت لارڈ کرزن وائسرائے سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوا تھا[2]

پنڈت شیو نراین مذاق

شیو نراین مذاق کے مورث اعلیٰ پنڈت کرشن رائے جی مہاراج ایک بڑے

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد ۸ ص ۸۹

[2] رموز الاطبا جلد ۲ ص ۵۴۶

بزرگ اور علم وید و اپنشد سمرتی شاستر کے عالم وفاضل اور آیور ویدک کے ماہر تھے۔
لیکن انہوں نے اسے ذریعہ معاش کبھی نہیں بنایا۔ زمینداری اور مالی حالت معقول تھی
اس لیے عام طور پر کوٹھی وال کہلاتے تھے۔

پنڈت شیونراین نے آٹھ برس کی عمر میں تعلیم شروع کی۔ تین سال بعد سنسکرت
کا آغاز کیا۔ بعد ازاں دو برس تک فارسی کی تعلیم پائی۔ ابتدا میں مختلف محکموں میں سرکاری
ملازمت کی۔ اس کے بعد آیور ویدک اور یونانی کتابیں پڑھیں، محنت اور توجہ سے
مریضوں کا علاج کرتے تھے۔ شہرت اور نیک نامی حاصل تھی۔ دہلی میں انیسویں صدی کی
دوسری دہائی میں جب طاعون پھیلا تو یہ دن رات معالجہ میں مصروف رہے اور بڑی تعداد
میں مریض ان کے علاج سے شفایاب ہوئے۔ نیز طبیعت اور ذہین آدمی تھے شعر و شاعری کا بہت
شوق تھا۔ مذاقؔ تخلص کرتے تھے۔ رسالہ کمال دہلی میں ان کا کلام اکثر شایع ہوتا تھا۔[1]

حکیم انوار احمد انور

حکیم حافظ سید انوار احمد انور دہلوی خلف حافظ سید خیر الدین صحیح النسب سید
اور دہلی کے قدیم باشندہ تھے۔ شاہان مغلیہ ان کے اسلاف کرام کو عزت کی نگاہ سے
دیکھتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر سید خیر الدین کو اپنی طرف سے شاہ سلیمان چشتی سجادہ نشین
تونسہ شریف کی خدمت میں مع نذرانہ بھیجا کرتے تھے۔

حکیم صاحب کے بڑے بھائی حکیم احسن اللہ خاں کے شاگرد رشید تھے اور ریاست
پٹیالہ میں بزمرہ اطبا ملازم تھے۔ حضرت انورؔ طب میں اپنے بڑے بھائی کے شاگرد تھے
پنجاب یونی ورسٹی سے امتحان زبدۃ الحکما بھی پاس کیا تھا۔ علم رمل اور نجوم میں اچھا دخل
تھا۔ تشخیص مرض کے ساتھ قدرت نے ہاتھ میں شفا بھی عطا کی تھی۔ ابتدا میں حافظ غلام

---

[1] رموز الاطبا جلد ۱ ص ۱۷۲ و ۱۷۳

رسول وبرآں کو کلام دکھایا۔ بعد میں داغ سے تلمذ اختیار کیا۔ کچھ عرصہ حیدرآباد میں نواب ملایق الدولہ غالب جنگ کی سرکار میں بصیغہ طبابت ملازم رہے۔ ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں آبائی وطن دہلی میں انتقال کیا۔[1]

حکیم الٰہی بخش

دہلی کے مشہور طبیبوں میں تھے۔ ان کی شہرت کی اصل وجہ ان کی حذافت اور علاجی دسترس تھی۔ فراش خانہ میں مطب اور رہائش کا سلسلہ تھا۔[2]

حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں

۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ کنیت ابوسعید تھی۔ ابتدائی کتابیں مولوی عبدالرحیم اور باقی کتابیں مولانا محمد علی چاندپوری اور دوسرے علماسے پڑھیں۔ حدیث کے لیے مولانا نذیر حسین محدث دہلوی کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ طب کی تعلیم عم بزرگوار حکیم غلام مرتضیٰ خاں اور چچازاد بھائی حکیم غلام رضا خاں سے حاصل کی۔ مطب اپنے والد حکیم محمود خاں سے سیکھا۔[3]

حکیم محمود خاں کی زندگی میں مطب اور درس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور معالج و مدرس کی حیثیت سے بہت جلد صاحب امتیاز بن گئے تھے۔[4]

---

[1] خمخانہ جاوید جلد ۱ ص ۴۹۰

[2] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۳۲۱

[3] نزہۃ الخواطر جلد ۸ ص ۳۱۰

[4] سیرت اجمل ص ۶

مدرسہ طبیہ

خاندان شریفی میں درس کا سلسلہ بہت اوپر سے چلا آرہا تھا۔ دور دور سے طلبہ دہلی کے دوسرے اساتذہ کی طرح شریف خانی طبیبوں سے تحصیل طب کے لیے آتے تھے، ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں نیا نظام تعلیم جاری ہوا۔ طب کی تعلیم بھی جواب تک قدیم طرز پر جاری تھی۔ انفرادی طور پر درس کا سلسلہ، جس میں چند مخصوص کتابیں پڑھائی جاتی تھی، اور جماعتیں کتابوں کے نام سے قایم تھیں۔ مثلاً قانونچہ کی جماعت، شرح اسباب کی جماعت، کلیات قانون کی جماعت۔ جدید تقاضوں کے تحت طبی نظام تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت سب سے پہلے حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں نے محسوس کی۔ حکیم محمود خاں اور خود ان کے ہاں جو طلبہ زیر تعلیم تھے، ان کے درسی سلسلہ کو منظم کرنے کے لیے ۱۸۸۳ء میں انہوں نے اسے ایک مدرسہ کی شکل دی[1] چند برس شریف منزل ہی طبی درسگاہ کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ اس کے بعد ۱۸۸۸ء میں انہوں نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں اور حکیم جمیل الدین کے تعاون سے ایک باقاعدہ مدرسہ کے قیام کا منصوبہ بنایا، چنانچہ ۱۸۸۸ء میں ایک مشاورتی جلسہ طلب کیا گیا۔ جس میں مدرسہ طبیہ جاری کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ عمائد شہر ہندو اور مسلمان جمع تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے جلسہ میں تقریر کی اور اس تجویز کو بہت سراہا گیا۔

۲۲ شوال ۱۳۰۶ھ / ۲۳ جون ۱۸۸۹ء کو افتتاحی تقریب منعقد کی گئی، مسٹر آر کلارک ڈپٹی کمشنر دہلی نے افتتاح کیا۔ اس شاندار افتتاحی جلسہ میں سر سید احمد خاں، جلال الدین نواب ممتاز علی خاں رئیس دوجانہ، صاحب عالم مرزا سلیمان شاہ گورگانی، نواب محمد

---

[1] حکیم اجمل خاں ص ۱۳۰

[2] طب یونانی ۱۹۰۱ سے ۱۹۴۷ تک۔ سید ظل الرحمن۔ یادگاری مجلہ علم الادویہ سیمینار ص ۳

اسحٰق خاں، لالہ رام کشن داس، لالہ سری کشن داس، ڈپٹی ہادی حسین، مولوی حشمت اللہ خاں (میرٹھ) مولوی لطف اللہ علی گڑھ، نواب رضا علی خاں رئیس رامپور، نواب احمد علی خاں رئیس رامپور، میجر شمشیر بھیا رئیس گوالیار، شاہزادہ والا گوہر، ملا اسمٰعیل منڈالی برما اور دہلی کے بکثرت لوگ شریک تھے[1] سرسید اور ڈپٹی نذیر احمد کی تقریریں ہوئیں۔ نذیر احمد نے ایک طویل نظم اس موقع پر پیش کی۔ ۱۸۹۰ء میں مدرسہ طبیہ کا پہلا سالانہ جلسہ بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہوا۔ ڈپٹی کمشنر میر مجلس تھے۔ ڈپٹی نذیر نے زوردار تقریر کی۔ ڈپٹی نذیر مدرسہ کے ہر جلسہ میں پابندی سے شریک ہوتے تھے اور ان کی تقریر تقریب کا لازمی حصہ تھی۔ ان کے لیکچروں کے مجموعہ میں یہ تقاریر شامل ہیں ان کی نظمیں بھی بڑی طویل ہوتی تھی، سرسید بھی ان جلسوں میں شریک ہوتے رہے مدرسہ طبیہ کے آٹھویں سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۷ء میں سرسید شریک تھے[2]

۱۸۸۹ء میں مدرسہ طبیہ شریف منزل سے اٹھ کر گلی قاسم جان میں نواب صاحب لوہارو کے مکان میں جو ڈپٹی ہادی حسین خاں کے مکان سے متصل تھا قائم ہوا تھا۔ حکیم عبدالرشید خاں اس کے پہلے پرنسپل تھے۔ یہاں سے تقریباً ۱۹۱۵ء میں یہ چوڑی والان میں ڈپٹی سلطان خاں کی حویلی میں منتقل ہوا۔ اس کے قریب مدرسہ طبیہ زنانہ تھا۔ جو ۱۹۰۸ میں قائم ہی وہیں ہوا تھا۔ چوڑی والان میں مدرسہ طبیہ صرف پانچ برس رہا۔ پھر طبیہ کالج کی تعمیر ہونے پر ۱۹۲۱ء میں قرول باغ منتقل ہو گیا[3]

۱۸۹۰ء میں حکیم عبدالمجید خاں کو حاذق الملک کا خطاب عطا کیا گیا، ٹاؤن ہال میں شاندار پیمانہ پر دہلی کے شہریوں کی طرف سے تہنیتی جلسہ منعقد ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے جو نظم پیش کی اس کا ایک شعر ہے ؎

---

[1] لیکچروں کا مجموعہ جلد ۱ ص ۱۷۵ [2] ایضاً جلد ۲ ص ۱۷۷

[3] نواب لوہارو کے اسی مکان میں ۱۹۴۷ کے بعد جامعہ طبیہ منتقل ہوا، اور تقریباً ۳۳ برس کے بعد ۱۹۸۰ میں ہمدرد طبی کالج کے نام سے ہمدرد نگر تغلق آباد اس کی منتقلی عمل میں آئی اور آج وہ جامعہ ہمدرد کا ایک حصہ ہے۔ [4] قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین ص ۲۴۲

ہوتی ہے یوں تو اوروں کو عزت خطاب سے — لیکن ہوئی خطاب کو عزت جناب سے

اپنی تقریر میں انہوں نے کہا "خطاب اگرچہ دوسرے حضرات کو بھی ملے. لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ اہل شہر حکیم عبدالمجید خاں کے خطاب پر حکومت کے شکریہ کے لیے جمع ہوئے ہیں، حکومت کو اندازہ ہوگا کہ انہیں خطاب عطا کر کے نہ صرف حکیم عبدالمجید خاں کو بلکہ تمام اہل شہر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ممنون احسان کیا ہے[1]"

حکیم عبدالمجید خاں کی اعلیٰ طبی قابلیت اور حیرت انگیز معالجات نے ان کی شخصیت کو بہت بلند کر دیا تھا. بڑی بڑی ریاستوں میں انہیں رسوخ اور وقار حاصل تھا. درس میں بے مثل سمجھے جاتے تھے. کلیات قانون کے درس میں خاص امتیاز حاصل تھا. قدما کی کتابوں پر بڑی نظر تھی، وہ بہت اچھے مقرر تھے. دیر تک بے تکان بولتے تھے روایت خاندان کے مطابق انہوں نے ثقافت کو فروغ دینے کے سامان فراہم کئے ان کے ہاں علم و ادب اور شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں. دہلی کے منتخب شعرا ادبا اور عمائدین شریک ہوتے تھے. لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ ۱۸۹۸ء میں قاضی محمد خلیل حیرآن خلف خان بہادر قاضی عبدالجمیل متخلص بہ جنون رئیس اعظم بریلی حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں کے طلب و تقاضہ پر بغرض علاج و سیر دہلی تشریف لائے تھے اور ان کے علمی جلسوں اور بے تکلف صحبتوں میں ہر وقت شریک رہتے تھے. ایک روز چند شاعر جمع تھے جن میں سید مہدی مجروح (شاگرد غالب) قابل ذکر ہیں، شاعری کا تذکرہ ہوا. سب صاحبوں نے کچھ نہ کچھ نظم کیا. قاضی صاحب نے بھی چند رباعیات فی البدیہہ کہیں جن میں سے ایک یہ تھی. ے

اے بوسعید حاذق ملک و وحید خلق — یکتا توئی. وحید زمان و فرید خلق
محمود دہر و صادق عہد و شریف وقت — عبدالمجید، عبد مجید و مجید خلق

---

[1] لیکچروں کا مجموعہ جلد ۲ ص ۲۴۵

اسی طرح پھر ایک مرتبہ چند شعرا کا مجمع تھا۔ اسمٰعیل حسین منیر کے قصیدہ فریاد زنداں کا تذکرہ تھا۔ احباب نے قاضی صاحب سے بھی فکر فرمانے کا اصرار کیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک طویل قصیدہ اسی زمین میں رقم کیا۔[۱]

حکیم عبد المجید خاں کے زیر علاج بڑے بڑے یہودی اور عیسائی علما بھی رہتے تھے چنانچہ ان کے زیر علاج ایک یہودی عالم سے مولانا شرف الحق صدیقی (وفات ۱۹۳۶ء) نے عبرانی و یونانی زبان پڑھی۔ اس نے انہیں تحریری سند عبرانی زبان میں دی تھی۔ جس کے نیچے اس کا اردو ترجمہ حکیم اجمل خاں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ۱۸۶۸ء میں دہلی میں اس کا مناظرہ لارڈ بشپ لیفرائے سے مسجد فتحپوری کے اندر ہوا۔ اس میں معززین شہر اور مشاہیر علما کے علاوہ اطبا میں حکیم محمود خاں، حکیم اجمل خاں، حکیم احمد سعید خاں، حکیم سمیع الدین بقائی شامل تھے۔[۲] ملا واحدی نے لکھا ہے کہ میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دلی میں بے تاج کا بادشاہ حکیم عبد المجید خاں کو دیکھا۔[۳]

دہلی کی درگاہ قدم شریف کی مسجد و حریم اور مجلس خانہ بوسیدہ ہو گئے تھے۔ حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں اور شاہ محمد عمر اخوندجی (وفات ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء) نے ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء میں دو ڈھائی ہزار روپیہ کے صرفہ سے اس کی تعمیر کرائی۔[۴]

بیرون دہلی حکیم صاحب کی فیس ایک ہزار روپیہ یومیہ تھی۔ لیکن دہلی میں کوئی فیس نہیں لیتے تھے، صاحب نزہۃ الخواطر نے عجایب الزمن اور محاسن الہند جیسے الفاظ میں ان کی تعریف کی ہے[۵] حکیم صاحب کا دہلی کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی سے گہرا تعلق تھا۔

---

[۱] خمخانہ جاوید جلد ۲ ص ۵۳۵

[۲] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۳۲۱

[۳] ایضاً ص ۳۲۱

[۴] ایضاً ص ۳۲۴

[۵] نزہۃ الخواطر جلد ۸ ص ۳۱۰

راشد الخیری نے دلی کے پیر غیب کے میلہ کا ذکر کیا ہے۔ جسے دلی نے ۱۸۵۷ء کے بعد برسوں منایا۔ ہر جمعرات کو لوگ شام کو جمع ہو جاتے تھے اور اہل فن کمال اپنا دکھا کر داد لیتے تھے۔ اور شہر والوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں چاروں طرف زندگی کا لطف اٹھاتی پھرتی تھیں، کہیں طبلہ اور ستار، کہیں کشتیاں، کہیں تیر، کہیں مداری کا تماشہ، اگر آج یہ چیز معیوب نہ سمجھی جائے تو کہہ دوں کہ حکیم عبد المجید خاں جو امیر الدین نبولے اور اسمٰعیل انیچو کے عاشق تھے۔ کبڈی میں کھڑے اور اکھاڑے میں بیٹھے حوصلہ افزائی کرتے تھے[1]۔

۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۹ھ/۱۱ جولائی ۱۹۰۱ء بعارضہ ورم جگر ۵۳ برس کی عمر میں وفات پائی، درگاہ حسن رسول نما میں دفن ہوئے، حکیم محمد احمد خاں اور حکیم ظفر احمد خاں دو صاحبزادہ تھے، شد ہائے غروب مہر طب یونان مادہ تاریخ ہے، دیگر تاریخیں ملاحظہ ہوں، ان اللہ عزوجل محی و ممیت وھو حی لایموت ۱۳۱۹۔ مرقد پاکیزہ حاذق الملک ۱۳۱۹۔ حکیم لیمنت ارسطو حکمت ۱۳۱۹۔ افضل الحکما بو علی سینا رہند ۱۳۱۹۔ طبیب دانا امام طب حکیم ابو سعید محمد عبد المجید خاں ۱۳۱۹۔ ابن حکیم محمود خاں قدس سرہ ۱۳۱۹، روز چہارم بیست و سہ ربیع الاول اوائل سنہ یک ہزار سہ صد نوزدہ ہجرت نبوی ۱۳۱۹۔ صبحگاہ داعی حق را لبیک اجابت فرمودہ ۱۳۱۹، وچابک بجناں شتافت ۱۳۱۹۔ وجنت نصیب زندگانی و جاودانی یافت ۱۳۱۹۔ یا صمد نور مضجعہ ۱۳۱۹۔

حکیم واصل خاں

۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے، نامور باپ کے لاڈلے بیٹے تھے۔ حکیم محمود خاں دوسرے بیٹوں سے زیادہ ان سے محبت کرتے تھے۔ حکیم واصل خاں کا بیان ہے کہ بیس برس کی عمر تک طبیعت تعلیم کی طرف مائل نہیں تھی، فن کشتی کا شوق تھا اور ہر وقت ورزش

---

[1] دلی کی آخری بہار ص ۹۰

اور اہل ورزش کی باتیں ہوتی تھیں، ایک روز خیال ہوا کہ اگر خاندانی فن حاصل نہ کیا تو پھر فن دانی کا دعویٰ کیسے کیا جائے گا. چنانچہ دن میں احباب کا مجمع رہنا اور شب کو پڑھائی میں وقت صرف کرنا. صبح منشی رضی الدین سے فن خطاطی سیکھنا. حکیم غلام رضا خاں سے اور زیادہ کتابیں حکیم عبدالمجید خاں سے پڑھیں. ان کے شوق کو دیکھ کر ان کی علمی حالت خود حکیم محمود خاں نے اپنی نگرانی میں درست کی. اور مطب سکھایا، والد بزرگوار اور برادر معظم کی موجودگی میں بھی ان کا مطب کامیاب تھا[1]

حکیم عبدالمجید خاں کی وفات کے بعد ان کی ذات مرجع خاص و عام تھی. خاندانی مطب درس اور مدرسہ طبیہ کی نگرانی سب ان کے ذمہ تھی. امرا و رؤسا علاج میں ان کے معتقد تھے. نواب صاحب دیر ہمیشہ انہی کے زیر علاج رہتے تھے. ڈپٹی نذیر احمد نے ایک نظم میں ان کی طبی قابلیت کا اعتراف کیا ہے. اس کا ایک شعر ہے ؎

عزیزو اک سخن ہم تم سے استفسار کرتے ہیں — کہ واصل خاں کے ہوتے کس لیے بیمار پڑتے ہیں

حکیم صاحب کو فنی کاموں سے ہمیشہ گہری دلچسپی رہی. اپنے برادر خرد حکیم اجمل خاں کے مشورہ اور تعاون سے انڈین میڈیسنز کمپنی قائم کی[2] یہ کمپنی آگے چل کر ہندوستانی دواخانہ کے نام سے موسوم ہوئی. حکیم واصل خاں شروع میں بہت غصہ ور تھے، لیکن احساس ذمہ داری نے اس کمزوری پر قابو پا لیا تھا، اور مزاج میں تحمل و بردباری بڑھ گئی تھی[3]

لباس ہمیشہ مشرقی پہنتے تھے. ململ کا انگرکھا، اوپر سے ایک نیم آستینہ اور مشروع کا چست پاجامہ[4] عمر نے وفا نہ کی اور بڑے بھائی کی وفات کے ساڑھے تین سال بعد ۳ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ / ۲۲ فروری ۱۹۰۵ کو دنیا سے رخصت ہو گئے. درگاہ حسن رسول نما میں

---

[1] تذکرۃ الخواجگان ص ۱۰۱

[2] تذکرہ مسیح الملک ص ۱۴۱. حیات اجمل ص ۲۷

[3] حکیم اجمل خاں ص ۱۴۰

[4] تذکرۃ الخواجگان ص ۱۰۲

دفن ہوئے[1]۔ تاریخ وفات ہے

چوں شدہ واصل حق واصل خاں	ایں چنیں مرد گزیں فرد زماں
از خرد سال وصالش جستم	گفت دشوار نبگری آساں
باز گو آنچہ بگفتی اول	کہ شد واصل حق واصل خاں ۱۳۲۲

دیگر

آں نکتہ دان علم طب و حاذق زماں	کز دست پر شفاش جہانی بسود شد
رفتہ زدہر و برق پی سال فوت او	واصل بجود در رحمت رب ودود شد

حکیم واصل خاں کو شعر و ادب سے بھی ذوق تھا۔ داغ کے ساتھ نشست رہتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے داغ سے پوچھا کہ آپ کے بعد آپ کی زبان لکھنے والا بھی کوئی باقی رہے گا۔ جواب میں داغ نے بیخود کا نام لیا[2]۔

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں

حکیم محمود خاں کے چھوٹے صاحبزادہ حکیم اجمل خاں، ۷ شوال ۱۲۸۴ھ ۱۱ فروری ۱۸۶۸ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں مولوی دائم علی سے حفظ قرآن مجید کی سعادت حاصل ہوئی۔ دہلی کے اس زمانہ کے بہترین اساتذہ سے تعلیم کا موقع ملا۔ صرف و نحو بیر جی صدیق احمد دہلوی، منطق و فلسفہ شمس العلما مولوی عبد الحق حقانی اور مولوی حکیم عبد الرشید رامپوری اور دیگر علوم مرزا عبید اللہ بیگ، حکیم مولوی جمیل الدین اور دوسرے اساتذہ سے پڑھے۔ خوشنویسی میں خلیفہ محمد امیر پنجہ کش اور مولوی رضی الدین سے مہارت پیدا کی۔ طب کی تعلیم خاندان کے بزرگوں حکیم محمود خاں

---

[1] سیرت اجمل ص ۶

[2] گنجینہ گوہر ص ۱۵

حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم غلام رضا خاں سے حاصل کی[1] مطالعہ اور کتب بینی کا شروع سے شوق تھا. شوق مطالعہ اور ذوق علم کی وجہ سے حکیم محمود خاں ان کو ملّا کہا کرتے تھے[2]

۱۸۸۳ء میں مدرسہ طبیہ کے قیام کے وقت اگرچہ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی، لیکن انہوں نے مدرسہ میں دلچسپی لینی شروع کی۔ اور کچھ عرصہ بعد درس کا سلسلہ بھی جاری کیا. درس و تدریس کے دوران انہیں طب یونانی کے مسایل پر آزادانہ غور وفکر کا موقع ملا، اور ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی۔

۱۸۹۲ء میں وہ ریاست رامپور میں طبیب خاص کے عہدہ پر فایز ہوئے تقریبًا ۹ برس ۱۹۰۲ء تک وہاں ان کا قیام رہا. رامپور میں عرب طبیب مکی جیسا ادیب شہیر موجود تھا، حکیم صاحب نے ان سے عربی زبان و ادب میں مہارت بہم پہنچائی. یہ طبیب مکی کی ادبی تربیت کا نتیجہ تھا کہ حکیم صاحب بلا تکلف عربی زبان میں گفتگو کرتے تھے. عراق اور مصر کے سفر میں ان کی عربی دانی کا اظہار ہوا. مولانا شبلی کا کہنا تھا کہ میری نظر میں ہندوستان بھر میں حکیم اجمل خاں سے زیادہ کوئی شخص قابل عزت نہیں ہے کیونکہ علم و امارت کا ان سے بہتر پیکر ملنا مشکل ہے[3] رامپور میں ان کے فارسی ذوق کی بھی نشوونما ہوئی، ریاست میں اہل علم کا بے نظیر اجتماع تھا. شعر وسخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، حکیم صاحب کی ان میں شرکت رہتی تھی. رامپور میں دوسرا بڑا فائدہ ریاست کے کتب خانہ سے استفادہ تھا، اس کا اہتمام ان کے سپرد ہوا، انہوں نے نہ صرف نادر مخطوطات کا مطالعہ کیا بلکہ بہت سے اہم قلمی نسخوں کی نقلیں بھی حاصل کیں. حکیم صاحب نے جن کا تعلق کتب خانہ سے ۱۸۹۶ء میں قائم ہوا تھا کتب خانہ

---

[1] تذکرۃ الخواجگان ص ۱۰۳

[2] تذکرہ مسیح الملک ص ۱۶

[3] ایضًا ص ۱۹

کی فہرست بھی مرتب کی ہے۔ یہ ۱۹۰۱ میں طبع ہوئی تھی۔ اس پر سات صفحے کا ان کا عالمانہ مقدمہ ہے۔

حکیم عبدالمجید خاں کے انتقال کے بعد حکیم اجمل خاں کو سب سے زیادہ فکر مدرسہ طبیہ کی ہوئی۔ جس کی نگرانی کا تمام باران کے کاندھوں پر آگیا تھا۔ ۱۴ اگست ۱۹۰۱ کو دہلی کے ٹاؤن ہال میں ڈپٹی کمشنر کی زیر صدارت ایک عام جلسہ ہوا۔ اور حکیم صاحب نے ایک لاکھ روپیہ کے لیے اپیل شایع کی، اس اپیل میں انہوں نے بتایا کہ اب تک ۶۵ طلبہ اس مدرسہ سے سند حاصل کر چکے ہیں[1]

۱۹۰۴ء میں حکیم صاحب عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے اور انہوں نے ستمبر سے آخر نومبر تک تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے میرٹھ لاہور منٹگمری اور دوسرے مقامات کے سفر کئے لیکن صحت یابی نہیں ہوئی، مزید تبدیلی کے لیے ۱۱ مارچ ۱۹۰۵ کو وہ عراق کے سفر پر روانہ ہوتے اس سفر کا ان کی صحت پر خوشگوار اثر پڑا۔ ۹۰۱ جون کو واپسی پر اہل دہلی نے ان کا شایان شان استقبال کیا، عراق میں حکیم صاحب نے بصرہ، نجف، کربلا اور دوسرے مقامات مقدسہ کی زیارت کی تھی۔

۱۹۰۴ء میں انہوں نے یونانی اینڈ ویدک میڈیسنز کمپنی کا اجرا کیا، یہ کمپنی مشترکہ سرمایہ سے قائم کی گئی تھی اور اس میں شہر کے ممتاز اصحاب شریک تھے۔ اس کو مزید وسعت دیتے ہوتے انہوں نے ہندوستانی دواخانہ کی بنیاد ڈالی اور شرکا کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے حصص مدرسہ طبیہ کے حق میں فروخت کر دیں[2] ۱۹۰۷ء میں حکیم صاحب نے شعبہ ادویہ کی تہذیب و اصلاح کے لیے ایک زبردست اسکیم تیار کی، دواؤں کی تیاری اور کاروباری نظام کو بہتر بنایا گیا، ۱۹۱۰ء میں دواخانہ کی عمارت تعمیر کی گئی اور کچھ ہی عرصہ بعد دواخانہ ترقی کر کے کالج کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بن گیا۔

---

[1] حیات اجمل (عغفار) ص ۵۲

[2] حیات اجمل (رشید احمد) ص ۷۷

فروری ۱۹۰۶ء میں حکیم صاحب نے طبی کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ ۲۶، ۲۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو اس کا پہلا کل ہند اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ اس کے ذریعہ انہوں نے ملک کے اطبا کو ایک مرکز پر جمع کر کے دیسی طبوں کی بقا اور تحفظ کے لیے جدوجہد شروع کی اور ان کے روشن مستقبل کے لیے اہتمامات کئے۔ جنوری ۱۹۰۸ء کو انہیں قدیم خاندانی خطاب حاذق الملک حکومت کی طرف سے عطا کیا گیا۔

جنوری ۱۹۰۹ کو انہوں نے مدرسہ طبیہ زنانہ کا لفٹنٹ گورنر پنجاب کی اہلیہ لیڈی سرلوئی ڈین سے افتتاح کرایا۔ یہ مدرسہ چوڑی والان میں حویلی ڈپٹی سلطان خاں کی متصل عمارت میں قائم ہوا تھا بعد میں یہاں سے طبیہ کالج قرول باغ میں منتقل ہوا۔ اس میں پہلے صرف فن قبالت کی تعلیم دی جاتی تھی بعد میں یونانی اور آیورویدک کی تعلیم بھی شامل کی گئی۔[1]

۲۶ ، مارچ ۱۹۱۰ کو دہلی میں ندوۃ العلمار کا اجلاس منعقد ہوا، حکیم صاحب صدر اجلاس منتخب ہوتے۔ ان کے صدارتی خطبہ سے ان کے مصلحانہ نقطہ نظر کا اظہار ہوتا ہے وہ ۱۹۱۰ سے ۱۹۲۵ تک مسلسل پندرہ برس ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے رکن رہے۔ ۱۰ مئی ۱۹۱۴ کو انہوں نے دہلی میں تحریک اصلاح ندوہ کا اجلاس طلب کیا تھا۔ ۸ نومبر ۱۹۲۶ کو ندوہ کی تاریخ میں دوسری دفعہ انہوں نے کانپور کے اجلاس ندوۃ العلما کی صدارت کی۔

علی گڑھ تحریک سے حکیم صاحب کو شروع سے دلچسپی رہی۔ ۱۸۹۲ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ساتواں اجلاس دہلی میں ہوا تو حکیم صاحب مجلس استقبالیہ کے سکریٹری تھے۔ دہلی میں کانفرنس کی مخالفت زور و شور سے کی گئی، لیکن حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم اجمل خاں نے مخالفتوں کی پروا نہ کر کے سرسید کی تعلیمی تحریک کا پورا ساتھ دیا۔ رامپور کے زمانہ قیام میں حکیم صاحب کی تحریک پر نواب محسن الملک علی گڑھ کالج

---

[1] حیات اجمل (رشید احمد) ص ۱۷

کی طرف سے وفد لے کر رامپور گئے۔ جنہیں نواب رامپور نے پچاس ہزار روپیہ کا عطیہ دیا حکیم صاحب کی وجہ سے رامپور میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بھی کامیاب جلسہ ہوا۔ اسی زمانہ میں ۱۹۰۰ء میں حکیم صاحب علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی مقرر ہوتے۔

۱۹۱۱ء میں حکیم صاحب شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی میں نواب رامپور کے قائم مقام کی حیثیت سے شرکت کے لیے انگلستان تشریف لے گئے، وہاں ان کی شاہی طریق پر عزت کی گئی۔ مشہور اخبارات نے تصاویر شائع کیں اور ان کے طبی و ملکی مرتبہ اور سلاطین مغلیہ کے ساتھ خاندانی تعلقات کو واضح کیا۔[1] حکیم صاحب لندن میں ڈیڑھ ماہ قیام پذیر رہے، سر تھیوڈر ماریسن سابق پرنسپل علی گڑھ کالج کی وساطت سے لندن کے ہسپتال، میڈیکل کالج دیکھنے کے علاوہ انہوں نے انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں کافی وقت گزارا، اور وہاں کے نوادرات کا مطالعہ کیا، وہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونی ورسٹی بھی گئے۔ مشہور مستشرق ای جی براؤن سے بھی ملے جو ان سے تبادلہ خیالات کر کے بہت محظوظ ہوئے۔ انگلستان سے واپسی پر پیرس تشریف لے گئے۔ وہاں کے عظیم الشان ہسپتال اور دوسرے تاریخی مقامات کا دورہ کیا۔ پیرس سے برلن کا سفر کیا، میڈیکل کالج، ہاسپٹل اور دوا سازی اور آلات جراحی کے کارخانے دیکھے، اور طب اور دوا سازی کی ترقی سے بہت متاثر ہوئے۔ برلن کی ادرینشل لائبریری کا بھی معائنہ کیا اور اس کی نادر کتابیں دیکھیں۔ ویانا کے شفاخانوں کا بھی معائنہ کیا وہاں سے قسطنطنیہ پہنچے۔ میڈیکل کالج، شفاخانوں اور تاریخی مقامات کی سیر کی، قسطنطنیہ سے قاہرہ تشریف لے گئے۔ جامعہ ازہر اور دوسری قابل دید جگہوں [illegible] وقت گزارا، قسطنطنیہ اور قاہرہ میں ان کے احباب نے ان کا پرجوش [illegible] ہندوستان آنے پر بمبئی اور دہلی میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ انگلینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریا، ترکی اور مصر کی اس سیاحت میں حاصل تجربات مشاہدات سے فائدہ اٹھا کر

---

[1] تذکرہ مسیح الملک ص ۳۶

انہوں نے ہندوستانی دوا خانہ اور مدرسہ طبیہ میں چند اہم اصلاحات کیں۔ مجلہ طبیہ جولائی ۱۹۱۱ء کے مطابق "وہ پہلے شخص ہیں جن کو یورپ کی سرزمین میں ایشیا کی طبوں کی زندگی کے لیے لوگوں نے کام کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ پہلے ہندوستانی ہیں جن کا بحیثیت اس کے کہ وہ ہندوستان کے طبیب اعظم ہیں یورپ میں جا بجا خیر مقدم ہوا۔ اور انہوں نے نہ صرف رسمی ملاقاتوں بلکہ طبی مشوروں سے جا بجا یورپ والوں پر طب اسلامی کی قدر و وسعت کا حال آئینہ کیا۔ وہ پہلے فاضل طبیب ہندوستانی ہیں جن کو یورپ میں اتنی بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ بڑے بڑے امراء، علماء ان سے ملاقات کرنے ان کی فرودگاہ پر آتے رہے۔ صدہا لوگوں سے ان کی ملاقاتیں اور گفتگوئیں ہوئیں حکومت نے ان کو اعزاز بخشا اور ان کی شہرتیں بلاد مغرب میں نئے ساز و سامان کے ساتھ ہوتی رہیں"[1] اسی سفر میں لندن کے چیرنگ کراس ہسپتال میں حکیم صاحب کی ڈاکٹر انصاری سے ملاقات ہوئی تھی۔ قسطنطنیہ میں اسی زمانہ میں نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال بھی تشریف لائی ہوئی تھیں۔ وہاں حکیم صاحب کو زیادہ تر بیگم صاحبہ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔

۱۱ دسمبر ۱۹۱۱ کو جارج پنجم نے دہلی میں دربار کیا۔ حکیم صاحب لندن کے دربار تاجپوشی میں شرکت کے بعد اب دہلی کے دربار میں بھی شریک ہوئے۔ ایک دوسرے موقع پر لارڈ ہارڈنگ نے خاص طور پر انہیں جارج پنجم کی خدمت پیش کیا۔ اس زمانہ میں حکیم صاحب کے تعلقات لارڈ ہارڈنگ سے بہت دوستانہ ہو گئے تھے یہ تعلقات سیاسی اختلافات کے باوجود آخر تک باقی رہے۔ ۲۹، مارچ ۱۹۱۶ کو لارڈ ہارڈنگ نے طبیہ کالج کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ تقریباً پانچ سال بعد کالج کی نہایت وسیع اور شاندار عمارت کی تکمیل کے بعد ۱۹۲۱ء میں انہوں نے گاندھی جی کو کالج کے افتتاح کی دعوت دی اور ایک بہت بڑے جلسہ میں رسم افتتاح انجام پائی۔

---

[1] سیرت اجمل ص ۷۵

جون ۱۹۱۷ کی ابتدائی تاریخوں میں حکیم صاحب نے اجمیر میں دارالعلوم معینیہ عثمانیہ کے سالانہ جلسہ کی صدارت کی۔ اس موقع پر مشائخ وصوفیا کے متعلق اپنی رائے نیز نصاب تعلیم، ترویج علوم اور تحفظ تحقیقات قدیم کا اپنی تقریر میں خاص طور پر ذکر کیا۔ ۲۶ جون کو انہوں نے نظارۃ المعارف قرانیہ کے پہلے جلسہ کی دہلی میں صدارت کی، اس تحریک کے بانی مولانا عبیداللہ سندھی تھے۔

مسجد کانپور کے سانحہ نے حکیم صاحب کو بہت متاثر کیا اور وہ کئی ماہ اس سلسلہ میں بیحد مصروف رہے۔ ڈاکٹر انصاری نے لکھا ہے کہ مجروحین کی دیکھ بھال اور مقدموں کی پیروی کے لیے فنڈ کی فراہمی میں حکیم اجمل خاں نے منجملہ اور سربرآوردہ مسلمانوں کے نمایاں حصہ لیا۔ وہ قریب قریب ہر ہفتہ مجھ کو اپنے ہمراہ لے کر دلی سے کانپور جایا کرتے تھے۔[1]

۱۹۱۷ء میں انہوں نے دہلی میں اسلامیہ کالج کے قیام کے لیے کوششوں کا سلسلہ تیز کیا، اور بہت کم وقت میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ جمع کر لیا۔ لیکن بعد میں ان کی توجہ جامعہ ملیہ کی طرف ہوگئی۔ اور دہلی میں اسلامیہ کالج کے قیام کی تجویز آگے نہیں بڑھ سکی۔[2]

نومبر ۱۹۲۰ میں حکیم صاحب، علی برادران اور ان کے ہم خیال دوسرے ٹرسٹیوں نے تمام ممبران یونی ورسٹی کورٹ کو دعوت دی کہ وہ حکومت سے امداد لینا بند کریں۔ اس لیے کہ اس کے ذریعہ حکومت اپنا اثر و اقتدار یونی ورسٹی کے نظم ونسق میں بڑھا رہی ہے۔ لیکن کثرت رائے سے یہ تجویز منظور نہیں ہوئی۔ ان لوگوں نے طلبہ کالج سے عدم تعاون کی اپیل کی اور تقریباً چھ سو طلبہ نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو چھوڑ دیا۔ ان کے لیے ایک مستقل درسگاہ قائم کرنا ضروری ہوا۔ ۵ نومبر ۱۹۲۰ کو مولانا محمودالحسن علی گڑھ آئے اور یونی ورسٹی جامع مسجد میں بہت بڑے جلسہ میں جامعہ ملیہ کی افتتاحی رسم ادا فرمائی۔ مرکزی خلافت کمیٹی نے جامعہ ملیہ کے لیے دس ہزار روپیہ ماہانہ کی گرانٹ

---

[1] حیات اجمل (غفار) ص ۱۳۵

[2] سیرت اجمل ص ۱۰۷

منظور کی۔ حکیم اجمل خاں امیر الجامعہ اور عبد المجید خواجہ شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد مسلم یونی ورسٹی سے حکیم صاحب کا تعلق ختم ہو گیا اور انہوں نے یونی ورسٹی کے کسی جلسہ میں شرکت نہیں کی، لیکن ۱۹۲۷ میں جب علی گڑھ میں طبیہ کالج کا قیام عمل میں آیا تو حکیم اجمل خاں اس کی تقرراتی کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ بعد میں حکیم صاحب کی کوشش سے جامعہ ملیہ کو دہلی منتقل کیا گیا اور وہ آخر زندگی تک امیر جامعہ کے منصب پر فائز رہے۔

دہلی میں حکیم صاحب کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ نومبر ۱۹۲۱ء میں ہندو مہاسبھا کے اجلاس دہلی کے وہ صدر مجلس استقبالیہ منتخب کئے گئے۔ وہ تنہا مسلمان تھے جو مہاسبھا کے پلیٹ فارم پر اس حیثیت سے نظر آتے اور جن پر اس طرح مہاسبھا نے اظہار اعتماد کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ہندو مہاسبھا کے رجحانات اس زمانہ میں اس قدر شدید نہ تھے جتنے کہ بعد میں ہوئے۔ پھر بھی یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ دہلی میں حکیم صاحب کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا اعتماد اس قدر حاصل تھا جتنا کسی دوسرے مسلمان کو کبھی حاصل نہیں ہو سکا۔ حکیم صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں صرف ایک ہی نقطہ اتحاد پر سارا زور دیا اور تاریخی اسناد پیش کر کے بتایا کہ مسلمان بادشاہوں نے کس حد تک گائے کی قربانی کے متعلق رواداری اور وسیع الخیالی کا ثبوت دیا تھا۔[1]

۱۹۲۵ء میں انہوں نے بحالی صحت کے لیے یورپ کا دوسرا سفر کیا، جس جہاز سے حکیم صاحب روانہ ہوتے اسی جہاز سے ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ریڈنگ بھی انگلستان جا رہے تھے۔ ۲۳۔ اپریل کو حکیم صاحب پیرس پہنچے۔ ایک ماہ قیام رہا۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی ان دنوں وہاں مقیم تھے اور حکیم صاحب سے گہرے روابط رکھتے تھے۔ ضیافتوں، جلسوں اور ملاقاتوں کے علاوہ جن کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا تھا، ۲۳ اپریل سے ۲۳ مئی ۱۹۲۵ تک پورا مہینہ پیرس میں اس طرح گذرا

---

[1] حیات اجمل (غفار) ص ۲۵۱

کہ کوئی لمحہ مصروفیت سے خالی نہیں تھا۔ حکیم صاحب جہاں جاتے اپنا ذوق علمی اور جذبہ اسلامی ساتھ لے جاتے تھے پیرس میں بھی ان کو سب سے زیادہ جدید مسجد اور کتب خانوں کے دیکھنے کا شوق تھا۔ پیرس کی نیشنل لائبریری میں صبح جاتے تھے اور شام کو نکلتے تھے۔ طب کی بہت سی کتابوں کی فوٹو کاپیاں بھی حاصل کیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ حکیم صاحب پیرس جاتے اور وہاں کی عمومی زندگی ان کی آمد سے بےخبر رہتی ہندوستانیوں کے علاوہ جنرل نادر خاں شاہ افغانستان اور ترکی و مصر کی گرامی منزلت شخصیتیں روسی کمیونسٹ ایک طرف اور مصر کے قوم پرست اور سرکاری جاسوس دوسری طرف کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو حکیم صاحب کی صحبتوں میں حاضر نہ ہوا ہو۔ جرمنی، فرانس اور لندن سے ہندوستانی طلبہ اور اہل علم حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ہز ہائی نس مہاراجہ بڑودہ اور ہز ہائی نس یوراج میسور کی رفاقتیں بھی انہیں وہاں حاصل رہیں۔

۲۴ مئی کو سوئزرلینڈ پہنچے، لوزین میں جھیل لیماں کے ایک کنارہ پر مقیم ہوئے۔ اور وہاں کے قدرتی مناظر سے بہت لطف اندوز ہوتے، جولائی تک قیام رہا۔ وہاں سے جینوا اور ویانا بھی جانا ہوا، ویانا وہ طبی نمائش دیکھنے گئے تھے تاکہ طبیہ کالج دہلی کے لیے سامان کی خریداری کے انتخاب کا موقع مل سکے۔ جامعہ ملیہ کے وہ طلبہ جو برلن میں زیر تعلیم تھے وہ ۱۰ جولائی کو حکیم صاحب سے ملنے ویانا آئے ان میں برکت علی، خواجہ عبدالمجید، عابد حسین اور محمد مجیب شامل تھے۔ حکیم صاحب نے ترکی جانا چاہا مگر وہاں کی حکومت نے صرف استنبول کی اجازت دی اور انقرہ آنے پر پابندی لگائی، حکیم صاحب نے ارادہ فسخ کر دیا اور مارسیلز ہوتے ہوئے براہ مصر شام کی جانب روانہ ہوئے۔ مصر میں ارکان موتمر خلافت، علماء ازہر ارکان جمعیتہ رابطہ شرقیہ اور دیگر اہل الرائے حضرات سے شب و روز ملاقاتیں رہیں۔ ہندوستانی طلبہ کا ایک ہجوم ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا، ہندو اور سندھی تاجروں نے شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ ایک ہفتہ قاہرہ میں قیام کر کے ۲۸ جولائی کو انہوں

نے فلسطین کے لیے سفر شروع کیا. شام اور لبنان میں حکیم صاحب نے ان ملکوں کے مشاہیر سے ملاقاتوں میں وقت گذارا. مفتی فلسطین سے بار بار ملاقاتیں ہوئیں، ۹ ستمبر تک ان ممالک کی سیاحت کی اور ۱۰ ستمبر کو پھر واپس آئے. اور ایک ہفتہ قیام کر کے وطن کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۵ ستمبر کو بمبئی پہنچے. حکیم اجمل خاں کو قومی اور ملکی سیاست سے شروع سے دلچسپی تھی. ابتدا میں وہ سیاست میں سرسید کے متبع تھے علی گڑھ کی قومی تعلیمی تحریک کو ان کی حمایت حاصل تھی، اپنے افراد خاندان کی طرح ان کا نام بھی حکومت کے وفاداروں میں شامل تھا. لیکن رفتہ رفتہ حالات ایسے مقتضی ہوئے کہ مسلمان سرسید کے سیاسی جادہ سے ہٹتے گئے اور انہیں ایک الگ شاہراہ بنانی پڑی. اکتوبر ۱۹۰۶ میں مسلمانوں کا ایک وفد گورنر جنرل سے ملا اس میں اجمل خاں بھی شریک تھے. ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرس کا ڈھاکہ میں اجلاس ہوا نواب وقار الملک صدر اجلاس تھے اس اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سنگ بنیاد رکھا گیا.[۱] نواب صاحب ڈھاکہ نے اس کے قیام کی تجویز پیش کی اور حکیم اجمل خاں نے اس کی تائید کی. لیگ کے جو ممبران پنجاب کی نمائندگی کرنے کے لیے نامزد کیے گئے ان میں حکیم صاحب کا نام نمایاں تھا. اس طرح وہ مسلم لیگ کے ابتدائی معماروں میں سے ایک تھے[۲] دسمبر ۱۹۰۷ کے لیگ کے اجلاس کراچی میں ان کی شرکت رہی. ۱۳ ستمبر ۱۹۰۸ کو کانپور میں مدرسہ الہیات کا افتتاح کیا. اور آخر دسمبر میں لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے امرتسر گئے. حکیم صاحب نے دہلی میں لیگ کے آیندہ اجلاس کے لیے وقار الملک کو دعوت دی. ۱۹۰۹ کے آخر میں دہلی میں اجلاس ہوا. حکیم صاحب مجلس استقبالیہ کے صدر تھے. مارچ ۱۹۱۲ میں مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا. مولانا شبلی نے اس میں وقف علی الاولاد کا مسئلہ اٹھایا.

---

۱. سیرت اجمل ص ۱۴

۲. حیات اجمل (غفار)، ص ۶۵

اس کام میں حکیم صاحب ان کے خاص معاون تھے۔ جنگ بلقان کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں بڑی بے چینی تھی۔ مولانا محمد علی نے پورے ملک میں اس کے لیے زوردار تحریک چلائی اور ایک طبی وفد روانہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس وقت یہ وفد روانہ ہوا تو جامع مسجد کے سامنے کے میدان میں آدمیوں کے سروں کے سوا دوسری چیز نظر نہیں آتی تھی۔ حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی کی الوداعی تقریروں اور شاہ ابوالخیر کی دعا نے گہرے اثرات چھوڑے۔ ۲۲، ۲۳ مارچ ۱۹۱۳ کو لیگ کے لکھنؤ اجلاس کے تذکار دنیائے اسلام میں بھی ہوئی ہلچل سے بہت متاثر تھے۔ دوسرے کانگریس کی سیاسی تحریک سے مسلم لیگ کے قائدین کا نقطہ نظر قریب ہوتا جا رہا تھا۔ لیگ کے اس اجلاس میں کانگریس کے صدر پنڈت بشن نرائن در اور دوسرے ہندو لیڈر شریک ہوئے سروجنی نائیڈو نے بھی پہلی دفعہ لیگ کے اجلاس کو خطاب کیا۔

ترکی کی شکست سے مسلمان بہت متردد تھے اور عام طور پر یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ اگر یہی صورت حال رہی تو اسلام کے مقدس مقامات بھی مغربی سامراج کی دست درازیوں سے نہیں بچ سکیں گے۔ انہی احساسات کا نتیجہ انجمن خدام کعبہ کی تحریک تھی۔ نظارۃ المعارف کی تحریک کا مقصد بھی یہی تھا۔ ۳۰، ۳۱ دسمبر کو آگرہ میں مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ زیر صدارت سر ابراہیم رحمت اللہ منعقد ہوا۔ لیگ کے اس اجلاس میں وہی اصحاب نمایاں تھے جو دو ایک سال بعد ہی مطالبہ آزادی کے میدان میں بہت تیز قدم بڑھانے والے تھے، مثلاً مظہر الحق مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں۔ یہ اجتماع درحقیقت اس کتاب کا دیباچہ تھا جس میں ۱۹۱۹ سے آزادی کی جدوجہد میں ہندوستانی مسلمانوں کی سوانح لکھی جانے والی تھی۔ ۱۹۱۵ کے آخر میں لیگ کے سالانہ اجلاس بمبئی کے صدر مظہر الحق منتخب ہوئے۔ اس اجلاس میں لیگ نے کانگریس کی طرف پہلا قدم اٹھایا۔ صدارتی خطبہ میں حکومت پر زیادہ سختی سے نکتہ چینی کی گئی۔ اجمل خاں اس تاریخی اجلاس میں شریک تھے، کانگریس کے لیڈروں سے گفتگو کر کے مشترکہ

لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی اس کے اراکین میں دہلی کے تین نمائندے حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی تھے۔ یہ پہلا قدم تھا جو لیگ نے مشترکہ اور متحدہ قومی سیاست کے نصب العین کی طرف اٹھایا۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے سالانہ جلسے ایک ہی جگہ لکھنؤ میں منعقد ہوئے۔ لیگ نے آیندہ اصلاحات کے لیے ہندو مسلمانوں کی متفقہ تجاویز مرتب کیں اور کانگریس کے لیڈروں کے مشورہ سے ایک ایسا متفقہ دستور العمل تیار ہوا جو عرصہ تک ہندو مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کی دستاویز سمجھا جاتا تھا۔ لیگ کا یہ نواں اجلاس ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک بڑا تاریخی واقعہ تھا۔ اسی دن سے سرسید کی قدیم پالیسی کا خاتمہ ہوا اور ملک کی عام سیاسی زندگی میں مسلمانوں کا مقام معین ہوا۔

تحریک خلافت اور ترکوں سے ہمدردی کے نتیجہ میں مسلمانوں کے بڑے لیڈروں میں محمد علی اور شوکت علی چھندواڑہ میں، حسرت موہانی فیض آباد میں، مولانا ابو الکلام آزاد رانچی میں، ظفر علی خاں پنجاب میں، مولانا محمود الحسن مالٹا میں نظر بند کئے گئے۔ ان کی نظر بندی کے خلاف ملک میں زبردست احتجاج ہوا۔ ایک انجمن نظر بندان اسلام قائم کی گئی۔ مرکزی جماعت کے صدر راجہ صاحب محمود آباد سکریٹری ڈاکٹر انصاری اور عبد الرحمٰن بجنوری اور خزانچی حکیم صاحب بنائے گئے۔ تمام صوبوں میں اس انجمن کی شاخیں قائم کی گئیں۔[1]

اسی زمانہ میں گاندھی جی ہندوستان آچکے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۷ کا آخری ہفتہ کلکتہ میں قومی جوش و خروش کے مظاہروں کا عجیب و غریب زمانہ تھا۔ حکیم صاحب کانگریس اور لیگ کے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ اور لیڈروں کے اندرونی مشوروں میں نمایاں حصہ لے رہے تھے اب وہ اپنی سیاسی زندگی کے اس دور میں داخل ہو چکے

---

[1] سیرت اجمل ص ۱۱۲

تھے جب کوئی سیاسی اجتماع، شوریٰ، کانفرنس یا اجلاس ان کے بغیر مکمل نہ ہوتا تھا۔ غالباً پہلی دفعہ حکیم صاحب اور گاندھی جی اسی موقع پر ایک دوسرے کے قریب آئے اور اس تعلق کی بنیاد رکھی گئی جو ۱۹۲۷ء تک قائم رہا۔[1] ۱۹۱۸ء میں لیگ اور کانگریس کے اجلاس دہلی میں ہوئے۔ لیگ کی مجلس استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر انصاری اور کانگریس کی مجلس استقبالیہ کے صدر حکیم اجمل خاں منتخب ہوئے۔ حکیم صاحب کا بڑا وقت ان دونوں اجلاسوں کی تیاری کے کام میں صرف ہوا۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف پورے ملک میں ہنگامہ اور ہڑتال کا سلسلہ رہا۔ دہلی میں حکیم صاحب، ڈاکٹر انصاری سوامی شردھانند، رائے بہادر لالہ سلطان سنگھ پیش پیش تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب حکیم صاحب بے تاج کے بادشاہ بن گئے۔ ان کا شمار کانگریس کے اہم ترین زعماء میں ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے اپنا خطاب حاذق الملک واپس کیا۔ اور قوم نے انہیں مسیح الملک کا خطاب عطا کیا۔ ریشمی خطوط کی تحریک میں وہ شریک رہے، ان کے مکان، مطب اور سفر میں خفیہ آدمی نگرانی کے لیے مقرر کیے گئے، ڈاک سنسر کی جانے لگی۔ وہ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کے قائدین میں تھے۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے لیگ کے اجلاس[2] امرتسر اور ۱۹۲۱ء میں خلافت کانفرنس کے اجلاس احمد آباد کی صدارت کی اور اسی سال وہ انڈین نیشنل کانگریس کے احمد آباد اجلاس کے صدر منتخب ہوئے۔ ملک و قوم کی یہ بڑی عزت تھی جو ان کو ایسے زمانہ میں حاصل ہوئی جب ہر قومی کارکن کا امروز اس کے فردا سے بے خبر تھا۔[3]

حکیم اجمل خاں کی سحر انگیز شخصیت، طبی قامت، علاجی کمالات، قومی و سیاسی تحریکوں اور تعلیمی و ملی مسایل میں ان کی شاندار خدمات کا عام طور پر اعتراف

---

[1] حیات اجمل (غفار) ص ۱۷۰

[2] حکیم اجمل خاں ص ۱۵۲

[3] حیات اجمل (غفار) ص ۲۵۷

کیا گیا ہے لیکن ان کی تصنیفی حیثیت اور طب میں ان کی اجتہادی شان کا زیادہ ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔ حکیم اجمل خاں کا محض ایک حاذق معالج اور قومی و سیاسی رہنما کی حیثیت سے تعارف ان کی شخصیت کے ساتھ پورا انصاف نہیں ہے، وہ طب کے ایک ایسے عالم تھے جنہوں نے مختلف طبی موضوعات پر آزادانہ قلم اٹھایا ہے اور جن کے پیش نظر قدیم مباحث کی تنقیح و تہذیب رہی ہے۔ ان کی تحریروں میں تشریح طلب طبی مسایل کو جدید افکار و خیالات کی روشنی میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش ہی نہیں ملتی، ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ طب کی شناخت اور اس کی بنیادی قدروں کا ان کے یہاں پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ عربی میں ان کے سات مطبوعہ رسالوں القول المرغوب فی الماء المشروب، التحفۃ الحامدیہ فی الصناعۃ التکلیسیۃ البیان الحسن بشرح المعجون المسمیٰ باکسیر البدن، اوراق مزھرۃ مثمرۃ مسفرۃ، الساعاتیۃ الوجیزہ، المسائل الخمسہ کے علاوہ مقدمۃ اللغات الطبیۃ بھی ہے۔ ان کی اردو یادگاروں میں رسالہ طاعون، حاذق اور افادات مسیح الملک ہیں، مؤخر الذکر کتاب میں ان کے علاجی واقعات حکیم نذیر احمد خاں نے قلمبند کئے ہیں۔[1]

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں برطانوی حکومت کے معاندانہ رویہ اور ملک میں در آمدہ ایک نئے نظام طب کی سرپرستی کی وجہ سے طب یونانی کو شدید صدمہ پہنچا۔ اس کی ترقی اور فروغ میں دشواری ہی کا مسئلہ نہیں پیدا ہوا بلکہ اس کی بقا اور اس کا پورا وجود خطرہ میں پڑ گیا، ایسے پر آشوب اور ناموافق زمانہ میں اس کو زندگی اور توانائی عطا کرنے کے لیے جو شخصیت آگے بڑھی اور سینہ سپر ہوئی وہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی ذات گرامی تھی۔ ملک میں اس وقت طبیبوں کی کمی نہیں تھی۔ ہزاروں طبیب گاؤں قصبوں اور شہروں میں فرایض مطب ادا کر رہے تھے۔ لیکن اس خطرہ کا انہیں احساس نہیں تھا، جسے اس مرد فن آگاہ اور نبض

---

[1] مقدمہ رسایل مسیح الملک ۱۲ تا ۱۴

شناس زمانہ نے بھانپ لیا تھا۔ اس کے آگے عیش و آرام، تدریسی تصنیفی اور معالجاتی مصروفیتیں اور سیاسی مصلحتیں آڑے نہیں آئیں. وہ پوری تیاری اور جذبہ و عمل سے میدان میں اترا۔ اس نے دیسی طبوں کے ماہرین کی کل ہند تنظیم قایم کی اور دیسی معالجین کو ان کے گوشہ ہائے عافیت سے نکال کر برطانوی حکومت کی منفامی طبوں کے خلاف سازش اور منصوبہ بند پالیسی کے تار و پود بکھیرنے کا زبردست کارنامہ انجام دیا۔

اجمل خاں کی شخصیت میں ان کی خاندانی عظمت و وقار، ذاتی اوصاف و کمالات فنی حذاقت و مسیحائی، اعلیٰ تعلیمی و تدریسی حیثیت، طبی تعلیم کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے اہتمام، قومی و ملی مسایل میں دلچسپی و شغف اور تحریک آزادی میں قائدانہ کردار میں سب سے زیادہ جس چیز سے متاثر ہوں وہ ان کی فنی دانشوری اور بقائے طب کے لیے ان کی انتھک اور بے لوث جدوجہد ہے، واقعہ یہ ہے کہ اگر اس وقت اجمل خاں جیسی عظیم المرتبت شخصیت سامنے نہ آتی اور وہ زبردست کوششیں انجام نہ دی جاتیں جو ان کی زیر سرکردگی طبی کانفرنس نے انجام دیں تو اس ملک میں دیسی طبیں اس طرح مٹنے کے قریب ہو جاتیں اور ان کا وہ حشر ہوتا جو مغربی سیاست اور اس کے قومی اثرات کی بدولت پورے مشرقِ وسطیٰ میں رونما ہوا۔ حکیم اجمل خاں کی یہ وہ عظیم الشان خدمات ہیں جن کا اعتراف طب کی تاریخ ہمیشہ کرتی رہے گی۔

۲۷ اور ۲۸ دسمبر ۱۹۲۷ء کی درمیانی شب میں رامپور میں وفات ہوئی۔ دہلی میں درگاہ حسن رسول نما میں دفن ہیں. سایل دہلوی نے قطعہ وفات کہا جو لوح مزار پر کندہ ہے ؎

زہجر دوامی دانائے عالم ۔۔۔ چکد اشک خونیں زچشم جہانی

علم گشت اجمل لقب شد مسیحا ۔۔۔ زبان داشت شیریں دلی مہربانی

سن رحلتش آشکار است سایل ۔۔۔ ارسطو صفت بود لقمان ثانی

۱۳۴۶ھ

شریف منزل

دہلی کی تاریخی یادگاروں میں شریف منزل ایک نہایت اہم عمارت ہے، گذشتہ ڈھائی سو برس میں اس منزل نے جس طرح ملک کی تاریخ کے بدلتے نقشے دیکھے۔ والیان ریاست اور رہنمایان ملک و ملت کا استقبال کیا، شاعروں اور ادیبوں کی محفلیں سجائیں، علما و اتقیا کی عالمانہ گفتگو ئیں سنیں، قومی رہنماؤں کے مشاورتی جلسوں کا نظارہ کیا اور ہزارہا جان بلب مریضوں کو جام صحت بخشا۔ اس لحاظ سے نہ صرف دہلی بلکہ ذاتی و نجی زمرہ کی ہندوستان کی کم عمارتیں اس کے برابر درجہ میں شمار کی جاسکیں گی۔ ملک کی بہت سی عمارتیں قومی نوعیت کے جلسوں یا شاعروں، ادیبوں اور نامور شخصیتوں سے انتساب کی وجہ سے منزلت کا خاص درجہ رکھتی ہیں، لیکن شریف منزل کی طرح وہ نہ ڈھائی سو سالہ طویل تاریخ کی امین ہیں، نہ مختلف ادوار میں ان کا وہ تاریخی کردار رہا ہے، یہ منزل ملکی سیاست اور قومی مسایل و معاملات سے لے کر علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا ایسا گہوارہ رہی ہے جس کے بغیر دہلی کی سیاسی، ادبی اور تہذیبی تاریخ ادھوری نظر آتی ہے۔

شریف خانی سلسلہ کے مورث اعلیٰ بابر کے عہد میں ہندوستان آتے۔[1] حیدرآباد اور اکبر آباد کے بعد دہلی ان کا مسکن بنا۔ حکیم واصل خاں پہلے شخص ہیں جو اورنگ زیب کے زمانہ میں آگرہ سے دہلی منتقل ہوئے۔[2] ان کے بعد ان کے بیٹوں حکیم اکمل خاں اور حکیم اجمل خاں کا دہلی قیام رہا۔ دہلی منتقلی کے فوراً بعد ان کا عروج شروع ہو چکا تھا۔ حکیم اکمل خاں جیسا کہ کہا جاتا ہے محمد شاہ کے دربار سے

---

[1] سیرت اجمل ص ۱

[2] حکیم اجمل خاں ص ۱۰۰

وابستہ اور حاذق الملک کے خطاب سے مفتخر تھے۔[1] لیکن ان کے قیام کی جگہ کے بارے میں تذکروں میں وضاحت نہیں ملتی ہے ہندوستان میں اگر چہ اس خاندان کی کئی پشتیں گزر چکی تھیں لیکن حکیم اکمل خاں کے صاحبزادہ حکیم شریف خاں (پیدائش ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء) کے نام سے جہاں یہ خاندان منصف ہوا اور شریف خانی خانوادہ نے ملک کے نامور خاندانوں کی تاریخ میں امتیازی جگہ پائی، وہاں شریف منزل بھی انہی کے نام سے موسوم ہوئی۔ میرے خیال سے حکیم واصل خاں اور حکیم اکمل خاں کا قیام اسی مکان میں رہا۔ حکیم شریف خاں نے جنہیں تعمیر کا خاص ذوق تھا۔ اس میں اپنی پسند کے مطابق ترمیم کی اور بعد میں یہ عمارت ان کی ذاتی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کے نام سے مشہور ہوئی۔ بلی ماران میں واقع شریف منزل پر کوئی تاریخی کتبہ نہیں ہے جس سے اس کے سنہ تعمیر کے بارے میں کچھ پتہ چل سکے۔ اس منزل کے سامنے جو مسجد ان کی باقیات میں سے ہے اس کی تاریخ خانہ خدا سے ۱۱۶۱ھ لوگوں نے لکھی ہے۔ لیکن خانہ خدا سے ۱۱۶۱ نہیں ۱۲۶۱ برآمد ہوتی ہے حکیم شریف خاں کا انتقال ۱۲۲۲ھ میں ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی وفات کے ۳۹ برس بعد حکیم صادق نے اپنے زمانہ میں لگوایا ہے۔ حکیم صادق علی خاں کے بیٹوں میں سے دو حکیم غلام محمد خاں اور حکیم غلام مرتضیٰ خاں ریاست پٹیالہ سے متعلق رہے۔ حکیم محمود خاں شریف منزل میں خاندانی مسند طبابت پر فائز ہوتے۔ ان کے دم سے شریف منزل کی آبادی اور رونق میں اضافہ ہوا۔ ان کی ذات مرجع انام تھی انہوں نے بزرگوں کی روایات اور خاندانی وقار اور وجاہت کو قائم رکھا۔ شریف منزل جو اب تک بکثرت مقامی و بیرونی مرضا، شائقین علم طب اور دہلی کے علما، شرفا اور عمائدین کے لیے ایک مرکزی مقام کی حیثیت رکھتی تھی سلطنت مغلیہ کی تباہی اور انگریزی اقتدار کے زمانہ آغاز میں ایک اور حیثیت سے ابھر کر سامنے

---

[1] تذکرۃ الخواجگان ص ۸۵

آئی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رستخیز میں وہ باشندگان دہلی کے لئے امن کا گہوارہ بنی اور سیکڑوں لوگوں نے وہاں پناہ لے کر اپنی جان اور آبرو بچائی۔ ۱۸۵۷ء میں شریف منزل تباہی میں نہیں آئی۔ اس کا ایک سبب خود محمود خاں کا شخصی اعزاز تھا۔ جس وقت برطانوی فوجیں دلی میں داخل ہوئیں تو نابھہ، پٹیالہ اور جیند کی فوجیں ان کے ساتھ تھیں، اور ان مہاراجگان نے برطانوی افسران سے کہہ دیا تھا کہ شریف خانی خاندان کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ انگریزی فوج نے دلی میں داخل ہوتے ہی اس گھر کی حفاظت پر پہرہ بٹھا دیا تھا۔[۱] غالب کی متعدد تحریروں میں شریف منزل کا ذکر ملتا ہے دستنبو میں غالب نے اس واقعہ کو تفصیل سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے ایک اور جگہ لکھا ہے "باغیوں کی شکست کے بعد جب دلی والے بھاگے تو ہزارہا اشخاص نے حکیم محمود خاں کی حفاظت میں اپنا اثاثہ چھوڑ دیا۔ حالت یہ تھی کہ لوگ حکیم صاحب کے پاس اپنا قیمتی سامان، زیور اور جواہرات محفوظ کرنے کے لیے لاتے تھے اور حکیم صاحب ایک کوٹھری بنا دیتے تھے کہ اس میں رکھ جاؤ۔ چنانچہ یہ کوٹھری چھت تک لوگوں کے پلندوں، گٹھریوں اور بکسوں سے بھر گئی۔ بقول حکیم محمد احمد خاں مرحوم اندازہ یہ تھا کہ اس وقت اس کوٹھری میں دو کروڑ روپے سے زیادہ کی امانتیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ مرتبہ دلی میں محمود خاں ہی کا تھا کہ لوگ ان کی کوٹھریوں میں اس طرح اپنی دولت ڈال جاتے تھے۔ غدر کے بعد جب لوگ اپنے گھروں کو واپس آئے تو حکیم صاحب نے اس کوٹھری کا دروازہ کھلوا دیا۔ اور فرمایا کہ جس کا جو سامان ہو وہ پہچان کر لے جائے"[۲]

شریف منزل متعدد عمارتوں کا مجموعہ تھی۔ جس کے مختلف حصوں میں اراکین خاندان کی رہائش تھی۔ اسی کی ایک عمارت میں حکیم غلام رضا خاں رہتے تھے۔

---

[۱] حیات اجمل (قاضی عبد الغفار) ص ۱۵

[۲] ایضاً ص ۱۲

مرزا غالب کے دوست، انہوں نے شریف منزل میں اکمل المطابع قایم کیا تھا۔ اس مطبع سے ایک اخبار بنام اکمل الاخبار نکلتا تھا۔ مرزا بہاری لال مشتاق شاگرد مرزا غالب مطبع کے مہتمم تھے، حکیم واصل خاں مطبع اور اخبار کی نگرانی کرتے تھے ۱۸۹۴ کے بعد تک یہ اخبار جاری رہا۔ مضامین لکھنے والوں میں اس زمانہ کے مشہور اہل قلم مولوی ذکاء اللہ، سید جالب دہلوی، حکیم سید احمد حسین، نواب سعید الدین خاں طالب، محمد بشیر مرزا دہلوی، مرزا غلام احمد قادیانی وغیرہ شامل ہیں[1] اسی مطبع سے ۱۸۶۹ء میں غالب کا مجموعہ خطوط اردوئے معلی طبع ہوا تھا۔ محمود خاں کے زمانہ میں دہلی کی جو باکمال ہستیاں تھیں۔ شریف منزل کے بام و در ان کے فیض سے منور تھے۔ اس کی حیثیت ایک ایسے ادارے اور انجمن کی تھی جہاں علمی مذاکرے مذہبی مباحث اور فنی مسایل پر تبادلہ خیال کا سلسلہ رہتا تھا۔ سیاست کی گتھیاں سلجھتی تھیں اور شعر و سخن کی محفلیں سجتی تھیں۔ جس طرح اس زمانہ میں غالب، ذوق، مومن، صدرالدین آزردہ، حکیم احسن اللہ خاں اور دہلی کی دوسری سرکردہ شخصیتیں وہاں پہنچتی تھیں۔ اسی طرح حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں کے زمانہ میں مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، ڈپٹی الٰہی بخش، مولوی ذکاء اللہ، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک کا وہاں اجتماع رہتا تھا۔ شریف منزل میں واقع مطبوں میں جہاں کثرت سے مرضا کا ہجوم ہوتا تھا۔ درس و افادہ کی مجلسیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ حکیم شریف خاں، حکیم صادق خاں، حکیم محمود خاں، حکیم عبدالمجید خاں، حکیم واصل خاں اور خاندان کے دوسرے اراکین مدرسہ طبیہ کے قیام سے پہلے اپنے مطبوں میں طلبہ کو علمی و عملی تعلیم دیتے تھے۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے عہد میں شریف منزل کی رونق و عظمت میں مزید اضافہ ہوا۔ ان کی شخصیت ایسی مقتدر اور با اثر تھی کہ دلی میں کوئی سیاسی مشورہ

---

[1] حیات اجمل (رغفار) ص ۳۵

اجتماع، کانفرنس یا اجلاس ان کے بغیر نامکمل تھا۔ ان کی آواز دہلی کی آواز تھی۔ قومی رہنماؤں میں گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، سی آر داس، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، بیرسٹر آصف علی، علما میں مولانا محمود الحسن، مولانا شبلی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا سید سلیمان ندوی سرکردہ شخصیتوں میں رائے صاحب پیارے لال، رائے بہادر سلطان سنگھ، سوامی شردھانند، لالہ سری رام، اسی طرح والیان ریاست اور دہلی کے رؤسا اور حکام کی کثرت سے آمد و رفت رہتی تھی۔ کانگریس، مسلم لیگ، تحریک خلافت، جمعیۃ العلما اور دوسری جماعتوں کی مشاورتی نشستوں کے علاوہ علی گڑھ، ندوۃ العلما، جامعہ ملیہ اور دوسری تعلیمی تحریکوں کو بھی وہاں پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ جامعہ کے مسایل پر تو آئے دن مشوروں اور غور و خوض کا سلسلہ رہتا تھا۔ اسی طرح تقریباً روز قومی اور تعلیمی مسایل سے متعلق جلسے منعقد ہوتے تھے۔ ندوۃ العلما کی اصلاحی تحریک کے بہت سے جلسے ان کے مکان میں ہوئے ہیں[1]

حکیم اجمل خاں کی قومی تحریک میں شرکت کے بعد شریف منزل دہلی میں ملک کی آزادی کی جد و جہد میں حصہ لینے والوں کا اہم مرکز بن گئی تھی۔ اس کے در و دیوار قومی تحریک آزادی کے عینی شاہد ہیں، اس عہد کی دو جلیل القدر ہستیوں گاندھی جی اور مولانا آزاد کی پہلی ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ شریف منزل میں اس دور کی سبھی عظیم شخصیتوں کا قیام رہا۔ شب بسری بھی اور خفیہ نشستوں میں اہم فیصلے بھی۔ ایسے فیصلے جو بعد میں پوری قوم اور ملک پر اثر انداز ہوئے۔[2]

وہاں دن آئے جو اجتماعات منعقد ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض کا ذکر اجمل خاں کے تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں ترکی سے ہمدردی کے نتیجہ میں مسلمانوں

---

[1] سیرت اجمل ص ۸۸

[2] دہلی والے جلد ۲ ص ۲۰۷

کے بڑے لیڈر مولانا محمد علی مولانا شوکت علی چھندواڑہ میں، حسرت موہانی فیض آباد میں، مولانا آزاد رانچی میں، ظفر علی خاں پنجاب میں مولانا محمود الحسن مالٹا میں نظر بند کئے گئے۔ ان نظر بندوں کی رہائی کے مسئلہ پر وبسرائے سے گفتگو کی غرض سے مسز اینی بسنٹ دہلی آئیں۔ ملک کے بہت سے ممتاز لیڈر بھی اس موقع پر ان کی گفتگو کا نتیجہ معلوم کرکے اپنی تحریک کا پروگرام بنانے کے لیے جمع ہوئے، ۳، ۴ اور ۵ نومبر ۱۹۱۷ کا یہ اجتماع دہلی میں لیڈروں کا ایک یادگار اجتماع تھا۔ شریف منزل اور ڈاکٹر انصاری کے مکان پر مسلمان لیڈر جمع ہوئے۔ نظر بندوں کی رہائی کے لیے ایک مرکزی کمیٹی قائم کی گئی۔ راجہ صاحب محمود آباد صدر، ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن سکریٹری اور حکیم اجمل خاں خزانچی مقرر ہوتے[1]

۱۹۱۸ء میں دہلی میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر حکیم اجمل خاں تھے۔ اس اجلاس کے دوران حکیم صاحب کے مکان پر کانگریسی لیڈروں کے مشورے ہوتے رہے اور پہلی دفعہ گاندھی جی نے بتایا کہ وہ کن خطوط پر قومی تحریکوں کو چلانا چاہتے ہیں[2]

دہلی میں ۱۹۱۹ میں رولٹ ایکٹ کے خلاف جو زبردست عوامی تحریک شروع ہوئی اس میں دہلی کا امن خطرہ میں پڑ گیا اور حکومت اور عوام کے درمیان سخت ٹکراؤ کی فضا پیدا ہوگئی، اس زمانہ میں محض حکیم اجمل خاں کے اثر کی وجہ سے دہلی قتل عام سے محفوظ رہی، وہ اس وقت دہلی کے بے تاج کے بادشاہ تھے شہر کے امن و امان کے لیے تمام محلوں سے نمائندے منتخب کرکے ایک پنچایت قایم کی گئی تھی جس کے کارکن شہر کی حفاظت اور انتظام کے لیے مامور تھے۔ حکیم صاحب اس پنچایت کے صدر تھے۔ ڈاکٹر انصاری کے الفاظ میں "ان کا گھر شہر کا قلب اور کاموں کا مرکز تھا،[3]

---

[1] حیات اجمل (غفار) ص ۱۶۸ و ۱۶۹

[2] ایضاً ص ۱۹۰ [3] ایضاً ص ۲۰۳

تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں ۲۲ مارچ ۱۹۲۰ کو انہوں نے ملک کے تمام ہندو مسلمان لیڈروں کو دہلی میں مدعو کیا اور اس مشورہ کا جو کئی دن تک شریف منزل میں جاری رہا، نتیجہ یہ نکلا کہ شروع اپریل ۱۹۲۰ میں گاندھی جی نے حکومت کے مقابلہ کا اعلان کر دیا۔ اجمل خاں نے اپنا خطاب حاذق الملک اور اپنا تمغہ قیصر ہند حکومت کو واپس کر کے جبر و تشدد کے خلاف اپنے رنج و نفرت کا برملا اظہار کیا۔[۱]

حکیم صاحب کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کے مکان اور مطب پر اور سفر کے دوران خفیہ پولس کے آدمی نگرانی کے لیے مقرر کئے گئے۔[۲]

۱۹۲۱ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ دہلی میں منعقد ہوا۔ اس سلسلہ میں ملک کے بہت سے ہندو مسلمان لیڈر صبح سے شام تک شریف منزل میں جمع رہتے تھے۔[۳]

۲۴ فروری ۱۹۲۲ کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک یادگار جلسہ شریف منزل میں منعقد ہوا۔ جس میں بشمول گاندھی جی ملک کا کوئی ممتاز لیڈر ایسا نہ تھا جو موجود نہ ہو۔[۴] اس جلسہ میں تجویز التوائے قانون شکنی کی سخت مخالفت کی گئی۔ لیکن گاندھی جی کی شخصیت اور دلایل نے سب کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا، اور تحریک التوا کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی منظور کر لیا، شریف منزل میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ کا منظر بہت حسرت ناک تھا۔[۵]

سول نافرمانی کی تحقیقاتی کمیٹی کا ۳۰ جون ۱۹۲۲ کو شریف منزل میں ابتدائی جلسہ

---

[۱] سیرت اجمل ص ۱۳۳

[۲] ایضاً ص ۱۳۵

[۳] ایضاً ص ۱۵۵ حیات اجمل (غفار) ص ۲۴۲

[۴] سیرت اجمل ص ۱۶۲

[۵] حیات اجمل (غفار) ص ۲۶۷

منعقد ہوا. جس میں شہادتیں قلمبند کرنے کے لیے کچھ سوالات قائم کئے گئے. کمیٹی کی کارروائی یکم جولائی سے شروع ہوئی. حکیم صاحب نے تقریباً تمام اجلاسوں میں شرکت فرمائی ۲۵۹ بیانات تحریری وصول ہوئے اور ۱۳۶۶ اشخاص نے زبانی شہادت دی۔[1]

آخر اگست ۱۹۲۳ میں اسیران کراچی رہا ہوئے، ۲۹ اگست کو مولانا محمد علی بغیر اطلاع کے یکایک حکیم صاحب کے مکان پر پہنچے، اور چند گھنٹوں کے قیام میں انہوں نے حکیم صاحب سے فرقہ وارانہ فتنہ کے متعلق گفتگو کی۔[2]

۲۷ جون ۱۹۲۴ کو حکیم صاحب نے شریف منزل میں ہندو مسلمانوں کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں دلی کو ہندو مسلم فساد سے محفوظ رکھنے کی تدابیر پر غور کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ ہندو مسلم اخبارات سے درخواست کی جائے کہ وہ ایک ماہ تک کوئی افواہ تحریر نہ کریں، جماعتوں سے بھی درخواست کی گئی کہ اشتعال دلانے والا کوئی جلسہ نہ منعقد کیا جائے۔[3]

حکیم صاحب نے دہلی میں ایک اسلامیہ کالج قایم کرنے کی تحریک شروع کی. اس سلسلہ میں ہر دوسرے تیسرے دن ان کے مکان پر جلسے ہوتے تھے. ان جلسوں کی اکثر رودادیں وہ اپنے قلم سے لکھتے تھے. پوری اسکیم کا مسودہ انہوں نے خود تیار کیا، شہر کے تقریباً تمام با اثر افراد خصوصاً ڈاکٹر انصاری، مولوی عبدالاحد، امام صاحب جامع مسجد، مسٹر آصف علی، ڈاکٹر عبدالرحمن اور بہت سے مسلمان وکلا، بیرسٹر اور تاجران کے شریک کار تھے. کل اسکیم کے لیے سرمایہ کا تخمینہ ساڑھے چھ لاکھ روپیہ تھا. بہت قلیل عرصہ میں انہوں نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ جمع کر لیے. بعد میں جب جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی گئی تو حکیم صاحب کی تمام تر توجہ اس طرف

---

[1] سیرت اجمل ص ۱۷۵

[2] حیات اجمل (غفار) ص ۲۹۲

[3] سیرت اجمل ص ۱۹۱

مبذول ہوگئی۔[1]

شریف منزل میں مجلس عاملہ خلافت کمیٹی کا خصوصی جلسہ زیر صدارت مسیح الملک ہوا، جس میں مقامی وغیر مقامی رہنمایان ملک شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں لالہ لاجپت رائے بھی تھے۔[2]

ترکی کے ہلال احمر عثمانی کا ایک وفد فروری ۱۹۲۴ کو دہلی آیا، دوسرے دن حکیم صاحب سے ملنے شریف منزل گیا، اور انہوں نے انقلاب ترکی کے مسئلہ پر اراکین وفد سے مفصل گفتگو کی۔[3]

عبدالمجید خواجہ علی گڑھ کے بارے میں قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے کہ وہ شریف منزل کی صحبتوں میں اور تحریک خلافت اور تحریک موالات کے ہنگاموں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تحریک میں اجمل خاں کے عزیز ترین شرکار کار میں سے ایک تھے۔[4] گاندھی جی کے خاص دوست اینڈریوز کا بیان ہے کہ میں اکثر اجمل خاں سے ملنے جاتا تھا اور اکثر ان کے ہاں کھانا کھاتا تھا۔[5]

مولانا آزاد کے حکیم بھورے میاں سے خصوصی تعلقات تھے اور دہلی میں ان کا اکثر قیام شریف منزل میں بھورے میاں کے حصہ میں ہوتا تھا۔ نواب حامد علی خاں رامپور اگرچہ شریف منزل میں کبھی نہیں ٹھہرے مگر دہلی کے ہر سفر میں ان کا شریف منزل میں آنا لازمی تھا۔ اجمل خاں سے بھائی کہہ کر بات کرتے تھے، ولی عہد رضا علی خاں دوران معتوبی کسی دوسرے والی ریاست کے ہاں قیام کرنے کے بجائے کئی ماہ شریف منزل

---

[1] حیات اجمل (غفار) ص ۱۶۴

[2] مآثر المسیح ص ۱۰۲

[3] حیات اجمل (غفار) ص ۲۹۶

[4] ایضاً ص ۱۰۰

[5] ایضاً ص ۱۰۶

میں مقیم رہے۔ ان کا قیام حکیم احمد سعید خاں کے حصہ میں تھا۔ شریف منزل میں یہ حصہ جمیل میاں کے حصہ کے سامنے واقع تھا، دوسرے چھوٹے بڑے رجواڑوں اور نوابوں کے علاوہ جن کی آمد کا سلسلہ تقریباً روز رہتا تھا، اجمل خاں کے زمانہ میں نواب حمید اللہ خاں بھوپال، مہاراجہ بڑودہ، مہاراجہ پٹیالہ شریف منزل میں آئے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد حکیم جمیل خاں سے ملنے شریف منزل تشریف لاتے تھے۔ اجمل خاں کی عزت و احترام کا یہ عالم تھا کہ رجواڑے جو ان کے ہاں آتے تھے وہ ان کے خاص ملازم ادریس خاں سے پہلے دریافت کرتے تھے کہ حکیم صاحب کیا کر رہے ہیں، اور اس وقت ان کی کیا مشغولیت ہے، پھر ان کی برآمدگی سے پہلے بٹن وغیرہ ٹھیک کرتے تھے، ادریس خاں بہت منھ چڑھے تھے، جو آتا تھا پہلے انہی کو پوچھتا تھا۔[1]

مفتی کفایت اللہ نے شریف منزل میں اجمل خاں کی مصروفیت کا تذکرہ کرتے ہوتے لکھا ہے "مطب سے ۲ بجے فارغ ہو کر کمرہ میں تشریف لاتے تو وہاں پہلے سے بیسیوں آدمی منتظر بیٹھے ہوتے تھے، طبیہ کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ہندوستان دواخانہ اور خدا جانے کتنے قومی اداروں کے مہمات حضرت مرحوم کے سامنے ۲ بجے سے چار ساڑھے بجے تک پیش کیے جاتے تھے۔ اور کتنی مشاورتی مجالس اس عرصہ میں منعقد ہو جاتی تھی[2] مفتی صاحب کا بیان ہے کہ ۹ بجے کے بعد رات کی صحبت میں ان کے یاران قدیم اور بے تکلف احباب ہوتے تھے اور ہر قسم کی بے تکلفانہ گفتگو ہوتی تھی۔ آخر میں چار پانچ سال مفتی صاحب کی بھی ان مجالس میں شرکت رہی[3] مولانا ابرار حسین فاروقی کے مطابق "رات کو ۱۱ بجے کے قریب شاعرانہ نشست

---

[1] ماہنامہ ایوان اردو جون ۱۹۸۸ء (بحوالہ حکیم میر بصیر احمد خلف حکیم میر انوار احمد)

[2] تذکرہ مسیح الملک ص ۰۷

[3] ایضاً ص ۷۳

ہوتی تھی جس میں دو چار شاعروں کے علاوہ دو ایک خاص دوست بحیثیت سامع کے ہوتے تھے[1]

یوسف بخاری نے حکیم صاحب کے دیوان خانہ کا نقشہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے

"شریف منزل میں مقامی و غیر مقامی مریضوں کے علاوہ عالموں، درویشوں، ادیبوں، شاعروں اور لیڈروں کا مجمع رہا کرتا تھا۔ ریاستوں کے نواب اور راجا، مختلف ممالک کے سفیر اور سیاح، ارباب حکومت، مختلف وفود کے ارکان اور خاص دوست احباب اس دیوان خانہ میں تشریف لایا کرتے تھے ؎

رہتے ہیں جمع کوچہ جاناں میں خاص و عام آباد ایک گھر ہے جہان خراب میں

یہ دیوان خانہ اپنی وسعت میں ایک متوسط درجہ کے کمرے سے ذرا بڑا تھا۔ اس میں پندرہ بیس افراد تو بخوبی اور مطب کے وقت تیس چالیس آدمی سما جاتے تھے، در و دیوار پر سفیدی اس پر روغن کے رنگین حاشیے جا بجا قدیم قلمی طغرے اور کتبے۔ ان کے درمیان مناسب مقامات پر خاندانی بزرگوں کی چند قلمی تصاویر، چھت پر ایک یا دو خوشنما جھاڑ، فانوس، دہلیز میں پائے دانوں کی جگہ مرگ چھالیں اور دروازوں پر کھاردے کے پٹاپٹی کے پردے، زمین پر دری، دری پر براق سی چاندنی، چاندنی پر دائیں بائیں اور درمیان میں نرم و خوبصورت ایرانی قالینوں کا فرش، دونوں طرف دیواروں کے سہارے نرم نرم بڑے گول تکیے، پھول دار غلاف چڑھے ہوئے، بدری کے کام کا حقہ، ایک دو فالتو کلیاں، پاندان، پیک دان قرینے سے رکھے ہوتے، دو تین خدمت گار خدمت کے لیے ہر وقت موجود رہتے تھے۔

حکیم صاحب کے دم سے دیوان خانے کی یہ تاریخی صحبتیں روزانہ شب کو آٹھ بجے شروع ہوتیں اور بارہ بجے تک محفل گرم رہتی تھی۔ نواب فیض احمد خاں فیضی شمس العلما سید احمد امام جامع مسجد، ان کے برادر خرد سید حامد، نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں

---

[1] ماثر المسیح ص ۵۰

نواب سراج الدین احمد خاں سائل مولوی عبدالحق حقانی، حکیم مولوی جمیل الدین احمد، حکیم اسد علی خاں مضطر، نواب امین الدین خاں والی لوہارو، عبیدالرحمٰن بیان، مرزا محمد علی خاں علی، لالہ جگل کشور وکیل اور لالہ ہزاری مل جوہری، یہ وہ نمونہ روزگار اور یادگار زمانہ چند بزرگ تھے جو اپنی شائستہ گفتگو اور سنجیدہ مذاق سے ایک دوسرے کا دل خوش کیا کرتے تھے، کبھی شعر و سخن کا چرچا ہوتا، کبھی منطق و فلسفہ پر گفتگو ہوتی کبھی احادیث بیان کی جاتیں، کبھی آیات قرآنی کو تفسیر کی روشنی میں دیکھا جاتا۔ کبھی فقہ کے مسایل سامنے آتے، کبھی آنحضرت کے عہد مبارک اور دور خلافت پر نظر جاتی۔ اسلاف کے کارناموں پر تبصرہ ہوتا۔ سلطنت مغلیہ کے عروج و زوال کے نقشے آنکھوں کے سامنے کھلتے۔ ملک کی موجودہ ابتری کو دیکھتے ہوتے وقتی سیاست پر گفتگو ہوتی، کبھی طبیہ کالج، ہندوستانی دواخانہ، مسلم یونی ورسٹی اور جامعہ ملیہ کو ترقی دینے کی تدبیروں اور مشوروں پر غور کیا جاتا۔ اسی دوران میں موسم اور وقت کے لحاظ سے طرح طرح کے ماکولات اور مشروبات، مٹھائیاں، پھل، خشک میوے، چائے یا قہوے، پان اور حقے کے دور چلتے [1]

کبھی میر باقر علی داستان گو خود مجلس میں آتے یا بلوائے جاتے تو ان کی داستان، زبان اور طرز بیان سے لطف اٹھایا جاتا۔ میر صاحب کو چنیا بیگم (افیون) سے عشق تھا۔ لہٰذا افیون کی کٹوری بھری مجلس میں ان کے سامنے رکھی جاتی۔ وہ ایک ہاتھ سے افیون گھولتے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک چسکی لگاتے۔ جس قدر افیون کا نشہ چڑھتا اسی قدر ان کی تیغ زبان کے جوہر کھلتے، اور داستان اپنے رنگ و شباب پر آتی، سننے والے عش عش کرتے اور داد دیتے [2]

اسی مختصر سی صحبت میں شعرائے مجلس اپنے مخصوص انداز اور لب و لہجہ کے ساتھ

---

[1] یہ دلی ہے (اشاعت دوم) ص ۴۳، و ۴۷،

[2] حیات اجمل رشید احمد ص ۲۰۵

اپنا کلام بھی سناتے تھے۔ دیوان خانے کے مشاعروں میں سائل کی اپنے بڑے بھائی ناباںؔ سے نوک جھوک رہتی تھی۔ ناباںؔ، داغؔ کے کلام کو بازاری کلام کہتے تھے، حکیم صاحب کبھی کبھی یہ لطیف مذاق خود تو نہیں لیکن دوسرے دوستوں کے ذریعہ کرایا کرتے تھے محفل میں ایک صاحب کو اشارہ کر دیا۔ انہوں نے داغ کے کلام کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیئے۔ ناباںؔ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے سنتے رہتے، بالآخر بھڑک اٹھتے اور جو منھ میں آتا بے دھڑک سنانے۔ حاضرین ان کی ٹکسالی گالیوں اور ٹنتالی فقروں کا لطف اٹھانے اور پھر گفتگو کا موضوع بدل جاتا۔

حکیم صاحب کا معمول تھا کہ آٹھویں دسویں تفریح کی غرض سے اپنے مخصوص دوستوں کے ہمراہ مہرولی یا اوکھلا جاتے گویا ایک دو روز کے لیے یہ دیوان خانہ منتقل ہو جاتا۔ ایک دفعہ جب اس دیوان خانہ کی محفل اوکھلے میں منعقد تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد محفل مشاعرہ گرم ہوئی، حکیم صاحب نے سائل کی طرف اشارہ کیا۔ سائل نے حکیم صاحب کا مطلب سمجھ کر داغ کی ایک غزل پڑھنی شروع کی۔ اس پر ناباں برہم ہونے شروع ہوئے۔ سائل نے ان کے غصہ کو اور ہوا دی کہنے لگے بھائی صاحب شعر گوئی کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے داغ کی نازک خیالی، جذبات آفرینی اور قادر الکلامی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ ایک گھنٹہ میں پچاس شعر قلم برداشتہ لکھا کرتے تھے۔ یہ سن کر ناباںؔ بے تاب ہو گئے، غضب ناک ہو کر بولے۔ اب اس کو اور تجھ کو شعر کہنے اور سمجھنے کی کہاں تمیز۔ تیرے نزدیک یہی ایک معیار سخن ہے تو کوئی مصرعہ کہہ۔ سائل جیسے اسی بات پر تلے بیٹھے تھے۔ جھٹ ایک مصرعہ پڑھا، ناباںؔ نے دوسرے ہی لمحہ جواب میں یہ شعر پڑھا ؎

شفق بن کر چڑھا ہے چرخ فتنہ جو میرا　　　عدو میرا نہ تو میرا نہ چرخ کے سر پر لہو میرا

اس شعر کا سننا تھا کہ ساری محفل پھڑک اٹھی، حکیم صاحب نے جوش مسرت سے ناباںؔ کو گلے لگا لیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ حکیم صاحب کو ایک اور دلچسپ چھیڑ سوجھی، حکیم صاحب کو

یہ معلوم تھا کہ سائل اور تاباں توام پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اس واقعہ کو ایک طبی سوال کی صورت میں خاموشی سے سائل کو بتادیا اور فرمایا کہ وہ اسے تاباں کے سامنے پیش کریں۔ چنانچہ سائل نے ایک نشست میں موقع پاکر حکیم صاحب سے عرض کیا کہ میں کئی روز سے ایک طبی مسئلہ میں الجھا ہوا ہوں اگر آپ نے میرے خیال پر صاد کر دیا تو نہ صرف ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوگا بلکہ میری زندگی بھی نئے انقلاب سے آشنا ہوگی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ہمیشہ سے بڑے بھائی صاحب کا احترام کرتا ہوں لیکن یہ حقیقت واضح ہونے کے بعد کہ توام بچوں میں جو بعد میں پیدا ہوا عمر کے لحاظ سے وہی بڑا ہے کیونکہ انعقاد اسی کا پہلے ہوا تھا، لہٰذا آج سے بھائی صاحب کو میرا احترام کرنا ہوگا۔ تاباں کو اس چھیڑ کا معقول جواب نہ بن پڑا، مگر آپے سے باہر ہو گئے، اور اہل محفل اور بالخصوص حکیم صاحب منہ پھیر پھیر کر ہنستے رہے۔ آخر میں حکیم صاحب نے اپنا فیصلہ دیا جو تاباں کے حق میں تھا۔[1]

حکیم محمد اسحاق نے ان محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "مطب کے علاوہ حکیم صاحب کے مخصوص احباب کی نشست مہرولی میں ہوا کرتی تھی۔ جس میں شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ ایک بار ہم بیشتر طلبہ بغیر اجازت وہاں پہنچ گئے۔ تمام طلبہ کی ضیافت چائے سے ہوئی۔ سائل نے اپنی غزل کے بعد حکیم صاحب کی غزل پڑھی۔ جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

دشت میں رکھنا قدم وحشت کے ساماں دیکھ کر   پاؤں پھیلانا ذرا جیب و گریباں دیکھ کر

اجمل خاں کے ان احباب کا شمار دہلی کی منتخب شخصیتوں میں تھا۔ ان کی وجہ سے شریف منزل علم و ہنر کی صحبتوں اور ارباب کمال کی مجلسوں کا ایک نمونہ تھی۔ جس کی نظیر خود اس زمانہ کی دلی میں نہیں ملتی ہے۔ حکیم جمیل خاں نے اجمل خاں کے مخصوص احباب میں نہ صرف ان کا تذکرہ کیا ہے جن کی صحبتیں انہوں نے خود دیکھی ہیں۔ نہ صرف اجمل خاں کے ہم عمر اور شریف منزل کی صحبتوں کے شریک کی حیثیت سے بلکہ دہلی کی یادگار شخصیتوں کے

---

[1] یہ دلی ہے داشاعت دوم / ص ۸، و ۹۔

[2] پروانہ چراغ مزار خود کہ ما ص ۳۲

تعلق سے ان کا تعارف دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ۱۰نواب محمد حسن خاں خوش مزاج نیک اطوار رئیسانہ زندگی بسر کرنے والے۔ دہلی میں سب رجسٹرار کے عہدہ پر مامور تھے اور بے تکلف احباب میں تھے۔ مٹیا محل میں شاندار حویلی (حویلی صدر الصدور) میں رہتے تھے۔ اجمل خاں کی زندگی ہی میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ سر رفیق جج خاص دوستوں میں تھے۔ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اس لیے دہلی میں بہت کم رہتے تھے پرانی وضع کے پابند تھے۔ جب دہلی میں ہوتے تھے تو انگرکھا پہن کر باہر نکلتے تھے۔ حاجی عبدالغفار حاجی علی جان عرف بچے میاں کی فرم کے مالک تھے۔ اعتقاداً اہل حدیث تھے اس لیے لباس بالکل سادہ مگر سپید اور اجلا ہوتا تھا، خوش مزاج اور خوش گفتار تھے۔ ہز ہائی نس نواب سراج الدین والی ریاست لوہارو، قدیم طرز زندگی پسند کرتے تھے، ہر ادا سے نوابی شان ٹپکتی تھی۔ جمیل خاں کا بیان ہے کہ انہوں نے کسی رئیس کو اس قدر منکسر المزاج نہیں دیکھا، موصوف کا مکان شریف منزل سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر تھا اور وہ ہمیشہ یہ راستہ پیدل طے کرتے تھے اور راستہ میں اگر کوئی واقف کار دہلی کا باشندہ مل جاتا تو بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ پہلے وہ سلام کرے بلکہ وہ خود ہی پہل کرتے تھے اور اسے ٹھہرا کر مزاج پرسی کرتے تھے حاجی عبدالرازق تاجر و رئیس دہلی سے پرخلوص تعلق تھا۔ عموماً روزانہ صحبت میں شریک ہوتے تھے۔ نواب مرزا محمد علی بیگ رئیس دہلی ان کو شاہنامہ کے اکثر اشعار یاد تھے لطیفہ گو، بذلہ سنج تھے۔ اجمل خاں کے انتقال کے بعد بہت کم عرصہ زندہ رہے۔ خواجہ تصدق حسین سب جج دہلی، گوڑگانوں کے رہنے والے تھے۔ عموماً رات کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ آدمی باوضع اور صاف باطن تھے۔ اجمل خاں کی زندگی میں انتقال ہوگیا تھا۔ ڈپٹی جمیل الدین پرانی وضع کے پابند تھے۔ کیمیاوی نسخہ بنانے کا بہت شوق تھا۔ سیٹھ ہارون کراچی کے رہنے والے اور بہت خلیق آدمی تھے۔ دہلی میں ٹھیکے داری کرتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں عرصہ تک ان کا قیام رہا۔ ڈپٹی نثار حسین سہارنپور کے رہنے والے، ہنس مکھ، وقت کو خوشی سے گزارنے والے اور رمنجان مرنج شخص

تھے۔ تناکو سے سخت نفرت تھی۔ ہر شخص سے اس کی برائی بیان کرتے تھے۔ اجمل خاں کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ اور ہفتوں ان کے پاس ٹھہرتے تھے۔ نواب فیض احمد خاں سب سے زیادہ مخلص دوست بہت سمجھ دار اور دور اندیش انسان تھے نفرا کا اعتقاد زیادہ تھا۔ کانگریسی تحریک کے سخت مخالف تھے۔ دہلی کے پبلک معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ اجمل خاں کے کانگریس میں شریک ہونے کے بعد گوشہ نشین ہو گئے۔ کئی سال صاحب فراش رہ کر انتقال کیا۔ جمیل خاں سے بے حد شفقت اور تعلق کے باوجود جب ایک مقدمہ میں عدالت کی طرف سے ثالث مقرر ہوتے تو ان کے خلاف فیصلہ دیا۔ لیکن ان کی منظوری لے کر یہ ان کے اعلیٰ کردار کی بات تھی۔ لالہ سری رام رئیس دہلی باوضع اور خوش اخلاق آدمی تھے۔ شعر و سخن سے خاص شوق تھا۔ پرانی کتابیں جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ پان سے بہت رغبت تھی۔ پاجامہ شیروانی اور رامپوری ٹوپی پہنتے تھے۔ مزاج میں وہم تھا دل کے کمزور تھے۔ طبیعت میں ظرافت اور بذلہ سنجی تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو سے حکیم صاحب کے برادرانہ تعلقات تھے۔ جب حکیم صاحب گھوڑا گھال میں مقیم تھے تو موصوف مع اپنی صاحبزادیوں کے ان کے پاس ٹھہرے۔ چہرہ سے متانت، سنجیدگی اور شرافت کا اظہار ہوتا تھا۔ کوٹھی میں بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مہمان ٹھہرا ہوا ہے بلکہ ان کی خوش مزاجی اور بے تکلفی سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ خاندان کا کوئی بااثر شخص قیام پذیر ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات باورچی کو بلا کر دریافت کرتے تھے کہ آج کیا پکاؤ گے اور اس کے جواب کے بعد اپنی مرضی کے مطابق ترمیم کر دیتے تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری بغیر کسی خود غرضی کے قوم کے سچے بہی خواہ۔ اجمل خاں کے مخلص دوست، ہنس مکھ، ہندو مسلم اتحاد کے حامی، پرانی اور نئی تہذیب کو پسند کرتے تھے۔ جامہ زیب تھے۔ انگرکھا بھی کھلتا تھا، شیروانی بھی خوشنما معلوم ہوتی تھی۔ کوٹ پتلون میں بھی شاندار نظر آتے تھے۔ عالی دماغ عالی ظرف اور مستقل مزاج تھے۔ آصف علی

بیرسٹر کم گو، متین، سنجیدہ، پرانی تہذیب کو پسند کرنے والے سیاسی امور میں ڈاکٹر انصاری اور اجمل خاں کے مشیر و معتمد تھے۔ سر عبدالرحمٰن وکیل و جج ہائی کورٹ، ہنس مکھ، قابل، دہلی کے نامور وکیل تھے۔ پھر مدراس ہائی کورٹ اور بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے اجمل خاں کے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ نواب ضمیر مرزا حد درجہ متین اور مذہبی آدمی تھے۔ صوم و صلوٰۃ اور وظیفہ و ظایف کے انتہائی پابند تھے۔ اجمل خاں سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ لباس میں سادگی تھی ماتھے پر سجدہ کا نشان۔ طبیعت میں ظرافت تھی۔ مسکرا کر گفتگو کرتے تھے۔ نواب شجاع الدین احمد خاں "تاباں" اجمل خاں کے پرائیوٹ مشاعروں کی جان تھے۔ تقریبًا ہر مشاعرہ میں شریک ہوتے تھے۔ غالب کے کسی شعر پر اعتراض کر دینا ان کی چڑ تھی۔ اس پر بے قابو ہو جاتے تھے۔ ان کو استاد نہ کہنا یا ان کے کسی شعر کی داد نہ دینا ان کے غصہ کو دعوت دینا تھا۔ اجمل خاں ان کی اور ان کے حقیقی بھائی نواب سراج الدین احمد خاں سائل کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ سائل تاباں کے چھوٹے بھائی، خوش گلو شاعر تھے۔ شعر پڑھنے کا لہجہ خاص تھا۔ اجمل خاں کے تقریبًا ہر مشاعرہ میں بڑے بھائی کے سب و شتم کا شکار ہوتے تھے۔ لیکن انتہائی سعادت مندی کا اظہار کرتے تھے۔ آخر عمر میں معذور ہو گئے تھے، رکشہ میں پھرتے تھے۔ لیکن ہفتہ دو ہفتہ میں شریف منزل آتے تھے۔ غرض یہ کہ اجمل خاں کے زمانہ میں ایک باغ لگا ہوا تھا۔ جس کے پھولوں کی خوشبو سے دہلی مہک رہی تھی۔[1]

حکیم اجمل خاں کے بعد حکیم محمد احمد خاں، حکیم ظفر احمد خاں، حکیم غلام کبریا خاں اور حکیم جمیل خاں کے زمانہ میں بھی شریف منزل کی رونق کسی نہ کسی درجہ میں قایم رہی اور ان حضرات نے خاندانی روایات اور دہلی کی شاندار اقدار کو بڑی حد تک

---

[1] سیرت اجمل دیباچہ حکیم جمیل خاں ص ۵

برقرار رکھا۔

۱۹۴۷ کے ہنگاموں میں ۱۸۵۷ کی طرح شریف منزل محفوظ رہی۔ اور اس کی وجہ سے بلی ماران اور اس کے آس پاس کا علاقہ غارتگری سے بچا رہا۔ دہلی میں مجھ سے ایک قابل اعتبار شخص نے کہا تھا کہ ۱۹۴۷ میں جب دہلی کا امن تباہ ہوا تو چاندنی چوک میں بلی ماران کے نکڑ پر باقاعدہ فوج متعین تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا کہنا تھا کہ اگر شریف منزل کو کچھ نقصان پہنچا تو میں منھ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ اس ہنگامہ کے فرو ہونے کے بعد شریف منزل کو ایک اور آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ حکیم محمد احمد خاں کے چھوٹے بیٹے حکیم مجید احمد خاں اور اس سے پہلے حکیم بھورے میاں کے چھوٹے صاحبزادہ حکیم حامد سعید خاں پاکستان منتقل ہو گئے۔ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں کی چار صاحبزادیاں تھیں، ان کے دو نواسے حکیم عبدالصمد خاں اور حکیم عزیز الرحمٰن خاں پاکستان گئے۔ دو اور نواسوں حکیم محمد لبیق خاں اور حکیم محمد بشیر خاں نے بھی نقل مکانی اختیار کی۔ اس کی وجہ سے شریف منزل کا کافی حصہ کسٹوڈین میں جا رہا تھا مگر پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کے اثرات سے وہ مستثنیٰ قرار پائی اور کسٹوڈین میں نہیں گئی۔

۱۹۷۰ تک دہلی کے زمانہ قیام میں راقم سطور کو شریف منزل میں حکیم محمود احمد خاں (خلف حکیم محمد احمد خاں) کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ حکیم ظفر احمد خاں کے صاحبزادہ حکیم شریف احمد خاں سے بھی مراسم قائم تھے۔ ایک مرتبہ حکیم جمیل خاں سے اور دو تین مرتبہ حکیم محمود سعید خاں سے بھی شرف نیاز کا موقع ملا۔ اس وقت تک شریف منزل اپنے قدیم آثار پر قایم تھی۔ اس کی سہ دری، صدر نشین، خاندان کا مطب اجمل خاں اور دوسرے اراکین خاندان کی نشست گاہیں محفوظ تھیں، لیکن اب چند سال سے وہ نقشہ بدل چکا ہے اور آج وہاں جانے والا اس کی شوکت دیرینہ کا اندازہ کرنے سے قاصر ہے[1] بقول مظفر حسین سید "اس دور کی شریف منزل آج کی شریف

---

[1] ایوان اردو دہلی جون ۱۹۸۸ ص ۳۴ مضمون سید ظل الرحمٰن

منزل نہ تھی۔ نہ وہاں کوئی بازار تھا نہ دفتر نہ دوکان نہ ہوٹل۔ بڑے پھاٹک کے بعد دو رویہ اطبا کی بیٹھکیں تھیں، جہاں ہر خاص و عام کے لیے دریائے شفا جاری و ساری تھا۔[1]

شفاء الملک حکیم رضی الدین احمد

عمدۃ الدولہ اعتماد الملک حکیم غلام نجف خاں کے پوتے اور حکیم ظہیر الدین خاں کے بیٹے حکیم رضی الدین احمد خاں ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ حکیم برکات احمد ٹونکی اور دوسرے علماء سے تعلیم حاصل کی۔[2] ان کا شمار دہلی کے معزز ترین رؤسا میں تھا دہلی کی ثقافتی زندگی میں وہ بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ شعر گوئی کی محفلیں بھی ان کے ہاں منعقد ہوتی تھیں۔ ۲۹ سال تک دہلی میونسپل کمیٹی کے ممبر اور ۲۱ برس تک آنریری مجسٹریٹ رہے۔ پنجاب یونی ورسٹی کے فیلو، پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی اور اینگلو عربک ہائی اسکول کمیٹی کے عرصہ تک ممبر رہے۔ عمدۃ الحکما اور زبدۃ الحکما کلاسوں کے ممتحن رہتے تھے۔ آٹھ برس سیکنڈ کلاس اور ایک برس فرسٹ کلاس مجسٹریٹ رہے۔[3] رفاہ عام کے کاموں میں بڑا حصہ لیتے تھے۔ حکومت برطانیہ نے ۱۹۱۰ء میں شفاء الملک کا خطاب دیا۔ ان سے قبل یہ خطاب کسی طبیب کو عطا نہیں ہوا تھا۔ اس طرح انہیں شفاء الملک اول کا مرتبہ حاصل ہے۔ انہیں پہلے خان صاحب اور پھر خان بہادر کا بھی خطاب ملا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم کے دہلی دربار کے موقع پر اپنی طبی عظمت اور عوامی خدمت کی وجہ سے شاہی طبیب مقرر کیے گئے کٹرہ آدینہ بیگ لال کنواں میں حکیم صاحب کا دولت کدہ شفا منزل کے نام سے تھا اسی میں

---

[1] دہلی والے جلد ۲ ص ۲۱۹

[2] نزہۃ الخواطر جلد ۸ ص ۱۵۲

[3] آثار دہلی ص ۴۷

مطب کرتے تھے۔ ہمدرد دواخانہ کے سرپرست رہے۔ کامل فن طبیب اور جامع کمالات انسان تھے۔ ایک خلقت ان کے علاج سے مستفید ہوئی۔ حکیم صاحب ہیضہ کے علاج میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن خود ہیضہ میں مبتلا ہوتے۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے علاج کیا۔ انتہائی کوشش کی کہ ایک قطرہ پیشاب کا آجائے۔ لیکن ایک قطرہ پیشاب آکر نہیں دیا، ۔ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء کو ۸۶ برس کی عمر میں وفات پائی[1] حسب وصیت غلام نجف خاں کے پائیں قدم شریف میں دفن کیا گیا۔ غم مرحوم سے سال وفات برآمد ہوتا ہے۔ قطعۂ تاریخ کے چند اشعار ہیں[2]۔

رضی الدین احمد خاں بہادر — تمہارا کیوں کے جھیلیں رنج فرقت
یہ کیا معلوم تھا کہنی پڑے گی — تمہاری اور مجھے تاریخ ہجرت
پڑیں ایسے سخن گوئی پہ پتھر — تمہارا میں نکالوں سال رحلت
کہاں سے لاؤں پتھر کا کلیجہ — کروں کس دل سے اس میں غور و فکرت
تلاش مادے کا ہوش کس کو — کہاں وہ فکر کی اس غم میں جودت
مگر اتنا تو کہہ دیتے ہیں اب بھی — تمہاری تا نہ رہ جائے شکایت
رہے گی یاد لیکن سوگ کے ساتھ — شفاء الملک کی ناگاہ رحلت

۸۶

۱۲۴۸ + ۸۶ — ۱۳۳۴ھ

حکیم رضی الدین بڑے صاحب علم اور صاحب ذوق تھے۔ لالہ سری رام کی کتاب خمخانۂ جاوید پر ان کی تقریظ ان کی ادبی شخصیت کا تعارف کراتی ہے۔

حکیم رضی الدین کی حکیم اجمل خاں سے شدید معاصرانہ چشمک رہی، دہلی کی ثقافتی اور رفاہی سرگرمیوں کے ساتھ طبی تحریک بھی اس سے متاثر ہوئی۔ آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کو ان کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

راشد الخیری نے لکھا تھا" شہر اجڑا، شہر والے اجڑے۔ نواب علاء الدین خاں

---

[1] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۳۵۴

[2] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۱۸۲

کی سرکار، حکیم محمود خاں کا دربار، حکیم ظہیر الدین خاں کی بیٹھک، ہائے کیا سبھائیں اٹھی ہیں کیسے پایہ کے لوگ تھے۔ اب اجڑے شہر کی نشانیاں یہ دو گھر رہ گئے ہیں اجمل خاں اور رضی الدین خاں۔ مگر غضب دیکھو دونوں میں پھوٹ ہے۔"

حکیم اشفاق احمد

دہلی والوں کو میلوں ٹھیلوں کا بڑا شوق رہا ہے۔ دہلی کی ہستی غالب کے بقول جن ہنگاموں پر موقوف تھی وہ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا تھا۔ مرغ، بٹیر، کبوتر اور بعض دوسرے شوق جن میں دلی والوں کو کمال تھا ان میں پتنگ بازی بھی تھی۔

دہلی میں پتنگ بازی کا شوق شاہی زمانہ سے رہا ہے۔ اس دلچسپ اور رنگین شوق میں دہلی کے لوگ بہت بڑھے ہوتے تھے، بہادر شاہ ظفر خود پتنگ بازی دیکھنے جاتے تھے۔ دہلی میں مہذب کائٹ کلب بلی ماران میں قایم تھا۔ اس کے بانی حکیم اشفاق احمد عرف حکیم عنو میاں تھے۔ یہ کلب اپنے زمانے کے دلی کے تمام کلبوں کا سرتاج تھا۔ حکیم عنو میاں اس کے علاوہ بھی دلی کے ہر کلب کی جہاں تک ان سے بن پڑتا تھا سرپرستی اور اعانت فرماتے رہتے تھے۔[1]

دیوان مان سنگھ

دیوان مان سنگھ ویش اگروال کی گوت گوپل سے تعلق رکھتے تھے، شاہان مغلیہ کے زمانہ سے ان کا خاندان نہایت معزز اور صاحب علم رہا۔ ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں نواب

---

[1] یہ دہلی ہے ص ۱۸۰

فوجدار خاں نے جب قصبہ فرخ نگر آباد کیا تو ان کے خاندان کو کمال عزت سے اس قصبہ
میں آباد کر کے معقول زمین عطا کی۔ ان کے خاندان کے بزرگ مختلف ریاستوں میں معزز
عہدوں پر رہنے کے بعد عمر کے آخری زمانہ میں سرکار فرخ نگر کی مصاحبت ہی کا
فخر حاصل کرتے تھے۔ اور دیوان جی کے خطاب سے یاد کئے جاتے تھے۔ ان کے
ایک بزرگ سیتارام بڑے باکمال گزرے ہیں۔ طب سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔
کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ایک بڑا کتب خانہ چھوڑ گئے تھے۔ ان کے تجربہ
کردہ نسخے ان کے خاندان کے معمولات میں شامل رہے۔

دیوان مان سنگھ کے دادا گلاب سنگھ فارسی علم وادب میں فاضل اور نامور
شخص تھے۔ طب میں مہارت حاصل تھی۔ مان سنگھ ۱۸۶۴ میں پیدا ہوئے انہیں ان
کے چچا منشی مرلی دھر نے اپنا متبنیٰ بنالیا تھا۔ مان سنگھ نے ایک عرصہ تک فارسی
کتابیں شیخ رحیم بخش سے پڑھیں، ان کے انتقال کے بعد کچھ دنوں اپنے بزرگ دادا
اور پنڈت بالک رام منشی فاضل سے فارسی درسیات کی تکمیل کی۔ پنڈت
مکھن لال شاستری بھاگوتی برج باسی سے سنسکرت کی کچھ تعلیم حاصل کی اور کچھ مذہبی
گرنتھ بھی دیکھے۔ اس کے بعد پنڈت گوبند سہائے شاستری سے جو جوتش اور آیور
ویدک میں فرد کامل تھے، دواسازی اور مطب سیکھا۔ ۱۸۸۲ء میں ریاست گوالیار
گئے۔ اور وہاں ملازمت اختیار کر کے طبی شغل جاری رکھا۔ والد کے انتقال کی اطلاع
پاکر دہلی واپس آئے اور دہلی میں مطب شروع کیا۔

دہلی میں ایک ویدک پاٹھ شالا تھی جس میں لاہور کے فاضل دید [illegible] کشنا
بشن شاستری پڑھاتے تھے، مان سنگھ جی نے ان سے باقاعدہ تعلیم شروع کر کے
۱۸۹۸ء میں پاٹھ شالا کے امتحان میں امتیاز سے کامیابی حاصل کی۔

دہلی میں انہوں نے ایک وید سبھا قایم کی۔ لیکن وہ زیادہ عرصہ جاری نہیں رہ
سکی۔ ۱۹۰۶ء میں جب مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے طبی کانفرنس کی بنیاد ڈالی تو یہ اس
کے نائب صدر بنائے گئے۔ پھر ۱۹۱۰ء میں جب آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی

طبی کانفرنس کا باضابطہ قیام عمل میں آیا تو یہ اس کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ حکیم اجمل خاں صدر تھے۔ مان سنگھ کی اصل شہرت کا باعث طبی کانفرنس سے ان کی وابستگی ہے۔ کانفرنس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے انہیں بڑی ناموری حاصل ہوئی۔ انہوں نے جس تندہی اور جانفشانی سے کانفرنس کا کام انجام دیا اور اجمل خاں کے دست راست کے بطور دیسی طبوں کے فروغ کے لیے جو انتھک جدوجہد کی اس کی وجہ سے طبی حلقوں میں انہیں احترام کا خاص درجہ حاصل تھا۔ کانفرنس سے اپنے بے غرض تعلق کے بارے میں انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے "میں جہاں تک خیال کرتا ہوں، میں طبی خدمات کے لیے دلدادہ ہو کر اپنی طبی زندگی وقف کئے ہوئے ہوں اور ان خدمات سے کسی مالی معاوضہ کا آرزومند نہیں ہوں۔ مگر دقیقہ رس باریک بنیان اور دور اندیش دوستان بے غرض خدا کو بھی سلام کرنے کا کسی پر اعتماد نہیں فرماتے ہیں۔ اس قول کو سچ کہتا ہوں اور تائید کے ساتھ اپنی غرض بھی بتاتا ہوں یعنی جیسے کہ معلوم ہے میں لاولد ہوں۔ میرا برادر حقیقی ہوشیار مطلب اندیش اور اس کی اولاد قابل عتاب و عذاب میرا نام گمنام کرنے میں قابلیت کا اظہار کرتا ہے۔ اس لیے یہ عزیز طبی کام (کانفرنس) اگر میرا دل پسند نور چشم بن جائے اور میری سچی خدمت سے قوم اور اہل فن کو ایسا خوش کرے کہ یہ ارجمند جب گود کا کھلونا اور یہ عزیز راحت جان ہونے سے گزر کر عہد بلوغت حاصل کر کے عالم شباب میں مکمل اطوار کے ساتھ مجھ کو وہ معاوضہ بخشے کہ جس پر اہل ملک اس کو داد پانے کا مستحق مان لیویں تو میں اپنا دھن من تن اس پر قربان کرتا ہوا اپنے ترکہ کا اس کو وارث بناؤں[1]"

آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کی روئدادوں کی ترتیب کے علاوہ ان کا ایک قابل قدر کام کانفرنس کے اجلاسوں میں پیش کردہ مجربات

---

[1] رموز الاطبا جلد ۱ ص ۷۷

کو کتابی شکل میں مرتب کرنا ہے۔ مدری مجربات کے نام سے کئی جلدوں پر مشتمل یہ مجموعہ معمولاتِ اطبا کے سلسلہ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

حکیم پیرجی عبدالرزاق

سید عبدالرزاق ابن حکیم سید خورشید علی جو پیرجی عبدالرزاق کے نام سے مشہور ہیں۔ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں کے شاگرد رشید تھے۔ مدرسہ طبیہ دہلی میں تشریح کے استاد رہے۔ تشریح کے زبردست فاضل تھے۔ اس مضمون میں اس یونانی طبیب کی معلومات اتنی ہی زیادہ تھیں جتنی کسی جدید ماہر تشریح کی ہوسکتی ہیں۔ مدرسہ طبیہ کے ایک پرانے طالب علم حکیم عبدالجلیل سہابر یلوی مرحوم نے راقم سے بیان کیا تھا کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں سے لندن میں کسی ڈاکٹر نے تشریح کے سوالات کئے۔ حکیم صاحب نے کہا دہلی آئیے وہاں طب اور تشریح کے ایک فاضل سے ملاقات کے بعد آپ کو ان کی تشریح دانی کا اندازہ ہوگا۔ اتفاق سے وہ ڈاکٹر دہلی آیا تو حکیم صاحب نے پیرجی عبدالرزاق سے تعارف کرایا، جنہوں نے اس کے تشریحی سوالات کے بہت صحیح اور عمدہ جوابات دیئے وہ بہت حیرت زدہ اور مسرور ہوا اور انہیں لندن آنے کی دعوت دی۔

ان کی تصانیف میں ایک توضیح البیانات فی شرح تشریح القربانات ہے۔ اسے وہ عربی میں اردو ترجمہ اور تصاویر کے ساتھ شایع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے یہ قانون ابن سینا کے مقالہ تشریح شربانات کی مفصل شرح ہے، انجمن طبیہ کے ترجمان ماہنامہ مجلہ طبیہ کے صفحات میں جو ان کی زیر ادارت نکلتا تھا، بالاقساط شایع ہوا ہے۔ ان کی دوسری کتاب تعلیم القابلہ ہے۔ اس کا پہلا حصہ اعضاء نسواں کی تشریح میں ہے جو ۱۹۰۹ء میں طبع ہوا ہے۔ چوتھا حصہ معالجات نسواں سے متعلق ہے جو ۱۹۱۶ء میں چھپا ہے۔ حکیم محمد کاظم کی کتاب اغذیۃ المرضیٰ ان کی کوششوں سے

ضروری و مفید حواشی کے ساتھ شائع ہوئی ہے حکیم صادق علی خاں کی کتاب شرح تشریح اعضار مرکبہ بھی ان کی محنت اور حواشی کے اضافہ کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔

موجز پر ان کا حاشیہ "الموجز المحشی بالتخبینۃ الجدیدۃ" کے نام سے مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۹۰۵ میں شایع ہوا تھا۔ حکیم صاحب زنانہ طبیہ کالج دہلی کے پرنسپل رہے۔ بعارضہ ذات الریہ ۱۶ مئی ۱۹۱۷ مطابق ۲۴ رجب ۱۳۳۵ کو انتقال ہوا۔ طبیہ کالج کے احاطہ میں دفن ہیں۔

حکیم پیر جی عبدالرزاق کے بھائی حکیم سید آل حسن تھے جو آبائی وطن چاند پور (بجنور) میں مطب کرتے تھے۔ ان کی کئی غیر مطبوعہ طبی کتابیں ہیں ایک کتاب حکیم محمد حسین آزاد (مراد آباد) کے پاس محفوظ ہے۔ آل حسن کے بیٹے حکیم ابن حسن بھی اچھے طبیب تھے ۱۹۹۰ء میں انتقال ہوا۔ حکیم ابن حسن کے بیٹے حکیم غلام غوث مطب کر رہے۔ ان کے پاس آل حسن کی کتابیں موجود ہیں۔

حکیم عبدالنبی خاں

حکیم غلام نبی خاں کے بڑے صاحبزادہ تھے۔ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد کی عمر ۲۴ برس کی تھی اور وہ کلکتہ میں مطب کرتے تھے۔ عبدالنبی خاں کی تعلیم دہلی کے بہترین اساتذہ سے ہوئی۔ عربی زبان کی تعلیم پر خاص توجہ دی گئی۔ انہیں اپنے معلم سے عربی میں گفتگو کرنے کی ہدایت تھی، وہ نہ صرف عربی میں گفتگو پر بہت قادر تھے بلکہ ان کے لہجہ میں بھی عربیت آگئی تھی۔ ایک مرتبہ ان کے مطب میں ایک عرب حاضر ہوا اور اس نے کسی اردو داں کے ذریعہ جو عربی سے واقف تھا اپنا حال لکھوا کر حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ مگر حکیم صاحب نے اس سے عربی میں ایسی گفتگو کی کہ وہ حیران رہ گیا، اس نے کہا آپ ہندی نژاد نہیں عربی نژاد ہیں، یا آپ کی عمر کا ابتدائی حصہ ممالک عربیہ میں گزرا ہے۔

حکیم صاحب نے مدرسہ عالیہ کلکتہ سے فراغت کی تھی۔ اور طب کی تعلیم دہلی میں حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں سے حاصل کی تھی مطب کے رموز و نکات خود حکیم غلام نبی نے سکھائے۔ انہوں نے کلکتہ میں لوگوں کے دلوں میں حذاقت فن کا نقش بٹھایا دربھنگہ، مرشد آباد اور دوسری ریاستوں میں بحیثیت معالج یاد کئے جاتے تھے ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء میں دہلی میں انتقال کیا، اور قدم شریف میں اپنے والد کے پائیں مدفون ہوئے۔

حکیم عبدالنبی خاں اپنے اسلاف کی خوبیوں کے جامع تھے۔ اخلاق، غربا پروری، استغنا اور مروت سے ان کی شخصیت عبارت تھی۔ حکیم محمد زکریا خاں شفاان کے اکلوتے بیٹے تھے۔

شفاء الملک حکیم عبدالرشید خاں

حکیم عبدالرشید حکیم غلام نبی کے منجھلے صاحبزادہ تھے۔ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ کلکتہ میں مفتی اقبال حسین سے حدیث و فقہ کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔ طب کی تعلیم حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں سے دہلی میں حاصل کی۔ ۲۲ شوال ۱۳۰۶ ۲۱ جون ۱۸۸۹ جب حاذق الملک نے مدرسہ طبیہ جاری کیا تو اس میں داخل ہو کر مسلسل تین برس پڑھا اور ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء میں سند حاصل کی۔ ابتدا میں کلکتہ میں مطب کیا، اور قابل رشک کامیابی ملی۔ ۱۹۱۴ء میں خان بہادر کا خطاب عطا ہوا۔ ان کی کوششوں سے حکومت بنگال نے بنگال طبی کمیٹی قائم کی۔ میجر سر حسن سہروردی اس کے سکریٹری تھے۔ انہوں نے رپورٹ تیار کرنے کے لیے حکیم صاحب کو منتخب کیا۔ حکیم صاحب نے بڑی محنت سے رپورٹ مرتب کی۔ خود ان کا مطب رپورٹ کی کامیابی کا ضامن تھا، جہاں کئی سو مریض روز آتے تھے۔ ان کی طبی حذاقت سے متاثر ہو کر انہیں شفاء الملک کے خطاب سے نوازا گیا، خاندان شریفی میں شفاء الملک کا خطاب صرف انہی کو عطا کیا گیا تھا۔

حکیم صاحب کی فنی مہارت سے متاثر ہو کر مہاراجہ در بھنگہ نے اپنی ریاست میں مشیر طبی مقرر کیا۔ اس ریاست کی ملازمت کے علاوہ مہاراجہ صاحب بردوان اور نواب مرشد آباد بھی طبیب خاص کی حیثیت سے انہیں اپنی ریاستوں میں بلاتے رہے۔ ۱۹۲۷ء میں دہلی واپس آئے۔ اور کلکتہ کے مطب کے لیے اپنے بھتیجہ اور داماد حکیم محمد زکریا کو روانہ کیا۔

۱۹۳۱ء میں انہوں نے دہلی میں اعلیٰ پیمانہ پر یونانی دواخانہ کے قیام کا منصوبہ بنایا مگر اس سے پہلے ہی جنوری ۱۹۳۲ء میں انتقال کیا، بعد میں ان کے صاحبزادہ حکیم عبدالرحیم خاں نے بلی ماران میں شریفی دواخانہ قایم کیا۔ اس کی سرپرستی کے لیے کلکتہ سے حکیم محمد زکریا دہلی آئے جو اس وقت خاندان شریفی کے بڑے لائق اور محترم فرد تھے۔ اس دواخانہ کی طبی مجلس کے صدر حکیم عبدالغنی خاں، سرپرست حکیم محمد زکریا خاں اور رکن حکیم محمود احمد خاں (خلف حکیم محمد احمد خاں) حکیم حامد سعید خاں (خلف حکیم غلام کبریا خاں) حکیم ہاشم جان (نبیسہ حکیم اجمل خاں) حکیم محمد لیئق خاں (نبیسہ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں) تھے [۱]

حکیم منیرالدین

حکیم قیام الدین کے بعد خاندان بقائی کی عدیم المثال طبی روایات کو زندہ رکھنے اور ان میں چار چاند لگانے کی عزت حکیم قیام الدین کے صاحبزادہ حکیم منیرالدین کو حاصل ہوئی۔ اس زمانہ میں گلی حکیم بقائی میں حکیم قیام الدین کے چار بیٹوں حکیم منیرالدین حکیم بشیرالدین حکیم مجیب الدین اور حکیم مکرم الدین (وفات ۱۹۴۳) کے مطب قایم تھے۔ اسی گلی میں دواخانہ بقائی بھی تھا جس کی نگرانی حکیم منیرالدین فرماتے تھے۔ انہوں نے اپنی

---

[۱] مشاہیر الاطباجون ۱۹۸۰ ص ۶۶

بے نظیر قابلیت سے نہ صرف بزرگوں کی شہرت اور نیک نامی کو زندہ رکھا بلکہ اپنی ذکاوت و ذہانت سے دہلی میں طبی معالجہ کو فروغ دیا۔ حکیم صاحب اور ان کی اہلیہ سائیں توکل شاہ سے بیعت تھیں۔[1]

حکیم احمد سعید خاں

حکیم غلام رضا خاں کے برادر خرد تھے۔ بڑے عالی قدر اور رتبے کے طبیب تھے مزاج میں رئیسانہ شان تھی، دہلی میں بڑا کامیاب مطب تھا اور بہت مرجوعہ رہتا تھا، دہلی میونسپل کے آنریری وائس پریذیڈنٹ رہے، اور بہت سی رفاہی خدمات انجام دیں۔ حکومت برطانیہ نے خان بہادر کے خطاب سے بھی نوازا تھا خاندانی عزت و وقار کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ شاندار اور وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔[2] مسیح الملک حکیم اجمل خاں کو ان سے بہت ذاتی تعلق تھا۔ ان کی علمی صلاحیتوں کو ابھارنے میں ان کی کوششوں کو خاص دخل تھا۔ ذہانت اور طباعی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔ ؎

چو احمد سعید از جہاں کرد رحلت
غمیں گشتند احباب و محزوں اعزا

کشیدہ آہ عمزاد مرحوم گفتہ
زتوحی سعیدا وفات سعیدا

حکیم احمد سعید کی شادی حکیم اجمل خاں کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی۔ حکیم غلام کبریا عرف بھورے میاں صاحبزادہ تھے۔ راقم الحروف کے ذخیرہ میں حکیم احمد سعید کے نام حکیم اجمل خاں کا ایک خط محفوظ ہے۔ یہ خط حکیم اجمل خاں نے ۱۹ مئی ۱۹۰۲ کو انہیں رامپور سے لکھا ہے۔ بشیر الدین احمد نے ان کے اور ان کے والد اور بیٹے کے

---

[1] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۱۹۱ دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۱۱۸

[2] تذکرۃ الخواجگان ص ۱۰۲

دالان اور مطب کا ذکر کیا ہے دہلی ماران میں مکان حکیم غلام رضا خاں تھا، جہاں حکیم غلام کبریا خاں عرف حکیم بھورے میاں فرزند خان بہادر حکیم احمد سعید خاں مطب کرتے تھے۔[۱]

حکیم اسد علی مضطر

حکیم اسد علی مضطر دہلوی خاندان شریفی کے ان ارکان میں تھے جنہیں شاعری سے خاص ذوق تھا، ان کے دادا حکیم اشرف محمد خاں بھی قادر الکلام شاعر تھے، مضطر نے مرزا قربان علی بیگ سے کسب سخن کیا تھا۔ ناسخ نے انہیں مشاعروں میں شریک دیکھا تھا[۲] مضطر اجمل خاں کی محفل کے خاص رکن تھے اور طبی کانفرنس سے دلچسپی رکھتے تھے۔

حکیم ناصر نذیر فراق

حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی خانوادہ میر درد کے ممتاز فرد اور دہلی میں اپنے بزرگوں کے کمالات کے وارث اور صاحب علم و فضل تھے، میر درد سے ان کا ننھیالی تعلق تھا۔ ناصر نذیر کا سلسلہ نسب ابوالفرح واسطی کے ذریعہ امام زید شہید بن امام زین العابدین سے ملتا ہے، سید ابوالفرح واسطی کے بیٹے سید عوض، سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور بلگرام اور بارہ میں ان کا خاندان آباد ہوا۔ فراق کے بزرگوں کو مغلیہ عہد میں منصب ہزاری و پنج ہزاری حاصل رہا۔ دہلی سے قریب قصبہ لونی سے گڑھ مکتیشر تک ان کی جاگیر تھی۔ فراق کے والد سید محسن علی زیدی

---

[۱] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۲۴۰

[۲] سخن شعرا ص ۴۴۷

حدیث میں نذیر حسین محدث کے شاگرد تھے۔ سلوک کی تعلیم شاہ احمد سعید اور شاہ عبدالغنی نقشبندی سے حاصل کی تھی۔ نستعلیق اپنے والد سے سیکھا تھا جو اس فن میں میر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔ شاعری میں مومن خاں سے اصلاح لی تھی۔ ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱ء میں رحلت کی۔[1] ۱۸۵۷ء کے کئی برس بعد رئیس دھرم پور نے انہیں اپنے ہاں بلا لیا تھا۔

حکیم ناصر نذیر فراق ۱۶ اگست ۱۸۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کے علاوہ طب میں مہارت تھی، مطب کرتے تھے، اور اس میں کامیاب تھے۔ دہلی کی تہذیبی و ثقافتی قدریں ان کی شخصیت میں نمایاں تھیں۔ متعدد علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ میخانہ درد، دردِ ماں فراق، لال قلعہ کی ایک جھلک، سات علاقوں کی کہانیاں، بیگموں کی چھیڑ چھاڑ، چاند دکن کی پری، مضامین فراق ان کی تصانیف میں ہیں۔ اردو کا دیوان بھی تھا۔ فراق مخزن کے ابتدائی لکھنے والوں میں تھے۔ سر عبدالقادر کی فرمائش پر ایک ناول المور بھی لکھا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے ناتمام ڈرامہ اکبر کی تکمیل ان کے ہاتھوں ہوئی "دہلی کی قدیم تہذیب اور مغلیہ دور پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ "دہلی کا آخری دیدار" میں اب سے سو سال پہلے کی دہلی کی سوسائٹی، دہلی والوں کے رسم و رواج، امرا کے مشاغل غربا کی طرز معیشت، تہواروں کی رنگ رلیاں، یہاں تک کے سودا سلف بیچنے والوں کی صدائیں بھی ہیں۔"[2] ۱۲ فروری ۱۹۳۳ء کو فالج میں انتقال ہوا۔ حکیم صاحب خواجہ اللہ بخش تونسوی سے بیعت تھے۔ ان کے اکلوتے بیٹے حکیم سید ناصر خلیق بھی ذی علم اور کامیاب طبیب تھے۔ میخانہ درد ناصر خلیق ہی نے طبع کرایا تھا۔ کوچہ چیلان میں بارہ دری خواجہ میر درد میں اپنے آبائی مکان میں قیام تھا اور وہیں مطب کرتے تھے۔

حکیم غلام کبریا خاں

---

[1] میخانہ درد ص ۲۳۱

[2] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۱۸۹ تا ۱۹۲

نہایت ممتاز ذہین اور دانشور طبیب تھے۔ مطب بہت کامیاب تھا[۱] حکیم غلام رضا خاں اور حکیم اجمل خاں سے تعلیم پائی تھی۔ طبیہ کالج دہلی میں پروفیسر رہے ان کی فنی قابلیت کی وجہ سے نواب رامپور نے اپنا طبیب خاص مقرر کیا تھا۔

حکیم غلام کبریا خاں جو بھورے میاں کے نام سے مشہور تھے۔ حکیم اجمل خاں کے بعد آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کے صدر مقرر ہوئے اور تاحیات صدر رہے۔ بڑے دواخانہ کے نام سے انہوں نے ایک دواخانہ قائم کیا تھا جو اس زمانہ میں بہت مشہور ہوا، اور اس کی دواؤں نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ۱۹ مئی ۱۹۲۵ء کو یکایک حرکت قلب بند ہونے کے سبب انتقال ہوا۔ حکیم محمود سعید خاں اور حکیم حامد سعید خاں دو بیٹے تھے[۲]

حکیم غلام کبریا خاں دہلی کے رؤسا میں تھے۔ امیرانہ شان سے رہتے تھے، آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ خزانہ جاوید جلد سوم میں ان کی تقریظ مرقومہ ۲۴ فروری ۱۹۱۵ء ان القاب کے ساتھ نقل ہے۔ "تقریظ چکیدہ کلک جواہر سلک فضیلت مآب کمالات انتساب، جامع صفات صوری ومعنوی فخر اطبائے ہندوستان حاذق زمان تنقیبقی حکیم غلام کبریا خاں صاحب"

حکیم عبدالوہاب انصاری

یوسف پور ضلع غازیپور کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اور ان کے دونوں بھائیوں حکیم عبدالرزاق انصاری اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے بڑی شہرت پائی۔ تحریک آزادی میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ حکیم عبدالوہاب دارالعلوم دیوبند کے

---

[۱] حکیم اجمل خاں ص ۲۰۶

[۲] رموز حکمت ص ۴۷، تذکرۃ الخواجگان ص ۱۱۷

طالب علم تھے۔ دوران تعلیم چیچک میں مبتلا ہوئے اور بینائی جاتی رہی۔ لیکن اس کے باوجود پھر دارالعلوم واپس آئے اور درسیات کی تکمیل کی۔ ان کے اساتذہ میں مولانا ذوالفقار علی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری تھے[۱] طب کی تعلیم حکیم محمود خاں سے حاصل کی تھی۔

حکیم عبدالوہاب جو حکیم نابینا کے نام سے مشہور ہوئے طب کے نامور معالجین میں تھے۔ نبض کے معائنہ میں امتیاز حاصل تھا۔ حیدرآباد اور دہلی میں ان کی طبابت کا ڈنکا بجا ہے۔ حیدرآباد میں میر محبوب علی خاں نظام دکن کے معالج رہے اور صدر الاطبا کے منصب پر فائز ہوئے۔ میر عثمان علی خاں سے بگاڑ کے بعد شولاپور گئے وہاں کچھ عرصہ مطب کیا۔ پھر بمبئی میں قیام کے بعد دہلی منتقل ہوئے۔ پہلے جامع مسجد کے قریب اور آخر میں بلی ماران میں مطب شروع کیا، لیکن پھر دوبارہ صدرالاطبا کے منصب پر تقرر عمل میں آیا۔ اشرف صبوحی نے کہا تھا ؎

پل میں سچا ہوگیا چشم نابینا کا خواب

حیدرآباد سے سبکدوش ہونے کے بعد پھر دہلی میں مطب و معالجہ کا سلسلہ رہا۔ تمام عمر جو عہ رہنا تھا ان کے کامیاب مطب سے دہلی کے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا کناٹ پیلس میں ذاتی مکان میں رہائش تھی وہیں ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء کو انتقال ہوا۔[۲] حسب وصیت نعش گنگوہ لے جائی گئی اور اپنے مرشد مولانا رشید احمد گنگوہی کے مزار کے قریب مدفون ہوئے۔ حکیم نابینا تینوں بھائیوں میں بڑے تھے اور تینوں کو مولانا گنگوہی سے نہایت گہرا تعلق تھا، حکیم صاحب حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ انتقال سے قبل ایک لاکھ روپیہ کی جائداد طبی و دینی مدرسوں کے لیے وقف کی تھی۔[۳]

---

[۱] اسرار شربانیہ دیباچہ ص ۲

[۲] نزہتہ الخواطر جلد ۸ ص ۳۱۸

[۳] رموز حکمت ص ۱۷

ان کی تصنیف "اسرار شریانیہ مع مجربات انصاریہ" نبض اور طبی مجربات کے سلسلے کی عمدہ کتاب ہے یہ محبوب المطابع دہلی سے ان کے بیٹے حکیم عبدالحی انصاری کے زیر اہتمام ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء کو چھپی ہے۔ حکیم عبدالحی کا بھی دہلی کے کامیاب طبیبوں میں شمار تھا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی چھپوایا تھا۔

حکیم عبدالرزاق

حکیم عبدالرزاق حکیم نابینا کے منجھلے بھائی تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی۔ اور طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ حیدرآباد اور دہلی میں برسوں مطب کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے دست شفا سے نوازا تھا۔ یہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے مرید خاص تھے۔ چھوٹے بھائی ڈاکٹر مختار احمد انصاری بھی ان سے بیعت تھے مولانا گنگوہی کے علاوہ تینوں بھائی شیخ الہند سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے شیخ الہند کو حجاز بھجوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سفر کی جملہ ضروریات مہیا کیں اور ہر قسم کی امداد کی۔ تحریک شیخ الہند اور سفرنامہ اسیر مالٹا میں اس کی تفصیل ہے۔[1]

مولانا حسین احمد مدنی نے حکیم عبدالرزاق کے بارے میں لکھا ہے "دیوبند بہت زیادہ آمد و رفت رکھتے تھے۔ اور جب بھی جاتے کئی کئی روز ٹھہرتے تھے۔ شیخ الہند اور ان کے ساتھیوں کے حجاز کے ٹکٹ وغیرہ کا انتظام ڈاکٹر انصاری نے اپنے خرچ سے کیا۔ حکیم عبدالرزاق بمبئی تک ساتھ گئے اور جملہ امور روانگی کا انتظام کیا۔ اور مصارف حجاز کے لیے نقد عطا کیا۔ اور اس خیال سے کہ حجاز میں گرانی شدید ہے اور وہ رقم ختم ہوگئی ہوگی۔ آیندہ سال حضرت شیخ الہند کے بھانجہ اور داماد

---

[1] الواح الصنادید ص ۲۴۳

قاضی مسعود احمد کو ایک ہزار روپیہ دے کر اپنے خرچ سے جہاز روانہ کیا۔ اسی طرح گھر کے مصارف کی کفالت کے لیے ماہانہ بھیجتے رہے۔ حکومت نے انہیں بلایا اور مالی مدد کا الزام لگایا، انہوں نے کہا کہ وہ ہمارے مرشد ہیں۔ انہوں نے اقرار کیا اور کہا کہ جو سزا دی جائے میں حاضر ہوں[1]

حکیم عبدالرزاق نے دہلی میں وفات پائی اور قبرستان مہندیان میں دفن ہوئے چھوٹے بھائی ڈاکٹر مختار احمد انصاری (پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۸۸۰ء وفات مئی ۱۹۳۶ء) انڈین نیشنل کانگریس کے صدر رہے اور تحریک آزادی میں زبردست کردار ادا کیا، ان کی کوٹھی دارالسلام دریا گنج، ملک کے چوٹی کے رہنماؤں کا مرکز تھی، گاندھی جی موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، حکیم اجمل خاں، علی برادران، مولانا آزاد سب جمع ہوتے تھے۔

حکیم جمیل الدین

حکیم جمیل الدین نگینہ ضلع بجنور کے ایک زمیندار عالم دین اور خدا ترس بزرگ مولوی محمد الدین کے گھر پیدا ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند سے حصول علم کے بعد دہلی آئے۔ اور حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں کے حلقہ درس میں شریک ہو کر امتیاز پیدا کیا، حکیم جمیل الدین کو شروع سے درس و تدریس کا شوق رہا۔ حکیم عبدالمجید خاں نے شریف منزل میں مدتوں سے جاری درس کے سلسلہ کو منظم کرنے کے لیے ۱۸۸۳ء میں اسے ایک مدرسہ کی شکل دی۔ اس میں خاندان کے دوسرے اراکین کے علاوہ حکیم جمیل الدین بھی درس دیتے تھے۔ پھر ۱۸۸۸ء میں حکیم عبدالمجید خاں نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں اور حکیم جمیل الدین کے تعاون سے باقاعدہ مدرسہ طبیہ کے قیام کا منصوبہ بنایا جس کا ۲۳ جون ۱۸۸۹ کو افتتاح ہوا[2]۔ حکیم صاحب

---

[1] نقش حیات جلد ا ص ۱۹۹ و ۲۰۰ [2] لیکچروں کا مجموعہ جلد ا ص ۱۷۵

طبیہ کالج بننے پر اس کے اولین صدر ممتحن رہے۔ حکیم جمیل الدین کے لیے یہ شرف کی بات ہے کہ وہ طب میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں سے استفادہ ہیں۔ حکیم صاحب نے ۱۹۱۰ء میں بیری والا باغ پل بنگش میں اپنا ذاتی مطب شروع کیا۔ اور ۱۹۱۴ء میں صدیقی دواخانہ کے نام سے پل بنگش ہی میں ایک دواخانہ کی بنیاد رکھی، اور درس کے ساتھ معالجہ کے ذریعہ لوگوں کو فیض پہنچایا۔

حکیم صاحب پرانی وضع کے سادہ مزاج صوفی منش بزرگ تھے، خدمت خلق کا بہت جذبہ تھا۔ ۱۹۲۰ سے ۱۹۳۶ تک دارالعلوم دیوبند کی مجلس عاملہ اور شوریٰ کے رکن رہے۔ ان کے بعد دارالعلوم کے ارباب حل وعقد نے ان کے برادر خرد حکیم محمد یٰسین کو رکن منتخب کیا جو ۱۹۵۲ تک فرائض رکنیت ادا کرتے رہے۔ حکیم جمیل الدین کو ۱۹۲۴ میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی، اور ۱۴ مئی ۱۹۳۶ کو بعد نماز تہجد رب حقیقی سے جا ملے۔ وصیت کے مطابق پرانی سبزی منڈی (حال کملا نہرو پارک) کے قریب گور غریباں میں تدفین ہوئی۔ حکیم محمد اسمٰعیل اور حکیم عبدالجلیل دو بیٹے تھے۔

حکیم آزاد انصاری

ابوالاحسان حکیم الطاف احمد آزاد انصاری کا اصل وطن سہارنپور تھا، صحیح النسب انصاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۲ اکتوبر ۱۸۷۱ء ۲۷ رجب ۱۲۸۸ھ کو ناگپور میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ طب کی تعلیم حکیم نور احمد سہارنپوری مولانا حکیم معین الدین نانوتوی اور ڈاکٹر احمد خاں لکھنوی سے حاصل کی۔ ۱۹۰۰ء میں دہرہ دون میں مطب کھولا۔ ۱۹۰۲ سے ۱۹۰۹ تک کانپور میں مطب کیا۔ اس کے بعد آٹھ برس سہارنپور میں مطب جاری رکھا۔ ۱۹۱۹ء میں علی گڑھ پہنچے۔ اور ڈیڑھ برس مطب کر کے ۱۹۲۳ء میں دہلی آئے دہلی میں بھی مطب شروع کیا۔

وہاں سے ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۳ کو حیدر آباد منتقل ہوئے[1] لیکن وہ کہیں بھی کامیاب نہیں رہے۔

شاعری میں حالی اور بیدل سے تلمذ تھا۔ پہلے عطار دتخلص تھا۔ بعد میں آزاد اختیار کیا، قادر الکلام اور زود گو تھے، معارف جمیل ان کے کلام کا مجموعہ ہے یہ ۱۹۳۴ء میں طبع ہوا ہے۔ اس میں انہیں فانی ہند لکھا ہے، آزاد انصاری حیدر آباد میں منتقل نہیں رہ سکے ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا، دونوں جگہ آمد و رفت کا سلسلہ رہتا تھا۔ حیدر آباد میں ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔

دہلی کے ادبی حلقوں میں ان کی شخصیت نمایاں تھی۔ سیماب اکبر آبادی، مولانا ظفر تاباںؔ اور حیدر دہلوی سے استفادہ کا موقع ملا تھا۔ عرض مصنف کے عنوان سے انہوں نے لکھا ہے "ان حضرات کے گراں قدر مشوروں نے میری معلومات شعری میں واضح اور نمایاں اضافہ کیا ہے[2]"

حکیم آزاد انصاری کے اقتصادی حالات آخر عمر میں اچھے نہیں رہے تھے، بڑھاپے اور بیماری میں ان کا کوئی پرسان حال نہیں رہا تھا۔ دہلی میں کبھی کسی کے ہاں جا رہتے۔ جوش ملیح آبادی کے دوران قیام دہلی میں ان کے ہاں بھی رہے۔ میزبان ان کے ہنر کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ اس کے بعد ان سے شعر کہلوا کر اپنی بیاض بھرتا جب وہ شعر دینے میں پس و پیش کرتے تو میزبان آپ اپنے لگتا۔ حکیم صاحب اس بے غوری اور ناقدری کو تاڑ جاتے اور کسی اور شاگرد یا قدرداں کے ہاں اٹھ جاتے ایک صاحب کا تو پورا دیوان آزاد انصاری ہی کا کہا ہوا ہے۔[3]

حکیم محمد امین الدین

حکیم محمد امین الدین کلب علی خاں کے صاحبزادہ اور شاہ آباد ضلع رامپور کے

---

[1] دیباچہ معارف جمیل ص ۱۲ و ۱۳ [2] بزم بےتکلفی دہلی ص ۱۱۶

[3] گنجینہ گوہر ص ۱۸۲

رہنے والے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ درس نظامیہ کی تکمیل مولانا سید احمد حسن محدث امروہوی سے کی، اور انہی سے طبی نصاب ختم کیا۔ حکیم عبدالسلام امروہوی کے مطب میں تشخیص و نسخہ نویسی کی مشق بہم پہنچائی۔ مدرسہ اسلامیہ امروہہ میں تعلیم حاصل کی تھی، وہیں استاد مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں امروہہ کے مدرسہ سے جتنے طالب علم مدرسہ طبیہ دہلی آئے وہ سب حکیم محمد امین الدین کے شاگرد اور منطق و فلسفہ میں اعلیٰ لیاقت رکھتے تھے۔ مولوی حکیم عبدالرشید خاں پرنسپل مدرسہ طبیہ جو خود بہت قابل اور فاضل تھے، منطق و فلسفہ میں لیاقت رکھنے والے طلبہ کو بہت پسند کرتے تھے، اسی لیے امروہہ کے طلبہ کی مدرسہ طبیہ میں بڑی اہمیت رہی اور ۲۲ برس تک حکیم اجمل خاں کے طبیب بیتی کے عہدہ پر امروہہ کے اطبا مقرر ہوتے رہے۔ چنانچہ سب سے پہلے حکیم منتجاب حسن پھر حکیم مقصود احمد پھر حکیم رشید احمد (شفاء الملک) اور پھر حکیم ذکی احمد طبیب بیتی ہوئے۔ اور اس کے بعد نگینہ کے حکیم نذر احمد کا نمبر آیا۔

حکیم محمد امین الدین مدرسہ طبیہ دہلی میں استاد مقرر ہوئے۔ فارسی میں یکتا تھے، عربی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ طب کی کتابوں کا عربی میں درس دیتے تھے، انتظامی صلاحیت میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ مدرسہ طبیہ میں داخلہ کے انٹرویو اور دوسرے انتظامی معاملات ان سے متعلق تھے۔ حکیم صاحب نے زندگی بھر آمدنی کے لیے مطب نہیں کیا وہ اسے گناہ سمجھتے تھے، ان کے صاحبزادہ حکیم محمد مبین نے بھی مطب کو آمدنی کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ دونوں نے کبھی قیمتی نسخہ لکھا۔

حکیم صاحب نے طلبہ کے درسی افادہ کے لیے کلیات نفیسی کا اردو ترجمہ کیا جو ۱۹۲۴ء ۱۳۴۲ھ میں دہلی پرنٹنگ ورکس سے دو جلدوں میں طبع ہوا ہے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۳ کو تقریبا ۶۸ برس کی عمر میں دہلی میں سفر آخرت اختیار کیا۔

ان کے صاحبزادہ حکیم محمد مبین (پیدائش ۲۴ دسمبر ۱۹۰۴ء وفات ۱۹۶۵ء) نے ۱۹۲۲ء میں جب کہ مدرسہ طبیہ نے طبیہ کالج کی شکل اختیار کر لی تھی، عربی کی سند حاصل کی۔ اس طرح وہ طبیہ کالج کے پہلے بیچ سے تعلق رکھتے تھے، ۱۹۲۲ء کے بعد ہی مسیح الملک

کے بینشی کے اسٹاف میں آگئے، اس خاندان سے ان کی وابستگی کچھ اس طرح قایم رہی کہ اجمل خاں کی وفات کے بعد وہ حکیم محمد احمد خاں، حکیم ظفر احمد خاں اور حکیم محمد جمیل خاں کے بھی ۱۹۴۷ تک طبیب بینشی رہے۔ ہندوستانی دواخانہ میں شام کو اپنا مستقل مطب کرتے تھے۔ خطوط کے جوابات اور تشخیص و تجویز کا کام بھی ان کے سپرد تھا۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۶۵ تک دواخانہ سے تعلق قایم رہا۔ حکیم صاحب مطب کے علاوہ درس و تدریس میں مشغول رہے۔ انہوں نے طبیہ کالج میں تدریسی فرایض انجام دیئے۔ ۱۹۴۸ سے ۱۹۶۴ تک جامعہ طبیہ دہلی میں استاد رہے، معالجات اور نفسی کا درس ان سے متعلق تھا۔ ان کے بیٹے حکیم معین الدین (ولادت ۱۲ دسمبر ۱۹۳۳ء) نے ۱۹۵۵ء میں جامعہ طبیہ دہلی سے اکمل الحکما کی سند حاصل کی ہے، ہمدرم دواخانہ سے متعلق رہے۔ مطب کا سلسلہ ہے۔[1]

حکیم امجد علی خاں

دہلی کے قدیم اطبا کی یادگار تھے۔ ان کے والد حکیم محمد علی خاں کا [illegible] سرکردہ طبیبوں میں تھا، ان کے دادا حکیم غلام رسول ویراں بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ دیوان ذوق حکیم حافظ غلام رسول ویراں نے اپنی یادداشت سے لکھوایا [illegible] ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء میں انتقال کیا۔

حکیم امجد علی خاں کا دہلی میں کامیاب مطب تھا۔ رؤسا کے علاوہ [illegible] دست شفا سے مستفید ہوتے تھے۔ دہلی سے باہر دور کے والیان [illegible] کی غرض سے بلاتے تھے، عوام کا بڑا مرجوعہ رہتا تھا۔[2]

---

[1] قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین ص ۴۰۲ تا ۴۰۳

[2] رموز حکمت ص ۱۲

انجمن طبیہ کے رکن تھے۔ طبی تحریک سے دلچسپی لیتے تھے۔ حکیم اجمل خاں سے بڑا تعلق تھا۔ ان کی ہم نشینی رہتی تھی۔ آنر. بری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر تھے، اپنی نیک نفسی اور خلق کی وجہ سے مشاہیر شہر میں شمار تھا۔

۱۹۰۵ء میں حکیم اجمل خاں کے ساتھ یہ بھی عراق گئے تھے۔ سید حامد (برادر شمس العلما مولوی سید احمد امام جامع مسجد دہلی) بھی ہمراہ تھے۔[1]

حکیم علی رضا خاں

ان کے والد حکیم علی احمد خاں دہلی کے ممتاز طبیب تھے۔ حکیم علی رضا خاں نے حفظ قرآن کے بعد مدرسہ حسین بخش اور مدرسہ فتح پوری سے عربی و فارسی کی تکمیل کی۔ طب کی تعلیم مدرسہ طبیہ میں حاصل کی۔ جہاں چار برس تک شریف خانی اطبا سے استفادہ کا موقع ملا۔ حکیم عبدالرشید خاں رامپوری سے نفیسی شرح اسباب اور حکیم واصل خاں سے قانون ابن سینا پڑھا تھا۔

کوچہ چیلان میں ان کا مطب دہلی کے چیدہ اور بڑے مطبوں میں گنا جاتا تھا۔ دہلی اور بیرون جات کے بے شمار مریض آتے تھے۔ حامی الصحت کے نام سے ایک دواخانہ قایم کیا تھا، حامی الصحت کے نام سے ایک رسالہ بھی ان کی ادارت میں نکلتا تھا، صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ خلیق متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ ان کے صاحبزادہ حکیم احمد حسن خاں کو کب بھی طب اور دوسرے خصائل حسنہ میں اپنے والد کا نمونہ تھے۔[2]

---

[1] حیات اجمل (رشید احمد) ص ۲۳

[2] رموز حکمت ص ۴۵

حکیم محمد احمد خاں

۱۶ رمضان ۱۳۰۲ھ/۳۰ جون ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔ شروع سے نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ ابتدائی درسی کتابیں دہلی میں پڑھیں۔ حکیم عبدالمجید خاں کی وفات کے بعد ۱۹۰۱ء میں حکیم اجمل خاں کے پاس رامپور گئے وہاں ۱۹۰۳ء تک عرب طبیب مکی سے عربی زبان و ادب میں استفادہ کیا، دہلی واپس ہوکر حکیم واصل خاں کے مطب میں بیٹھے۔ اور خاندانی نکات حاصل کئے۔ ۱۹۰۴ سے علاحدہ مطب اور مدرسہ طبیہ میں درس کا سلسلہ شروع کیا۔ اور دہلی میں مسیح الملک ثانی کے لقب سے مشہور ہوئے۔

۱۹۰۷ء میں حج کے لیے گئے اور ۱۹۲۳ء میں عراق کا سفر کیا، اور مقامات مقدسہ کی زیارت کی بغداد میں بھی ان کے مطب کا سلسلہ رہا۔ اور لوگ اپنے مرض کے رفیعہ کے لیے برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔

حکیم اجمل خاں کی وفات کے بعد ان کے کاموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ حکیم محمد احمد خاں کو خاندانی مسند طبابت پر بٹھایا گیا، طبیہ کالج اور ہندوستانی دواخانہ کا انتظام حکیم محمد جمیل خاں کے سپرد کیا گیا اور طبی کانفرنس کی ذمہ داری حکیم غلام کبریا خاں کے حوالہ کی گئی۔ حکیم جمیل خاں کے خلاف جب اسٹرائک ہوئی تو بورڈ آف ٹرسٹیز کی سکریٹری شپ سے انہوں نے استعفیٰ دیا۔ اور ان کی جگہ حکیم محمد احمد خاں سکریٹری مقرر ہوئے[1]

حکیم محمد احمد خاں نے کالج اور دواخانہ میں ضروری اصلاحات کیں، حکیم ظفر احمد خاں کو پرنسپل مقرر کیا۔ پھر حکیم غلام کبریا خاں کو سکریٹری شپ کا چارج دے کر یورپ چلے گئے۔ ان کی روانگی کے بعد خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے حکیم ظفر احمد خاں نے استعفیٰ

---

[1] تذکرۂ الخواجگان ص ۱۰۹

دے دیا۔ حکیم محمد احمد خاں کی یورپ سے واپسی کے بعد طبیہ کالج اور ہندوستانی دواخانہ میں باہمی اختلافات کے سبب اسٹرائک ہوئی اور بڑا ہنگامہ ہوا۔ حکیم محمد احمد خاں نے اس پر قابو پایا اور دوبارہ یورپ کا سفر کیا۔ چھ ماہ بعد واپسی ہوئی۔ یورپ کے سفر میں جو تجربات حاصل ہوئے تھے ان کے پیش نظر کالج میں اصلاحات کیں۔ ہندوستانی دواخانہ کی ترقی پر توجہ کی۔ مولانا عبد اللہ کو دواخانہ کا منیجر بنایا حکیم غلام کبریا خاں کے انتقال کے بعد ۱۹۳۵ء میں حکیم محمد احمد خاں کو کانفرنس کی صدارت تفویض کی گئی۔ اس طرح وہ تینوں اداروں کی سرپرست قرار پائے۔ بعد میں مصالحت ہونے پر حکیم جمیل خاں طبیہ کالج کے سکریٹری ہوتے تو حکیم محمد احمد خاں ان کے معاون رہے۔

حکیم محمد احمد خاں کا مطب بہت کامیاب تھا۔ دور دور سے مریض علاج کے لیے آتے تھے۔ ان کی کتاب مطب عملی سے ان کی فنی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ۱۷ نومبر ۱۹۳۷ کو انتقال ہوا۔ حکیم محمود احمد خاں اور حکیم مجید احمد خاں دو فرزند تھے[۱]

حکیم مرزا محمد نعیم بیگ

حکیم مرزا عبد الکریم بیگ کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ددھیالی بزرگوں کا تعلق طب سے تھا اور تقریباً چودہ پشت سے ان کے خاندان میں طب چلی آرہی تھی۔ ننھیال کے لوگ فوج سے وابستہ تھے۔ حکیم صاحب کے والد عبد الکریم بیگ ریاست پالی سے وابستگی سے پہلے شاہی طبیب تھے، پالی میں طبابت کے علاوہ ریاست کے اعلیٰ عہدہ پر فائز رہے۔ آخری زمانہ میں ان کا قیام انبالہ میں تھا، وہیں وفات پائی۔

---

[۱] حکیم اجمل خاں ص ۲۰۳

حکیم مرزا نعیم بیگ اوائل عمری میں والد کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد والدہ کے ہمراہ دہلی منتقل ہوئے جہاں خاندان کے دیگر افراد موجود تھے۔ معاشی خوش حالی کی وجہ سے ان کی تعلیم میں کوئی دقت نہیں پیش آئی۔ انہوں نے عربی فارسی اور مروجہ علوم انگریزی ریاضی کے بعد طب کی تعلیم حاصل کی۔ فارسی کے جید عالم تھے اور طب میں مرتبہ کمال رکھتے تھے۔ تکمیل طب کے بعد جڑی بوٹیوں پر تحقیقی کام شروع کیا۔ اس سلسلہ میں شملہ، پنجاب کے مختلف شہروں اور صوبہ سرحد کے جنگلوں میں برسوں رہ کر تجربات کئے۔ اس دوران ہوسی کا شوق ہوا، کیمیاگری کے تعلق سے بھی تجربات کرتے رہے، کیمیا تو نہیں بنا سکے، لیکن ان کے بقول تجربات کی منزلوں سے گزرنے کے دوران سونے سے زیادہ قیمتی دوا دریافت ہوئی جس کے ذریعہ بہت سے لاعلاج مریض تندرست ہوتے۔

حکیم صاحب کو علاج میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ دہلی میں اس زمانہ میں بڑے حاذق طبیب موجود تھے سب کو ان کی تشخیص کا اعتراف تھا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں انہیں بہت پسند کرتے تھے اور محبت سے نواب کہا کرتے تھے۔ پیچیدہ امراض کے علاج سے بہت دلچسپی تھی۔ انہیں ایک چیلنج کے طور پر لیتے تھے، ان کی صاحبزادی طاہرہ بیگم کا بیان ہے کہ آخری عمر تک وہ اپنے مریضوں کے کیس اس طرح تیار کرتے تھے، جیسے انہیں اس کا امتحان دینا ہے، اکثر مریض دوسرے معالجین سے مایوسی کے بعد ان کے پاس آتے اور شفایاب ہو کر جاتے، ان کے مطب میں مریضوں کی بھیڑ رہتی تھی، اور وہ اپنے زمانہ کی دہلی کے مصروف ترین طبیبوں میں تھے۔

ان کا کتب خانہ طب کی نادر و نایاب کتابوں پر مشتمل تھا، اس میں تاریخ، فلسفہ ادب، اسلامیات اور دوسرے علوم کی قیمتی کتابیں بھی کثیر تعداد میں موجود تھیں۔ یہ کتابیں ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں، مطب اور دوسری مصروفیات کے باوجود وہ روزانہ پابندی سے کتب بینی کے لیے وقت نکالتے تھے، مسیح الملک حکی

اجمل خاں نے انہیں طبیہ کالج میں پڑھانے کی دعوت دی تھی، جسے انہوں نے قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ میں اپنے پیشہ میں پابندی گوارا نہیں کر سکتا، حج بیت اللہ کے موقع پر جب وہ سعودی عرب میں تھے تو شاہ ابن سعود نے ان کی تعریف سن کر اپنی بیگم کے علاج کے لیے بلایا اور بے حد تکریم سے پیش آئے، انہیں شاہی طبیب بھی مقرر کرنا چاہا، انہوں نے کہا کہ میں وطن ہی میں رہ کر لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

حکیم صاحب صبح سے ایک بجے تک مطب کرتے تھے۔ شام کو مطب میں دوستوں کا مجمع رہتا تھا۔ دعوتوں اور مجلسوں کا سلسلہ چلتا، گانے کی محفلیں منعقد ہوتیں شطرنج کے مقابلے ہوتے، محلہ کے لوگوں کے دکھ سکھ سنے جاتے، باہمی جھگڑے طے پاتے۔ ایک زمانہ میں اسپیشل پولس آفیسر کے اختیارات بھی انہیں حاصل تھے ہر ماہ کی گیارہ اور اٹھارہ تاریخ موسیقی کی محفل کے لیے مقرر تھی۔ مشہور قوال اور موسیقار شرکت کرتے تھے۔ موسیقی سے لگاؤ کا یہ حال تھا کہ ایک موسیقار مستقل ملازم رکھا ہوا تھا جو انہیں موسیقی سے جگاتا، اور رات کو موسیقی سنا کر سلاتا تھا۔ وہ خود موسیقی اور شطرنج کے ماہر تھے، کشتی اور ورزش کا سلسلہ رہتا تھا، بنوٹ میں مہارت تھی۔ شکار کے بھی بے حد شوقین تھے۔ مچھلی کے شکار کے علاوہ وہ بندوق سے بھی شکار کرتے تھے۔ مریضوں کو ان کی سب جگہیں معلوم تھیں، جنگل یا پانی کے کنارے جہاں وہ موجود ہوتے۔ بعض وقت وہاں بھی مریض پہنچ جاتے تھے۔

حکیم صاحب نہایت بامذاق، بیدار مغز اور زیرک انسان تھے۔ بہت خوش گفتار اور مجالس کی جان۔ وسیع القلبی، انکساری اور رواداری کے ساتھ مزاج میں غصہ بھی تھا، بڑے خدا ترس اور صاف دل تھے۔ کبھی تنہا کھانا نہیں کھایا، ہمیشہ لوگ مدعو رہتے تھے۔ قرض حسنہ دے کر لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے اور خاموشی سے صدقات اور زکوٰۃ نکالتے تھے۔ بزرگوں کے عقیدت مند اور نذر نیاز کے قایل تھے، کلیر اور اجمیر کے آستانوں پر حاضری معمول میں شامل

تھی۔ نظام الدین اولیا کے عرس کے موقع پر زائرین کے لیے پانی کی سبیل اور لنگر کا انتظام کرتے تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ رمضان کے علاوہ بھی نفلی روزے رکھتے تھے۔ ۲۰۔ ۱۹۳۱ میں جب ادا ئیگی حج کے لیے گئے تو انہیں امیر الحج بنایا گیا تھا۔ (بحوالہ پاکیزہ سلطانہ بیگم) جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ تحریک عدم تعاون میں شریک ہوکر گھر کا انگریزی سامان جلا یا اور کھدر کا استعمال شروع کیا۔ تقسیم ملک کے بعد نقل مکانی نہیں کی اور ہر حالت میں اپنے وطن میں رہ کر عوام کی خدمت میں مصروف رہے۔ ان کے زمانہ میں کوچہ چیلان بڑی محب وطن اور متقدر شخصیتوں سے آباد تھا، بیرسٹر آصف علی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید اور دوسرے بہت سے اصحاب، ان سب سے ان کے گہرے مراسم تھے۔

حکیم صاحب بہت وجیہہ اور جامہ زیب انسان تھے۔ گورا رنگ، چمکدار ذہین آنکھیں، تقریباً چھ فٹ کا قد، لباس بہت نفیس پہنتے تھے۔ کبھی بنارسی کپڑے کی شیروانی، بنارسی صافہ، کامدار جوتا، چوڑی دار پاجامہ اور ہاتھ میں قیمتی چھڑی۔ کبھی بنارسی ویسٹ کوٹ جس کی جیب میں خوبصورت گھڑی لٹکتی ہوتی۔ کھادی شروع کرنے کے بعد عمدہ کھادی کے سفید پاجامے قمیص اور شیروانیاں سلوائیں اور باریک کھادی کا صافہ استعمال کیا۔ اس لباس میں بھی بہت شاندار لگتے تھے، نفاست اس درجہ تھی کہ دن میں کئی مرتبہ کپڑے بدلتے تھے، جتنی مرتبہ گھر سے باہر جاتے کپڑے بدل کر جاتے، کبھی کبھی ترکی ٹوپی بھی پہنتے تھے۔

ان کی شادی خاندان شاہی میں ہوئی تھی۔ بیگم بہادر شاہ ظفر کی پڑپوتی، مرزا فتح الملک کی پوتی اور مرزا فرخندہ جمال کی بیٹی تھیں حکیم صاحب کا انتقال ۶۸ برس کی عمر میں ۱۹۴۸ء میں اور بیگم کا انتقال ۱۹۹۳ء میں ہوا، دونوں نظام الدین میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہیں، دو صاحبزادیاں طاہرہ بیگم زوجہ سجاد حسن لندن اور پاکیزہ سلطانہ بیگم زوجہ بیرسٹر دانیال لطیفی ان کی یادگار ہیں۔ چھتہ آغا جان کے سامنے کی گلی جس میں وہ رہائش پذیر تھے "گلی حکیم نعیم بیگ" کے نام سے

موسوم ہے۔

حکیم ترلوک ناتھ اعظم

حکیم ترلوک ناتھ اعظم جلال آبادی ۱۴ فروری ۱۸۹۷ کو پیدا ہوئے۔ حکیم حاذق اور عمدۃ الحکما کی طبی سندیں حاصل کیں۔ مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ تقسیم ملک سے پہلے دہلی میں قیام تھا۔ مذہبی لٹریچر اور روحانیت سے شغف رہا محض ادبی ذوق کی تسکین کے لیے فکر سخن بھی کرتے تھے۔ ماہنامہ دستگیر کو ان کی سرپرستی کا شرف حاصل رہا۔ یہ ماہنامہ ۱۹۴۵ سے ۱۹۴۷ تک طالب دہلوی کی ادارت میں نکلتا تھا طالب دہلوی نے لکھا ہے کہ جب بھی حکیم صاحب کے درشن ہو جاتے تھے تو بے ساختہ اس حقیقت کا اعتراف کرتا تھا کہ فی الواقع ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں[1] کلام اعظم کے نام سے ان کا شعری مجموعہ طبع ہوا ہے۔

حکیم صاحب چند کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ڈرامہ سے خاص دلچسپی تھی، دس برس بورڈ آف آیورویدک اینڈ یونانی سسٹم آف میڈیسین کے ممبر رہے، بھوپندرا طبیہ کالج (پٹیالہ) دہلی کے پرنسپل کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیے تھے۔

حکیم عبدالجبار

ابو الوقار حکیم حافظ عبدالجبار کا تعلق کیانی مغلیہ خاندان سے ہے۔ ان کے والد حکیم مولوی عبدالسلام دہلی کے اچھے طبیب تھے۔ اور ان کے دادا حکیم مولوی مرزا جان شاہی زمانہ میں ارکین سلطنت میں شمار کیے جاتے تھے۔

---

[1] بہ تخمی دہلی ص ۱۹۹

مولوی ظفر علی اور دہلی کے دوسرے علماء سے درسی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد مدرسہ طبیہ دہلی میں داخل ہوئے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں سے فخر شاگردی تھا۔ دہلی کے کامیاب طبیبوں میں تھے۔[1]

حکیم محمد اسمٰعیل سرور

حکیم محمد اسمٰعیل خلف حافظ عبداللہ دہلوی نے ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں مدرسہ طبیہ دہلی سے طب کی سند حاصل کی۔ تعلیم طب کے بعد فن سخن کی جانب متوجہ ہوئے اور سید نذیر حسین فتنہ عباسی سندیلوی کی شاگردی اختیار کی۔ خوشگوار شیریں زبان شاعر تھے۔ زبان شستہ اور بندش چست ہوتی تھی۔ ریاست لوہارو میں بصیغہ طبابت ملازم رہے۔ بعد میں ریاست نرسنگھ گڑھ میں طبیب خاص کے عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ خلیق، متواضع اور ملنسار تھے۔[2]

حکیم محمد ظفر احمد خاں

تاریخی نام ظفر حسن ہے۔ ۱۰ ربیع الاول ۱۳۰۸ھ ۱۲ جون ۱۸۹۰ء بروز دوشنبہ پیدا ہوئے۔ عربی فارسی درسی کتابیں مولانا عبداللہ پنجابی اور مولانا عبداللہ رامپوری سے پڑھیں۔ طب کی ابتدائی تعلیم حکیم محمد احمد خاں سے حاصل کی اس کے بعد کچھ کتابیں حکیم واصل خاں اور حکیم اجمل خاں سے پڑھیں۔ ان کے ماموں حکیم غلام رضا خاں سے بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ حکیم اجمل خاں نے پانچ برس متواتر اپنی نگرانی میں رکھا

---

[1] رموز الاطبا جلد ۱ ص ۵۹۳

[2] خمخانہ جاوید جلد ۴ ص ۱۰۹

اور مطب کرایا۔ اس کے بعد ۲۵ مارچ ۱۹۱۴ سے علاحدہ مطب کی اجازت دی۔ حکیم اجمل خاں کی غیر حاضری میں ان کی جگہ مطب کرتے تھے۔ وہ جب انگلستان گئے تو ان کے زیر علاج ریاست گونڈل کے رئیس کے علاج کے لیے حکیم ظفر احمد خاں کو ہی روانہ کیا گیا۔ اس کے کامیاب علاج سے کاٹھیاواڑ اور بمبئی کے علاقہ میں بحیثیت معالج ان کی بڑی شہرت ہوئی۔ چنانچہ مطب کی ایک شاخ بمبئی میں قائم کی۔ چھ ماہ دہلی میں مطب کرتے تھے اور چھ ماہ بمبئی میں۔ یہ سلسلہ تین برس چلا۔ بعد میں دہلی ہی میں مطب کرنے لگے۔ ریاست خیرپور کے بھی مشیر طبی تھے۔ اور وقتاً فوقتاً وہاں جانا ہوتا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں جب حکیم محمد احمد خاں کا انتقال ہوا تو وہ خیرپور ہی میں تھے۔[1]

حکیم ظفر خاں دو مرتبہ طبیہ کالج دہلی کے پرنسپل مقرر ہوئے، انہوں نے وہاں علمی ریسرچ کا سلسلہ شروع کیا جس میں کالج کے اساتذہ شریک کئے گئے، ہر شخص کو کسی ایک عضو کی بیماری پر ہر ہفتہ مضمون لکھ کر پیش کرنا ہوتا تھا۔ حکیم صاحب نے مجلہ طبیہ بند ہونے کے بعد اجمل میگزین جاری کیا۔ دواخانہ ہند کے نام سے ایک دواخانہ قائم کیا تھا۔ فروری ۱۹۵۲ء میں وفات پائی۔ حکیم محمد شریف خاں اور حکیم بشیر احمد خاں دو فرزند یادگار رہے۔[2]

حکیم صاحب مذہبی آدمی تھے۔ ہر جمعرات کو بزرگوں کی فاتحہ کے لیے حسن رسول نما تشریف لے جاتے تھے۔ حکیم محمود خاں اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کا بھی یہی معمول تھا۔

حکیم طالب احمد

حکیم قلق کے صاحبزادہ تھے۔ میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں دہلی آئے

---

[1] تذکرۃ الخواجگان ص ۱۱۲

[2] حکیم اجمل خاں ص ۲۰۵

اور یہیں سکونت اختیار کی، شہزادہ ہائی اسکول دہلی میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد بی اے کیا ریلوے گارڈ ہوئے لیکن ملازمت سے دلچسپی نہیں پیدا ہوئی۔ طب کی تعلیم کا شوق ہوا اور حکیم علی رضا دہلوی سے طب کی درسی کتابیں پڑھیں، ۱۹۲۰ء میں حکیم علی رضا کے اصرار پر کوچہ چیلان میں قومی دواخانہ کے نام سے ایک دواخانہ قایم کیا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے دواخانہ کا افتتاح کیا تھا۔

حکیم طالب تحریک خلافت اور تحریک آزادی میں سرگرم رہے، قومی کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ دہلی کانگریس کمیٹی کے رکن تھے، کافی عرصہ تک کوچہ چیلان کانگریس کمیٹی کے صدر رہے اور کانگریس کے پروگراموں میں عملی حصہ لیا، علی گڑھ یونی ورسٹی کی تعمیر میں بھی انہوں نے کافی جدوجہد کی۔ ان کی ساری عمر طب، سیاست اور مذہبی کاموں میں گزری، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا سید احمد امام جامع مسجد، مولانا عبداللہ آٹے والے، بیرسٹر آصف علی مولوی شرف الحق، لالہ دیش بندھو گپتا، لالہ شنکر لال سے ان کے تعلقات تھے، ۱۹۱۸ء میں مولانا محمدی شاہ چشتی الہ آبادی کے مرید ہوئے۔ اس کے بعد خواجہ حسن نظامی سے بیعت کی۔ حزب البحر اور بسم اللہ وغیرہ کے عامل تھے۔

حکیم طالب ابتدائی عمر میں اپنے اعزہ کے ہمراہ بھوپال گئے تھے۔ نواب شاہ جہاں بیگم تک رسائی ہوئی۔ انہوں نے اپنی عزیزہ فاطمہ بی بنت واصل محمد خاں جاگیر دار بھوپال سے ان کی شادی کی، فاطمہ بی کو زندگی بھر ریاست بھوپال سے وظیفہ ملتا رہا جو انضمام ریاست ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔

حکیم طالب کے پانچ فرزندوں میں حکیم محبوب احمد اور حکیم منظور احمد کا تعلق طب سے تھا، حکیم محبوب احمد جامعہ طبیہ دہلی کے سند یافتہ تھے، حکیم عاقل خاں کے مطب سے وابستہ رہے اس کے بعد اپنا ذاتی دواخانہ قایم کیا۔ حکیم منظور احمد اپنے والد کے شاگرد تھے۔ جامعہ طبیہ سے سند حاصل کی اور اپنے والد کا قومی دواخانہ سنبھالا[1]

---

[1] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۲۹۴ و ۲۹۵

حکیم ناصر الدین خاں

شفاء الملک حکیم رضی الدین کے صاحبزادہ حکیم ناصر الدین خاں عرف چنو میاں خاندانی روایات کے ترجمان تھے۔ باشندگان دہلی کو نہ صرف اپنے لاجواب علاج معالجہ سے بلکہ اپنے بے نظیر اخلاق سے ممنون احسان فرماتے تھے۔ قومی کاموں سے ہمیشہ شغف رہا، ۱۹۱۸ء کے آخر میں جو کامیاب جلسے اردو کانفرنس کے دہلی میں ہوئے اس کے روح رواں تھے۔

بشیر الدین احمد نے لکھا ہے کہ یہ قدم بقدم اپنے والد ماجد اور جد امجد کے دہلی کے چوٹی کے طبیبوں میں تھے۔ ان کا مطب صبح سے شام تک مریضوں سے بھرا رہتا تھا۔ علاوہ شہر کے لوگوں کے دور دور سے مریض آتے تھے اور صحت پاکر واپس جاتے تھے[1] اپنے دولت خانہ شفا منزل ہی میں مطب کا سلسلہ تھا۔ اب یہ تمام عمارتیں ہمدرد دواخانہ کی ملکیت ہیں۔

حکیم صاحب بدایوں میں اسپیشل مجسٹریٹ رہے۔ اسلامیہ انٹر کالج بدایوں کے صدر مقرر ہوتے دہلی میں عرصہ تک آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر رہے۔ اس کے بعد نظام حیدر آباد کے طبیب خاص مقرر ہوئے، ۱۹۴۶ء میں حکومت ہند نے یونانی اور آیورویدک سے متعلق ایک کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جنوبی ہند اور ہندوستان کی مختلف جگہوں کا دورہ کر کے حکومت کو رپورٹ پیش کی، وہ دہلی طبیہ کالج کے بورڈ کے ممبر رہے، ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ راجندر پرساد کے اعزازی طبیب کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور تاحیات اس عہدہ پر رہے۔

---

[1] واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۳۰۶

۲۲ جون ۱۹۵۸ء کو فوت ہوئے اور وصیت کے مطابق درگاہ روشن چراغ میں دفن ہوئے[1] انتقال کے وقت عمر ۶۶ برس تھی۔ احسن اللہ فاروقی اور اجمل فاروقی دو صاحبزادے یادگار رہے۔

حکیم محمد اسمٰعیل

حکیم محمد اسمٰعیل ۲۴ جولائی ۱۹۰۷ کو پیدا ہوئے۔ گیارہ برس کی عمر میں حفظ قرآن کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور نمایاں حیثیت سے فراغت حاصل کی۔ والد ماجد حکیم جمیل الدین سے طبی کتابیں پڑھیں، اور والد کے قائم کردہ صدیقی دواخانہ میں مطب شروع کیا۔ حکیم صاحب کو غذاؤں اور پھلوں کے ذریعہ علاج پر ملکہ حاصل تھا۔ نادار مریضوں کا علاج طبی چٹکلوں اور بہت کم قیمت دواؤں سے کرتے تھے۔ طبیہ کالج قرول باغ میں عرصہ دراز تک بلا معاوضہ درس دیا۔ عربی سے ناواقف طلبہ کے لیے عربی کی ایک درسی کتاب لکھی تھی جو بہت عرصہ تک طبیہ کالج کے نصاب میں داخل رہی۔

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کے دست راست کے طور پر جنگ آزادی میں حصہ لیا اور ۱۹۴۷ کے پر آشوب دور میں دہلی میں مسلمانوں کی باز آبادکاری کے لیے بہت کام کیا، پاکستان سے آئے شرنارتھیوں کی آبادکاری میں بھی حصہ لیتے رہے ۱۹۴۶ سے ۱۹۵۲ تک جمعیۃ العلماء کے علاقہ صدر بازار کے صدر رہے۔ ۱۹۳۶ سے ۱۹۶۲ تک مادر درسگاہ دارالعلوم کی عاملہ اور شوریٰ کے رکن اور اسی زمانہ میں الجمعیۃ اخبار کے پرنٹر اور پبلشر رہے۔

حکیم صاحب بڑے دوست دار، بذلہ سنج شخصیت کے مالک اور عمدہ نثر نگار

---

[1] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۳۵۵ دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۱۱۶

اور شاعر تھے۔ افسوس ان کا شعری سرمایہ دستیاب نہیں، دو شعر نقل ہیں:-

نشاں کچھ ہیں دلِ ویراں میں باقی　　قیامت اس جگہ برپا رہی ہے

لبوں کو سی لیا ایسا کہ گویا　　دہن کا زخم اب منھ پر نہیں ہے

اپنے اجداد کے مانند پابند صوم و صلوٰۃ اور تہجد گزار تھے، ۲۱ ستمبر ۱۹۶۲ رحلت کی اپنی والدہ کے پائینتی قبرستان سیدی پورہ میں ابدی نیند سو رہے ہیں، ان کے بیٹے خالد صدیقی ذاکر حسین کالج میں ایڈمنسٹریٹو آفیسر ہیں۔

حکیم لچھمن پرشاد

حکیم صوفی لچھمن پرشاد مشہور ماہر نباتات تھے۔ دواؤں کی تازہ حالت میں پہچان اور جڑی بوٹیوں کے بارے میں انہیں بڑی معلومات تھیں۔ انہوں نے زندگی کا کافی حصہ دواؤں کی تحقیق اور چھان بین میں گزارا۔ دوائی پودوں کی ماہیت و شناخت کے علاوہ ان کے طبی خواص کے متعلق بھی انہوں نے تجربات کئے۔ مفردات کے افعال اور استعمال پر ان کی نظر بہت گہری تھی، رسالہ مستانہ جوگی جو مدتوں ان کے زیر ادارت نکلا، طب کا ایک ایسا مجلہ تھا جس میں دواؤں کے تعلق سے نہایت مفید اور کارآمد مواد پیش کیا جاتا تھا۔ اس رسالہ کے ذریعہ انہوں نے طب کی بڑی خدمت کی اور عام لوگوں کو صحت، مرض اور دوا سے متعلق ضروری واقفیت بہم پہنچائی۔ یہ بڑا مقبول رسالہ تھا اور ہزاروں کی تعداد میں چھپتا تھا، ان کی کتاب ہندوستانی جڑی بوٹیاں اپنے موضوع کی بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔

حکیم صاحب آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے اولین اراکین میں تھے، ۱۹۵۲ء میں طبی کانفرنس کی از سر نو تشکیل ہوئی اور اس کی مجلس عاملہ کا پہلا جلسہ ۷ ستمبر ۱۹۵۲ء کو منعقد ہوا، اس میں صرف دہلی کے مقامی اطبا شریک تھے، ان میں حکیم صوفی لچھمن پرشاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حکیم صاحب بڑے علم دوست اور جان نثار فن تھے۔ یونانی طب کی بقا اور ترقی کے لیے ان میں ایک تڑپ تھی۔ انہوں نے بڑی با مقصد زندگی گزاری اور آخر وقت تک فن کی ترقی کے لیے کوشاں رہے، ۱۹۶۲ء میں رحلت کی۔

حکیم مدن موہن لال آپل

۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ طبیہ کالج دہلی سے کامل طب و جراحت کیا۔ گول مارکٹ میں مطب کرتے تھے اور کامیاب معالج تھے۔ ۱۹۵۰ء سے قبل کچھ عرصہ طبیہ کالج میں لیکچرر رہے۔ ذی علم طبیب تھے۔ فن کی ترقی سے دلچسپی رکھتے تھے سماجی شعور بلند تھا۔ بڑے وسیع الاخلاق اور دوست آدمی تھے۔ ۱۹۷۰ سے پہلے وفات پائی۔

حکیم الیاس خاں

حکیم الیاس خاں سہاور ضلع ایٹہ کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام امجد علی خاں شروانی تھا۔ ۱۸۸۰ء کے قریب پیدا ہوئے۔ گھر پر عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی آئے۔ مدرسہ امینیہ سے درس نظامیہ کی اور حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں کی نگرانی میں مدرسہ طبیہ سے طب کی تکمیل کی۔ ۱۹۰۱ میں طب کی سند حاصل کر کے سہاور میں مطب کا آغاز کیا، اسی سال ڈاکٹر ضیاء الدین علی گڑھ کے چندہ کے سلسلہ میں سہاور گئے اور حکیم صاحب کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی، ۱۹۰۲ء میں حکیم صاحب علی گڑھ آئے اور اپنا نجی مطب قایم کیا۔ علی گڑھ کالج میں طلبہ و اساتذہ کے لیے ایک یونانی شفاخانہ وقار الملک کے زمانہ میں جب ۱۹۰۹ میں قایم ہوا تو اس

لہ وقار حیات ص ۵۰۶

میں بحیثیت طبیب ان کا تقرر عمل میں آیا۔ اس یونانی شفاخانہ میں کالج کے طلبہ اور اساتذہ کے علاج کے علاوہ اوپر کوٹ میں وہ اپنا نجی مطب بھی کرتے رہے، الواح الصنادید کا یہ اندراج کہ وہ علی گڑھ میں ملازم نہیں تھے، صحیح نہیں ہے، یہ یونانی شفاخانہ علی گڑھ میں ۱۹۲۱ تک قایم رہا۔ ۱۹۲۱ کے اوائل تک علی گڑھ میں خدمات انجام دینے کے بعد حکیم اجمل خاں کی خواہش پر دہلی پہنچے اور طبیہ کالج قرول باغ سے جو اسی سال قایم ہوا تھا وابستہ ہوئے، ہاؤس فزیشین، سپرنٹنڈنٹ کالج اور پروفیسر معالجات کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

۱۹۲۶ء میں حکیم اجمل خاں نے ایک مجلس تحقیق قایم کی جس کے وہ خود چیرمین اور حکیم الیاس خاں سکریٹری تھے، ۱۹۳۲ میں طبیہ کالج میں اسٹرائک ہوئی اور تین اساتذہ حکیم الیاس خاں، حکیم فضل الرحمن خاں اور حکیم کبیرالدین کو اس کی پاداش میں کالج سے سبکدوش کیا گیا، حکیم الیاس خاں نے طبیہ کالج سے علاحدگی کے بعد قرول باغ کے نزدیک شیدی پورہ کے چوراہہ پر ۱۹۴۶ء میں دہلی کی دوسری طبی درسگاہ جامعہ طبیہ کی بنیاد ڈالی جو وہاں ۱۹۴۷ تک قایم رہا، ۱۹۴۷ کے ہنگاموں میں کالج کو زبردست نقصان پہنچا۔ حکیم جمیل خاں کے ایما سے طبیہ کالج قرول باغ اور جامعہ طبیہ کے طلبہ کی مشترکہ تعلیم کے لیے گلی قاسم جان میں کالج قایم کیا گیا حکیم الیاس خاں اس کے پرنسپل مقرر ہوتے، یہ کالج اس تاریخی عمارت میں تھا جس میں حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں نے مدرسہ طبیہ قایم کیا تھا، ۱۹۴۹ء میں جب دہلی کی فضا درست ہوئی تو طبیہ کالج حسب معمول قرول باغ منتقل ہو گیا اور جامعہ طبیہ کو اسی عمارت میں رہنے دیا گیا۔ حکیم الیاس نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ اپنی زندگی ہی میں جامعہ طبیہ کو ہمدرد وقف کے حوالہ کر دیا۔ اس طرح حکیم عبدالمجید کے مضبوط ہاتھوں میں پہنچ کر اسے ایک نئی زندگی ملی۔ اور آج ہمدرد طبی کالج کے نام سے ملک میں طبی تعلیم کے ایک اہم ادارہ کی حیثیت سے وہ امتیاز رکھتا ہے۔

حکیم الیاس خاں آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس میں شروع سے

سرگرم رہے، دیدمان سنگھ کے بعد وہ اس کے جنرل سکریٹری کے منصب پر فائز ہوئے ان کی اور صدر کانفرنس حکیم غلام کبریا کی مساعی سے حکیم اجمل خاں کے بعد کانفرنس کو نئی زندگی ملی اور اس کے کامیاب اجلاس منعقد ہوئے[1] ملک کی آزادی کے بعد انہیں سب سے پہلے کانفرنس کو زندہ کرنے کا خیال آیا اور انہوں نے ۱۹۵۲ء میں دہلی میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے نام سے تنظیم قایم کی، حکیم عبدالحمید صاحب اس کے صدر مقرر ہوئے۔ حکیم الیاس خاں کانفرنس کے روح رواں تھے، ہندوستان کی طبی سیاست ان کے گرد گھومتی تھی، وہ بڑے باحوصلہ، ہوشمند اور مدبر تھے۔ حکیم عبدالحمید صاحب نے ان کے بارے میں لکھا ہے، "طبی مسایل کو حل کرنے میں ان کی شخصیت جو کام کر جاتی تھی وہ ہماری بہت سی تدبیریں بھی نہیں کرتی تھیں وہ غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ گلی قاسم جان کے ایک کونے میں بیٹھ کر ملک کی تمام طبی سیاست پر نظر رکھتے تھے"[2]

۱۹۵۴ء میں حکومت نے دیسی طبوں کی بہتری کے لیے دہلی میں بورڈ آف آیورویدک اینڈ یونانی سسٹم آف میڈیسین بنایا تو حکیم صاحب اس کے ممبر نامزد کئے گئے اور وہ وہاں یونانی طب کے ترجمان کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں دیسی طبوں کے نصاب و تحقیق کے لیے حکومت نے جو ریسرچ کمیٹی قائم کی اس کے بھی وہ ممبر مقرر کئے گئے، مرکزی حکومت کی مقرر کردہ کمیٹیوں، جو پڑا کمیٹی، پنڈت کمیٹی، دوے کمیٹی کے بھی وہ ممبر رہے[3]

کتاب قانون عصری حکیم صاحب کی بہت اہم یادگار ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس میں اطبا کے پیش کردہ تجربات

---

[1] رموز حکمت ص ۴۹

[2] الواح الصنادید ص ۳۰۸

[3] جامعہ طبیہ میگزین ۱۹۶۷ء ص ۳۰

کو بھی کتابی شکل میں مرتب کر کے شایع کیا تھا۔

آزادی کے فوراً بعد ہندوستان میں طب یونانی کی ترقی اور فروغ کے لیے جن طبیبوں نے نمایاں خدمات انجام دیں اور جن کے بیش قدر کاموں کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا ان میں حکیم الیاس خاں کا نام بہت ممتاز ہے، وہ طب کے ایک ایسے قاید تھے جن کا ملک کے طبی حلقوں میں بڑا اثر تھا۔ ان کی قیادت اور شخصیت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ صدر الاطبا کہلاتے تھے اور یہ خطاب ہر طرح ان کے شایان شان تھا۔

۲۶ فروری ۱۹۶۳ کو ۸۲ برس کی عمر میں وفات پائی اور حسب وصیت قبرستان مہندیان میں دفن ہوئے۔

مولانا حکیم عبدالغفار

دلی لٹنے پٹنے کے بعد بھی علم و حکمت کا مرکز اور تہذیب و تمدن کا سرچشمہ رہی۔ پاکستان بننے کے بعد دلی والے بڑی تعداد میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ مگر جو باقی رہے انہوں نے دلی کی آبرو کو بنائے رکھا۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک اہم شخصیت مولانا حکیم عبدالغفار کی تھی۔ ان کا خاندان دہلی کے مشہور علما کا خاندان تھا۔ سلسلہ نسب شیخ نورالدین ملک پران (وفات ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء) سے ملتا ہے۔ حکیم صاحب کا ان کے پردادا مولوی نبی اللہ (وفات ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء) کے نام سے موسوم باغ نبی اللہ میں قیام رہا۔ یہ عمارت آج بھی مسجد اور قیام گاہ کی صورت میں چوک حوض قاضی میں موجود ہے۔ حکیم صاحب کے دادا مولوی کریم اللہ (وفات ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء) کا سرسید نے آثار الصنادید[1] میں اور رحمٰن علی نے تذکرہ علمائے ہند[2] میں تذکرہ کیا ہے

---

[1] آثار الصنادید ص ۵۶۰

[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۲

حکیم صاحب کے والد مولانا محمد یعقوب کی شاگردی کا مولانا ابو الکلام آزاد کو بھی فخر حاصل ہے۔

حکیم عبد الغفار نے دینی علوم اپنے والد محمد یعقوب (وفات ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء) سے اور طب حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں سے پڑھی تھی، تجربہ کار طبیب تھے، قدرت نے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ جس کی وجہ سے مطب میں جو مسجد حوض قاضی کے بالا خانہ پر تھا، ہمیشہ بھیڑ رہتی تھی۔ درس و تدریس کا شوق تھا۔ آخر دم تک وہ باغ بنی اللہ میں مدرسہ کو وسعت دیتے رہے، ۱۹۴۷ء کے بعد ایک تہذیب کا زوال ہو رہا تھا، مولانا کو اس تہذیبی زوال کا بہت احساس تھا، وہ دلی کی عوامی شخصیت تھے۔ اور کوئی دلی والا ایسا نہ تھا جو ان سے واقف نہ ہو، وہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے مطب پر انحصار کرتے تھے۔

مولانا دہلی کی تہذیب کا نمونہ تھا۔ لباس بھی ہمیشہ وضع دار دلی والوں کا رہا۔ لمبا کرتا عموماً سفید رنگ کا۔ پتلے پائچوں کی سیدھی شلوار، کندھے پر ایک بڑا سا رومال، ہاتھ میں تسبیح اور عصا رہتا تھا، مطب کے لیے جب کمرہ میں آتے تو دو زانو بیٹھتے تھے اور نشست کا یہ انداز اٹھنے کے وقت تک برقرار رہتا تھا، ہر مریض کا حال توجہ سے سنتے تھے۔ ان کی توجہ سے مریض کو طمانیت ملتی تھی۔

علم و ادب سے لگاؤ تھا، علم و آگہی پھیلانے میں انہوں نے اپنے بزرگوں کی نہ صرف یہ کہ پیروی کی بلکہ ان کا نام روشن کیا، ایک رسالہ المفتی جاری کیا تھا۔ جو مضامین کے اعتبار سے وقیع ہوتا تھا۔ ان کے پاس آنے والوں میں پیر ضامن نظامی، مولانا مختار احمد، حکیم عبد الحمید، حکیم سید مختار احمد اشرفی، مولانا قدیر اعظم عباسی، منشی ذکی حسن، ہرکشن لال بھروال ایڈووکیٹ، حکیم سید حسن، علامہ اخلاق دہلوی شامل ہیں[۱]۔ ایک زمانہ میں (۱۹۳۵ سے قبل) حکیم سید کرم حسین نجارہ کھی

---

[۱] دہلی والے جلد ۲ ص ۲۷۶

دہلی میں ان کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں عم مکرم حکیم سید عتیق القادر کے ہمراہ مجھے بھی ان کی مہمانی کا شرف حاصل ہوا ہے، حافظ مجید الدین نجارہ کا آخری زمانہ میں انہی کے ہاں قیام تھا اور وہیں ۲۲ جنوری ۱۹۴۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔

امداد صابری نے لکھا ہے "۱۹۴۷ء کے پرآشوب دور میں مسجد و مدرسہ اور مولانا کے گھر پر حملے ہوئے۔ کوئی چیز نہ بچی جس کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی گئی ہو، مولانا کے صاحبزادہ مولانا ابوالفضل سخت مجروح ہوئے، ذاتی کتب خانہ اور گھر کا سامان سب برباد ہو گیا۔ بڑے صبر اور دلیری سے مولانا نے یہ دن گزارے۔ مسجد سے ایک منٹ کے لیے علاحدہ نہیں ہوئے، پنج وقتہ نمازیں ہوئیں اذانوں کی صدائیں بھی گونجیں، مطب بھی جاری رکھا، خاندانی قبرستان کی بھی مستعدی سے حفاظت کی اور شیخ نور الدین ملک یار پراں کا عرس ہر سال وقت مقررہ پر کیا۔[۱]

حکیم صاحب نے ۱۹۴۷ء کے پرآشوب دور میں ایک مسیحا اور خضر کا کردار ادا کیا اور اپنی جگہ قائم رہ کر عالی ہمتی کی مثال قائم کی۔ ۱۸ جمادی الاول ۱۳۸۳ھ / ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو وفات پائی۔

مسجد حوض قاضی جو ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء کی تعمیر کردہ ہے۔ اسے حکیم عبدالغفار کے دادا مفتی کریم اللہ نے از سر نو بنوایا تھا۔ پھر ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۸ء میں حکیم عبدالغفار نے اسے نئے سرے سے تعمیر کیا، اس کا عالی شان حوض، دالان اور کمرہ بنوایا اور عمر بھر اس کی تعمیر و درستی میں لگے رہے، حکیم ناصر نذیر فراق نے دس اشعار پر مشتمل قطعہ کہا تھا۔ دو شعر یہ ہیں ؎

بسر جان پدر خوش خلق و دیندار	سراپا علم مفتی عبد غفار
فراق از بہر تاریخ و محامد	بگو زیبا شدہ فخر المساجد
	۱۳۴۸ھ

---

[۱] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۳۰۸ دہلی کے قدیم مدارس و مدرس ص ۱۸۱

حکیم محمد عبدالواحد

حکیم محمد عبدالواحد موضع داہا ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے، حصول تعلیم کے لیے دہلی آئے اور پھر دہلی ہی کے ہو رہے، مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا بے حد شوق تھا، ساری زندگی یہی ان کا مشغلہ رہا۔ وہ ادارہ المسیح کے ناظم اور نائب مدیر رسالہ المسیح تھے۔ اس ادارہ کی بیشتر کتابیں ان کی تصنیف کردہ ہیں جو کتابیں ان کے نام سے شائع ہوئی ہیں ان میں کتاب التکلیس، رسالہ ذیابیطس (۱۹۲۴ء) رسالہ بواسیر (۱۹۲۴) رسالہ آتشک (۱۹۲۴) رسالہ سوزاک (۱۹۲۴) رسالہ مدار بولی (۱۹۲۳) رسالہ جدری (۱۹۲۴) رسالہ ہیضہ (۱۹۳۱) رسالہ مدار بولی (۱۹۲۳) وغیرہ ہیں ایک اور ضخیم کتاب بحران کے نام سے طبع ہوئی ہے وہ کتاب التشخیص (۱۹۲۴) ہے یہ دو جلدوں میں ۷۲۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اردو میں اس موضوع کی جامع اور مفید کتاب سمجھی جاتی ہے، اس ادارہ کی وہ کتابیں جو کسی کے نام سے نہیں چھپی ہیں اور جن پر صرف "ناشر دفتر المسیح" لکھا ہوا ہے مثلاً مخزن مفردات (کتاب الادویہ) یا جنہیں "ادارہ المسیح نے سلیس ترجمہ کرانے کے بعد شائع کیا ہے" اور جن پر کسی مؤلف یا مترجم کا نام درج نہیں ہے مثلاً میزان الطب یا "جن کے ترجمہ میں متعدد ارباب قلم نے حصہ لیا ہے" اور بحیثیت مؤلف یا مترجم ان پر کسی کا نام نہیں لکھا ہے مثلاً ترجمہ حمیات قانون، ایسی بیشتر کتابیں حکیم عبدالواحد کے قلم کی رہین منت ہیں۔

حکیم عبدالواحد آخر میں ادارہ ہمدرد کے شعبہ تصنیف سے وابستہ ہوئے اس دور کی ان کی اہم یادگار "سروے آف ڈرگس" ہے یہ کتاب ان کے اور ڈاکٹر اتیج ایچ صدیقی کے نام سے ادارہ تاریخ و تحقیق طب ہمدرد کی جانب سے پہلی مرتبہ ۱۹۵۷ء میں طبع ہوئی تھی، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں نکلا تھا۔

حکیم عبدالواحد نے ہمدرد دواخانہ کی مجلس تشخیص و تجویز میں ناظم کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ حکیم صاحب نہایت شریف، بردبار اور مرنجاں مرنج تھے۔ ملنسار اور نیک طبع۔ دہلی کے زمانہ قیام میں راقم سطور کو ان کی خدمت میں اکثر حاضری کا موقع ملا۔ بڑے ذی علم اور صاحب نظر طبیب تھے۔ تقریباً نوے برس کی عمر میں ۱۹۶۷ء میں دہلی میں وفات پائی۔

حکیم محمد جمیل خاں

مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے اکلوتے صاحبزادہ تھے۔ ۱۵ مئی ۱۸۹۸ کو پیدا ہوئے[1]۔ نازو نعم سے پرورش ہوئی، بہترین اساتذہ سے تعلیم دلائی گئی، حکیم جمیل خاں علم و فضل اور حذاقت میں اسلاف کا نمونہ تھے، مسیح الملک کے انتقال کے بعد شروع ۱۹۲۸ء میں طبیہ کالج کے سکریٹری مقرر ہوئے اسی دوران اندرونی طور پر مخالفتوں کا سلسلہ شروع ہوا، تقریباً ایک ماہ ان کے خلاف اسٹرائک رہی اور دو ہی برس بعد ۱۹۲۹ء میں انہیں سکریٹری شپ سے ہٹا دیا گیا، ان کی جگہ حکیم محمد احمد خاں سکریٹری ہوئے، حکیم جمیل خاں نے دواخانہ حکیم اجمل خاں کے نام سے ایک دواخانہ کھولا۔ اس کے لیے ملک بھر کا دورہ کیا۔ ہر جگہ ان کی پزیرائی ہوئی اور وہ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، پونا اور دوسرے شہروں میں دواخانہ کی شاخیں قائم کی گئیں۔

۱۹۳۷ء میں حکیم محمد احمد خاں سے مصالحت ہوئی اور وہ پھر کالج کے سکریٹری بنے اور ہندوستانی دواخانہ بھی ان کی نگرانی میں آیا، لیکن ۱۹۳۲ء میں ان کے خلاف مقدمات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ قائم رہا، دس برس بعد اکتوبر ۱۹۴۲ء میں ہائی کورٹ سے دیوانی مقدمات کا فیصلہ حکیم جمیل خاں کے حق میں ہوا اور انہوں نے

---

[1] تذکرۂ خواجگان ص ۱۱۵

اطمینان کا سانس لیا، اصلاحات پر بھی توجہ کی، کالج لائبریری میں کتابوں کا اضافہ کیا۔ دار الترجمہ کی بنیاد ڈالی، اسی دوران سیرت اجمل مرتب کرائی[1] اس سے پہلے ۱۹۲۸ء میں انہوں نے منشی سید ظہور احمد وحشی اڈیٹر ماہنامہ تجلی کی اعانت کر کے تجلی پریس قائم کرایا تھا، اس میں ابتدا میں صرف ہندوستانی دواخانہ کا کام چھپتا تھا۔ منشی ظہور احمد (وفات ۱۹۴۴) کی شاعری کی حکیم اجمل خاں بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے بعد حکیم جمیل خاں نے ان کا لحاظ قائم رکھا[2]

۱۹۴۹ تک طبیہ کالج اور ہندوستانی دواخانہ حکیم جمیل خاں کی زیر نگرانی رہا۔ ملک کے جو حالات بدل چکے تھے وہ ان سے سمجھوتہ نہیں کر سکے، ان کے خلاف طلبہ نے اسٹرائک کی اور حکومت سے کالج اور دواخانہ کو اپنی تحویل میں لینے کا مطالبہ کیا، ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ کو حکومت نے ہندوستانی دواخانہ پر ریسیور مقرر کیا بخشی ہربنس سنگھ ایڈوکیٹ اور لالہ امرناتھ موگا ایڈوکیٹ اس میں شامل تھے۔ تقریباً سال بھر بعد لالہ چرنجیت لال ایڈوکیٹ کا بھی اس میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں دہلی اسمبلی نے طبیہ کالج ایکٹ منظور کیا۔ ریسیور ختم ہوتے اور طبیہ کالج بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی۔ کرنل بشیر حسین زیدی طبیہ کالج بورڈ کے پہلے چیرمین مقرر کئے گئے۔ حکیم جمیل خاں نے ریسیور مقرر کئے جانے کے خلاف مقدمہ دائر کیا تھا۔ یہ مقدمہ سپریم کورٹ تک پہنچا اور ان کے خلاف فیصلہ ہوا، اس مقدمہ کے درمیان حکومت نے ان سے متعدد بار مصالحت کی کوشش کی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابو الکلام آزاد کی خواہش کو اس میں خاص دخل تھا لیکن حکیم جمیل خاں آمادہ نہیں ہوتے، آخر میں انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کی۔

حکیم جمیل خاں نہایت ذہین، دانشور اور صاحب علم و فضل تھے، لیکن ان میں

---

[1] حکیم اجمل خاں ص ۲۰۸

[2] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۹۷

انفرادیت پسندی اور احساس برتری کا جذبہ ابھر آیا تھا، اپنی بڑھی ہوئی انا اور خود پسندی کی وجہ سے وہ زندگی بھر مسایل میں مبتلا رہے، یہ مزاجی کیفیت شروع سے تھی، حکیم اجمل خاں کے انتقال پر تعزیت کے لیے بکثرت آنے والے افراد میں سے وہ کم لوگوں سے ملے، پنڈت نہرو سے بھی اس موقع پر نہیں ملے تھے، ایک موقع پر مولانا آزاد جب ان سے ملنے گئے تو ان سے بھی ملاقات سے انکار کیا، والدہ کے جنازہ میں شریک نہیں ہوئے، اور تعزیت میں آنے والوں سے ملاقات نہیں کی، قاضی عبدالغفار کی کتاب لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری میں اگرچہ حکیم جمیل خاں کا حوالہ نہیں ہے لیکن میری اطلاع کے مطابق قاضی صاحب نے یہ کتاب حکیم جمیل خاں کو سامنے رکھ کر لکھی تھی۔

دہلی میں حکیم محمد انجم خاں لیکچرر طبیہ کالج قرول باغ کے ہمراہ راقم سطور کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ شریف منزل کے بالائی حصہ میں ایک وسیع کمرہ میں اونچی مسہری پر وہ آرام فرماتے۔ مسہری پر دو تین گاؤ تکیے چند کتابیں اخبار اور نیچے بڑا اگالدان تھا، کمرہ سے شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا، بڑی بارعب اور دلکش شخصیت تھی، روشن آنکھیں، عجب قسم کی چمک اور متناطیسیت، کشادہ پیشانی، سرخ و سفید چہرہ وجاہت اور عظمت کا آئینہ دار، میں نے بعض طبی مسایل کو چھیڑا، بعض شخصیتوں کا ذکر نکلا۔ بصیرت و آگاہی کے ساتھ ان کے جواب میں مایوسی کی جھلک تھی اور موجودہ طبیبوں کی علمی صلاحیت کے فقدان کا شکوہ تھا۔

خانہ نشینی کے زمانہ میں میرٹھ آمد و رفت رہتی تھی، انتقال سے کچھ دن پہلے صاحبزادوں کے پاس لاہور گئے تھے۔ وہیں ۲۶ ستمبر ۱۹۰۰ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

حکیم جمیل خاں نہ صرف بہترین معالج تھے بلکہ دواؤں کی تیاری بالخصوص کشتہ سازی میں انہیں خصوصی ملکہ حاصل تھا، ان کا ایک ذاتی معمل تھا، جس میں وہ ادویہ کی ترکیب اور تحلیل و تجزیہ کا تجربہ کرتے رہتے تھے، حکیم گردت سنگھ پرنسپل جامعہ طبیہ دہلی نے جنہوں نے ہندوستانی دواخانہ میں ان کی زیر نگرانی کام کیا تھا، راقم سطور سے بارہا

کہا کہ فن دوا سازی میں حکیم جمیل خاں سے زیادہ مہارت اس عہد کے کسی طبیب میں موجود نہیں تھی۔

رموز الحکمت، رسالہ لقوہ، کتاب المفردات، اعمار العقاقیر، رسالہ چیچک، امور طبعیہ، کتاب سل ودق، وبایا مطبوعہ تصانیف میں ہیں۔ حکایات اطباتشخیصی اور کلینیکی لحاظ سے مریض کی ہسٹری کے طور پر وہ لکھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ بیاض مسیح، رسالہ برا لساعہ، شرح رسالہ برا کلسوس، کتاب الباہ (عربی) یہ چار کتابیں طبع نہیں ہوئیں۔ ان کی تصانیف ذاتی علم وتجربہ کی اطلاعات پر مبنی ہیں اور ان سے علمی بلوغ اور ذہنی اپج کا اظہار ہوتا ہے، کتاب المفردات میں دوا کے کیمیاوی افعال اور نئی معلومات پیش کی گئی ہیں۔

شاعری کا بھی ذوق تھا۔ دیوان وفا (دو مرتبہ) چھپ چکا ہے، انہوں نے گلدستہ جمیل کے نام سے پسندیدہ اشعار کا انتخاب شایع کیا تھا، اسی طرح 'میری پسند' کے عنوان سے فارسی اور اردو کے منتخب شعرا کا کلام بھی چھپوایا تھا۔

حکیم محمد نبی خاں اور حکیم احمد نبی خاں دو صاحبزادہ یادگار رہے۔ یہ دونوں پاکستان میں مقیم ہیں اور دواخانہ حکیم اجمل خاں ان کی زیر نگرانی قائم ہے۔

حکیم محمد کبیرالدین

حکیم محمد کبیرالدین انصاری شیخ پورہ ضلع مونگیر کے رہنے والے تھے ۱۳ اپریل ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں والدین کے سایہ میں محروم ہو گئے تھے۔ بڑے بھائی حکیم محمد ظہورالدین نے تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ کی۔ ۱۹۰۵ سے ۱۹۰۷ تک کانپور میں ابتدائی عربی وفارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۷ء میں لکھنؤ میں بڑے بھائی تکمیل الطب کالج میں داخل ہوئے اور حکیم کبیرالدین نے وہاں کے اساتذہ سے عربی درسی کتابیں پڑھیں۔ ۱۹۰۹ء میں دہلی میں مدرسہ طبیہ میں طب کی تعلیم شروع کی اور دوبرس

تکمیل کے بعد ۱۹۱۱ء میں فارغ ہوئے، بعد میں لاہور سے زبدۃ الحکما کا امتحان پاس کیا، ۱۹۱۷ء میں پیرجی حکیم عبد الرزاق کے انتقال کے بعد طبیہ کالج دہلی میں تشریح کے استاد مقرر ہوتے، ۱۹۳۲ء میں طبیہ کالج میں اسٹرائک کے نتیجہ میں حکیم محمد الیاس خاں، حکیم محمد کبیر الدین انصاری اور حکیم فضل الرحمٰن خاں کو کالج سے سبکدوش کیا گیا اس علاحدگی کے بعد ۱۹۳۵ء میں دہلی میں جامعہ طبیہ کے نام سے حکیم الیاس خاں نے ایک طبی درسگاہ قائم کی، حکیم محمد کبیر الدین اور حکیم فضل الرحمٰن خاں بھی ان کے ساتھ شریک تھے۔ جامعہ طبیہ سے حکیم کبیر الدین کا تعلق صرف چار برس قائم رہ سکا، ۱۹۳۹ء میں وہ اور حکیم فضل الرحمٰن خاں حیدر آباد تشریف لے گئے۔ حیدر آباد میں حکیم کبیر الدین نظامیہ طبیہ کالج کے وائس پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوتے، صاحب تذکرہ اطبائے عہد عثمانی کے مطابق " انہوں نے کالج کو اونچے معیار پر پہنچانے اور قابلیت داخلہ و معیار تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے مفید کوششیں کیں مگر وہاں ان کے خلاف سازش کا ایک محاذ کھڑا کیا گیا اور ۱۹۴۸ء میں حکیم صاحب کو کالج سے علاحدہ کیا گیا[1] ۱۹۵۴ء میں طبیہ کالج دہلی میں وائس پرنسپل کی حیثیت سے تقرر ہوا اور جون ۱۹۵۷ء تک وہاں انہوں نے تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۰ء تک طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں شفاء الملک حکیم عبد اللطیف فلسفی کی پرنسپلی کے زمانہ میں ریڈر رہے۔ جہاں راقم سطور کو ان سے استفادہ کا موقع ملا، دو برس علی گڑھ میں نجی طور پر قیام کے بعد ۱۹۶۲ء میں دہلی منتقل ہوتے اور ہمدرد دواخانہ کے لیے حکیم حاجی عبد الحمید نے ان کی خدمات حاصل کیں، ہمدرد کی ایک عمارت انہیں رہائش کے لیے دی گئی جہاں آخر وقت تک ان کا قیام رہا۔ ۹ جنوری ۱۹۷۶ء کو اس عالم طب کی وفات ہوئی۔

حکیم صاحب نے تعلیم سے فراغت کے بعد ہی طب میں ترجمہ و تالیف کی شدید

---

[1] تذکرہ اطبائے عہد عثمانی ص ۲۶۰

ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ستمبر ۱۹۲۱ء میں دہلی سے ماہنامہ المسیح جاری کیا جو آٹھ برس تک شایع ہوتا رہا، اس کام کو مزید وسعت دینے کے لیے دفتر المسیح کا قیام عمل میں آیا اور اس کے ذریعہ بڑے پیمانہ پر طبی کتب کی اشاعت انجام پائی۔

ادارہ المسیح کی شائع شدہ کتابوں کے دیباچوں سے پتہ چلتا ہے کہ ترجمہ کے فرائض متعدد اصحاب نے انجام دیے ہیں۔ ان میں حکیم محمد یحیٰی خاں پٹنہ، حکیم محمد یوسف نیر حیدرآباد، حکیم خواجہ رضوان احمد، حکیم عبدالواحد دہلی وغیرہ شامل ہیں۔

حکیم کبیرالدین کے علاوہ ادارہ المسیح کے دوسرے کارکن طبیبوں نے جو کتابیں مرتب کی ہیں اور جنہیں المسیح کی طرف سے شایع کیا گیا ہے ان میں مثلاً مخزن مفردات (کتاب الادویہ حصہ دوم) علاج الامراض (اردو) آسان نسخے، القرابادین، کتاب التشخیص، کتاب التنکلیس، الاکسیر، ترجمہ قانونچہ، ترجمہ میزان الطب، ترجمہ مخازن التعلیم رسالہ سل ودق، رسالہ ذیابیطس، رسالہ جدری، رسالہ طاعون، رسالہ ہیضہ، حمیات اجامیہ، رسالہ اذاراقی، رسالہ مدار، رسالہ سم الفار وغیرہ شامل ہیں۔

تذکرہ اطبائے عہد عثمانی سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ حمیات قانون میں حکیم مولوی محمد یوسف نیر نے حصہ لیا ہے[1]۔ اسی طرح رموز حکمت مؤلفہ حکیم عبدالرحیم جمیل گجرات کے مطابق حکیم خواجہ رضوان احمد نے حکیم محمد کبیرالدین کی خواہش پر قانون شیخ وغیرہ عربی کتب کا ترجمہ کر کے دفتر المسیح کو دیا تھا[2]۔ ترجمہ کبیر کی ابتدائی اشاعتوں کے دیباچہ میں خود حکیم کبیرالدین نے تحریر کیا ہے کہ یہ سارا کام حکیم محمد یحیٰی پٹنہ کا رہین منت ہے[3]۔

ترجمہ کلیات قانون، ترجمہ و شرح کلیات نفیسی، لغات کبیر، برہان، ارمغان، افادہ کبیر

---

[1] تذکرہ اطبائے عہد عثمانی ص ۲۰۷

[2] رموز حکمت ص ۵۹

[3] ترجمہ کبیر جلد ا ص ۳ (اشاعت ۱۹۴۱ء)

تشریح کبیر و صغیر، مباحث کبیر، علم الجراحت، منافع الاعضا، ترجمہ موجز القانون بھی قابل ذکر مطبوعات میں ہیں۔ حکیم صاحب کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ادارہ المسیح کے ذریعہ اردو زبان میں طب کی نصابی کتابوں کی تیاری و اشاعت کی طرف خصوصی توجہ دی اور ان کی مساعی سے طب کا جامع نصاب مرتب ہو سکا۔[1]

حکیم کیفؔ دہلوی

حکیم ہاشم جان کیفؔ دہلوی مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے نواسہ تھے۔ طبیہ کالج قرول باغ سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ شاعری سے دلچسپی رہی، حیدر دہلوی کے شاگرد تھے آواز دلکش تھی، مشاعروں میں خوب پڑھتے تھے۔ شاہد احمد دہلوی نے لکھا ہے: "بہت اچھے طبیب تھے۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا بھی دی تھی، مگر انہوں نے سنجیدگی سے پیشہ کی طرف توجہ نہیں کی، مزاج میں لاابالی پن تھا، جم کر مطب کرنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ گھر کے رئیس تھے اور دلی کے سارے ہی حکیم رئیس ہوتے تھے، اس لیے اور بھی بے پروا ہو گئے تھے۔ ویسے جب واقعی کسی کا علاج کرتے تو معجزے کر دکھاتے ورنہ یہ بھی دیکھا ہے کہ نالنے کے لیے نل میں سے بوتل میں پانی بھر کے مریض کو پکڑا دیا اور اللہ کی شان کہ اسی سے بیمار اچھا ہو گیا۔ کیفؔ پر جوانی ٹوٹ کر آئی تھی، حسین آدمی ہوا خوروں کی کمی نہ رہی۔ بالاخانوں پر رسائی اور پذیرائی ہونے لگی۔ مطب سے جو کچھ کماتے اور ہزاروں ہی کماتے، سب عیاشی کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ ان کی یہ آمدنی رئیسوں کے لیے خاص نسخے تیار کرنے سے ہوتی تھی۔ کالے ناگ سانپ پکڑنے والوں سے منگواتے جاتے۔ ان کا زہر نکالا جاتا، طلاء مار سیاہ بنانے کے لیے سرخ چیونٹے بوتلوں میں بھر کر لائے جاتے۔ طلاء مورچہ سرخ بنانے کے لیے۔ چڑی مار

---

[1] قانون ابن سینا اور اس کے شارحین ص ۲۴۴

پنجروں میں چڑے بھر کر لاتے معجون مغز کنجشک تیار کرنے کے لیے، بھنگ، چرس افیون کا بھی مہیا کئے جاتے، فلک سیر اور حبوب امساک بنانے کے لیے[1] آخر میں ان کی صحت گرتی چلی گئی، اور تقریباً پچاس برس کی عمر میں ۱۹۶۰ء میں رشتہ حیات منقطع ہوگیا۔

حکیم حبیب اشعر

حکیم حبیب اشعر حکیم کیف دہلوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ اپنے زمانے کے رومانی شاعروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ان کا مجموعہ کلام ۱۹۳۹ء میں راز و نیاز کے نام سے شائع ہوا تھا[2]

دلی کے اردو بازار میں کتب خانہ علم و ادب ادیبوں اور شاعروں کا ایک اچھا خاصہ مرکز تھا مغرب بعد یہاں بطور خاص ادیبوں کی بھیڑ جمتی تھی، روز کے آنے والوں میں ظفر قریشی، اخلاق احمد، صلاح الدین ثمر بیشی، صادق الخیری، نہال سیوہاروی فہیم بیگ چغتائی کے ساتھ حکیم حبیب اشعر ہوتے تھے[3]

ڈاکٹر مرزا احمد علی

دہلی کی سماجی اور سیاسی شخصیتوں میں امتیاز رکھتے تھے اور اپنی خوبیوں کی وجہ سے عوام میں ہر دلعزیز اور مقبول تھے، ۲۰ مئی ۱۹۰۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد علی ملٹری ڈاکٹر تھے۔ ارون ہسپتال میں پہلے میڈیکل آفیسر کے عہدہ پر فائز

---

[1] گنجینہ گوہر ص ۱۳۸ تا ۱۴۰

[2] یہ تھی دلی ص ۱۹۵

[3] گنجینہ گوہر ص ۳۹

کئے گئے تھے۔

مرزا احمد علی نے اینگلو عربک اسکول میں تعلیم حاصل کی ان کے ساتھیوں میں مرزا محمود بیگ اور حکیم عبدالمجید قابل ذکر ہیں۔ یونانی طب کی تعلیم کے لیے وہ طبیہ کالج فروباغ میں داخل ہوئے اور ۱۹۴۱ء میں وہاں سے باقاعدہ تکمیل کی۔ طب یونانی میں اپنے شوق کی وجہ سے حکیم محمود احمد خاں کی زیر سرپرستی بلی ماران میں انہوں نے پیام حکمت کے نام سے ایک دواخانہ کی بنیاد بھی ڈالی تھی مگر وہ طب کی جانب رجوع نہیں تھے، اس لیے مشق جاری نہیں رکھ سکے۔ مطب نہ کرنے کے باوجود مختلف النوع امراض کے سلسلہ میں ان کی تشخیص بہت معتبر تھی، وہ سوجیتا کرپلانی۔ گووند بلبھ پنتھ اور مہارانی گائتری دیوی کے معالج خاص رہے ہیں۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی جمہوریت اور سوشلزم کے علمبردار تھے، ملک کی آزادی کے لیے دل سے کوشاں رہے۔ وہ وطن پرستی اور جہاد آزادی کی جیتی جاگتی تصویر تھے حکیم اجمل خاں کے ساتھ تحریک آزادی میں شامل ہوکر انہوں نے نمایاں رول ادا کیا۔ شریف منزل میں اجمل خاں کانگریس کی جو میٹنگیں کرتے تھے ان میں موتی لال گاندھی جی، مولانا آزاد، آصف علی، جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، مولانا حسرت موہانی، دلیش بندھو گپتا، راج کماری امرت کور، ڈاکٹر مختار انصاری کے شانہ بشانہ یہ شریک رہتے تھے۔

تقسیم ملک کے بعد فسادات کی آگ سے دہلی بھی محفوظ نہیں رہی۔ دہلی میں ریلیف کا کام مولانا حفظ الرحمٰن کی قیادت میں شروع کیا گیا تھا۔ ان کے رفقاء کار میں نواب سلطان یار خاں، مولانا احمد سعید، حافظ عبدالعزیز، میر مشتاق احمد، عبدالحق پراچہ، حکیم سید حسن، سکندر بخت اور میسر بھدار جوشی کے ساتھ مرزا جی بھی ریلیف کے کاموں میں پیش پیش رہے۔ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں بڑا خوف و ہراس پیدا ہو گیا تھا، وہ جان و مال کے عدم تحفظ کے باعث پریشان تھے۔ ایسے نازک وقت میں انہوں نے مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی اور ان کے زخموں پر مرہم رکھا، کسٹوڈین کی وجہ سے شہریت باقی رکھنے اور جائدادوں کے مالکانہ

حقوق کو برقرار رکھنے میں جو دشواریاں پیدا ہوئی تھیں انہیں دور کرنے میں انہوں نے بڑا حصہ لیا۔

۱۹۵۲ء میں میونسپل کونسلر کے لیے وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے مگر ناکام رہے۔ ۱۹۵۶ء میں میونسپل انتخابات میں انہیں آزاد امیدوار کے طور پر کامیابی ملی۔ ۱۹۵۷ء میں میونسپل کارپوریشن دہلی کا قیام عمل میں آیا تو ایک سال بعد ہی نئے سرے سے انتخابات ہوئے اس میں بھی وہ بطور آزاد امیدوار کامیاب ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں مولانا احمد سعید کے مقابلہ پر جو کانگریس کے امیدوار تھے، وہ متحدہ اپوزیشن کے امیدوار کی حیثیت سے راجیہ سبھا کے لیے منتخب ہوئے، ۲ اپریل ۱۹۶۴ تک وہ راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔

شعر بھی کہتے تھے، مسکین تخلص تھا، ۶۱-۱۹۶۰ء میں انہوں نے نوح اکاڈمی قائم کی تھی، اس کے زیر اہتمام ادبی نشستیں اور مشاعرے منعقد کرتے تھے، دہلی میں اردو کی تعلیم و ترویج کے لیے کوشاں رہے، دہلی کی معاشرتی اور تہذیبی قدروں کی تعمیر کے لیے انہوں نے ہمیشہ کام کیا۔ میلوں اور تہواروں میں عوام کے ساتھ پیش پیش رہتے تھے، مہرولی میں پھول والوں کی سیر، نظام الدین کی سترہویں، عید میلاد النبی کے جلوس، خواجہ قطب الدین کے عرس میں دلچسپی کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ کے بعد نصیر الدین چراغ کا عرس انہی کی کوشش سے دوبارہ شروع ہوا تھا۔ ۱۲ ربیع الاول کا جلوس بھی ۱۹۴۷ کے بعد ۱۹۵۷ میں ان کی کوشش سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس جلوس کا خاص مقصد مسلمانوں کے دلوں سے ڈر اور خوف دور کرنا تھا ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۸ کو وفات ہوئی۔ ان کے بڑے بھائی حکیم مرزا یوسف علی خاں تاباں بھی دہلی کے مشہور طبیب تھے، مرزا احمد علی کی شادی گلی چاہ شیریں فراش خانہ کے حکیم محمد اسحٰق کی صاحبزادی سے ہوئی تھی[1]

---

[1] دہلی والے جلد ۲ ص ۲۴۱ تا ۲۵۳

حکیم بی این شرما

پورا نام بشیشر ناتھ شرما تھا۔ لیکن بی این شرما کے نام سے شہرت پائی۔ ۱۹۵۱ء میں جب دہلی میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کا از سرنو قیام عمل میں آیا تو حکیم بی این شرما اس کل ہند طبی تنظیم کے پہلے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے اور ۱۹۶۷ء میں جالندھر اجلاس تک تقریباً پندرہ برس اس عہدہ پر فائز رہے۔ حکیم صاحب طبی میدان سیاست کے شہسوار تھے۔ انہوں نے طبی کانفرنس کو نمایندہ تنظیم بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مختلف ناموں سے طبی انجمنیں قائم تھیں انجمن اطبائے بہار، انجمن طبیہ یوپی، انجمن اطبائے کشمیر، نظام طبی کانفرنس حیدرآباد، پنجاب طبی کانفرنس۔ انہوں نے ان تمام جماعتوں کو طبی کانفرنس میں ضم کرانے میں اہم کردار ادا کیا اور ان کی کوششوں سے کانفرنس کو مضبوط بنیادیں فراہم ہوئیں۔ جنرل سکریٹری کے عہدہ کا وقار ان کی ذات سے قائم تھا۔ انہوں نے کانفرنس کے وفود کے ساتھ متعلقہ ذمہ داروں سے ملاقاتوں کا ایک سلسلہ بنائے رکھا۔ طبی کانفرنس کی تاریخ میں ان کی خدمات جلی حروف سے لکھی جائیں گی۔

۱۹۶۴ء میں آصف علی روڈ پر جب ہمدرد نرسنگ ہوم قایم ہوا تو حکیم صاحب اس کے پہلے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ مقرر کئے گئے۔ انہوں نے بڑی شان اور مستعدی سے اس کے فرائض ادا کئے اور اعلیٰ انتظامی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ حکیم بی این شرما شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ پگڑی، شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس، وجیہ بلند قامت اور پرکشش، مؤثر گفتگو کرتے تھے۔ دوسروں سے اپنی بات منوانے کا سلیقہ تھا، اچھے مقرر تھے، کانفرنس کی تاریخ، اس کی تشکیل، مراحل ترقی، مسایل، مشکلات، اہم طبی شخصیات، باہمی رقابت، اندرونی چپقلش، مرکزی اور صوبائی سرکاروں اور تعلیمی اداروں کے معاملات، ان سب کا ان سے زیادہ کوئی جاننے والا نہیں تھا۔

۱۹۴۷ء کے بعد کی طبی سیاسیات پردہ اگر لکھنے تو اس دور کی بہت سی ایسی باتیں محفوظ ہو جاتیں جن پر اب کوئی لکھنے والا نہیں ہے۔ اس زمانہ میں طب میں بڑی گراں قدر شخصیتیں موجود تھیں۔ طبی کانفرنس ان کی سیاسی سرگرمیوں کا واحد مرکز تھی، ان سب کو جوڑ کر رکھنا آسان نہیں تھا، حکیم بی این شرما کا ان سے ذاتی تعلق تھا اور وہ ان کے مرتبہ اور مزاج کے مطابق ان سے معاملہ رکھتے تھے۔

حکیم صاحب کامیاب معالج تھے۔ گول مارکٹ میں ان کا ذاتی دوا خانہ تھا۔ ابتدا میں طبیہ کالج ہسپتال میں بھی انہوں نے کام کیا تھا ۱۳ اگست ۱۹۸۸ء کو انتقال ہوا۔

حکیم منسارام شکلا

حکیم منسارام شکلا بڑے فاضل اور لائق طبیب تھے۔ طبیہ کالج دہلی میں استاد رہے، امراض جلد میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ آخر میں ہمدرد نرسنگ ہوم آصف علی روڈ سے بھی وابستہ رہے۔ وہاں انہوں نے امراض جلد کا شعبہ قایم کیا تھا، مطب میں بھی بیٹھتے تھے۔ جامعہ طبیہ کے طلبہ کی نرسنگ ہوم میں ڈیوٹی رہتی تھی، انہیں سکھانے کی بہت کوشش کرتے تھے۔ درس سے بہت دلچسپی تھی، جلدی بیماریوں کے بارے میں قدیم و جدید دونوں قسم کی معلومات تھیں۔ یونانی طب میں اس شعبہ کو نظرانداز کئے جانے کا انہیں بڑا احساس تھا، بعض جلدی امراض کی دواؤں پر ان کا تحقیقی کام جاری تھا۔ افسوس کہ وہ سامنے نہیں آسکا۔ حکیم صاحب کا ذاتی مطب کا سلسلہ بھی تھا، خالص یونانی علاج کرتے تھے۔ اپنے فن پر انہیں اعتماد تھا۔ کامیاب یونانی معالجہ کے ذریعہ وہ لوگوں کو اس فن کی صداقت کا یقین دلانا چاہتے تھے۔

حکیم صاحب ملکی سیاست میں بھی حصہ لیتے تھے، میونسپل کارپوریشن دہلی کے ممبر رہے۔ کارپوریشن کے صدر زون کے چیرمین تھے اور شہر کے سیاسی اور سماجی مسایل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، مزاج میں رکھ رکھاؤ اور بردباری تھی، دوستوں کا

وسیع حلقہ رکھتے تھے اور اس میں ہر طبقہ اور ملک کے لوگ شامل تھے۔ ۱۹۶۸ء میں وفات پائی۔

حکیم ذکی احمد خاں

حکیم ذکی احمد خاں لودھی مولوی علی بہادر خاں کے بیٹے اور شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں کے بھائی تھے ان کے خاندان کے بارے میں محمود احمد عباسی نے لکھا ہے " محلہ کٹکوئی (امروہہ) کے پٹھان شرفا میں منشی بہادر خاں متخلص بہ علی کا گھرانہ ہے جس کے لائق فرزند شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں اور حکیم ذکی احمد خاں اقران و امثال میں ممتاز ہیں [1]

حکیم ذکی احمد ۱۸۹۸ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ میں درسی کتابیں پڑھیں۔ ان کے اساتذہ میں مدرسہ کے صدر مدرس مولانا احمد حسن محدث جیسی یگانہ شخصیت تھی مولوی حکیم محمد امین الدین سے بھی جو بعد میں طبیہ کالج دہلی کے وائس پرنسپل ہوئے، انہوں نے منطق و فلسفہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ امروہہ میں درسیات کی تکمیل کے بعد طب کی تعلیم کے لیے دہلی پہنچے۔ اس سے پہلے ان کے بڑے بھائی حکیم رشید احمد خاں ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۰ کو مدرسہ طبیہ میں داخل ہوتے تھے۔ حکیم ذکی احمد نے امتیاز کے ساتھ مدرسہ طبیہ دہلی سے فراغت کی۔

مدرسہ طبیہ میں داخلہ لینے والے مولانا احمد حسن کے شاگردوں کی علمی قابلیت سے حکیم اجمل خاں بہت متاثر تھے۔ یکے بعد دیگرے امروہہ کے فاضل ان کے طبیب بیشی مقرر ہوتے رہے۔ مثلاً حکیم فرید احمد عباسی، حکیم رشید احمد خاں اور حکیم ذکی احمد خاں اس خدمت پر مامور رہے۔ حکیم رشید احمد خاں ۴ جون ۱۹۱۲ء کو

---

[1] تحقیق الانساب ص ۳۲۱

مدرسہ طبیہ سے فارغ ہوتے۔ اختتام تعلیم کے بعد مسیح الملک نے انہیں اپنی پیشی
میں لیا۔ پہلے اسسٹنٹ طبیب پیشی مقرر ہوئے۔ حکیم مقصود طبیب پیشی تھے، چند ماہ
ان کی ماتحتی میں کام کیا۔ ان کے استعفیٰ کے بعد حکیم رشید احمد خاں طبیب پیشی بنے
اور ان کی جگہ حکیم نذیر احمد ساکن اومری مراد آباد کا اسسٹنٹ طبیب پیشی کی حیثیت
سے تقرر ہوا۔ ڈیڑھ دو سال بعد جب وہ علاحدہ ہوئے تو پھر ذکی احمد خاں کا انتخاب
عمل میں آیا، اور ۱۹ مارچ ۱۹۱۸ء کو حکیم رشید احمد خاں کے بمبئی منتقل ہونے کے
بعد طبیب پیشی کے عہدہ پر حکیم ذکی احمد خاں کو ترقی ملی، حکیم اجمل خاں کا پیش کار مطب
بننا بڑی عزت کی بات تھی، اور لائق طبیبوں کا اس کے لیے انتخاب ہوتا تھا۔ انہوں نے
تقریباً ۹ برس یہ فرائض انجام دیئے۔

مسیح الملک حکیم ذکی احمد خاں کو بہت عزیز رکھتے تھے، اور ان کی ذہانت اور
طباعی کو بنظر استحسان دیکھتے تھے، پیشکاری سے ان کی خدمات ضرورتاً ہندوستانی
دواخانہ منتقل ہوئیں۔ ان کی خدمات بحیثیت طبیب دواخانہ یادگار رہیں گی، اجمل خاں
کے زمانہ کے آخری منیجر مولوی قدیر احمد کے حکیم ذکی خاں قوت بازو تھے۔ ۱۹۱۹ء میں
ذاتی کاروبار کی شکل میں جید برقی پریس جاری ہو چکا تھا، اس کے لیے فرائض دواخانہ
سے سبکدوشی ضروری تھی، لیکن انہوں نے ایثار سے کام لیا اور اپنا حرج گوارہ کیا۔
مگر جب دیکھا کہ پریس بالکل نقصان میں چلا جائیگا تو مجبوراً ملازمت سے استعفیٰ دیا
جسے مسیح الملک نے بادل نخواستہ قبول کیا۔ پریس کے قیام کی تحریک کا سبب
یہ ہوا کہ دلی پرنٹنگ پریس میں جو لالہ شیام لال کے والد کا تھا ہندوستانی دواخانہ
کی چیزیں چھپتی تھیں۔ ایک مرتبہ کوئی ضروری کام تھا جسے پریس نے اہمیت نہیں دی
اور وقت پر نہیں چھاپا۔ چنانچہ حکیم صاحب نے اپنا پریس قائم کرنے کا عہد کیا۔

حکیم ذکی احمد خاں صاحب نظر طبیب اور حاذق معالج تھے۔ دہلی کی تہذیبی
زندگی میں اس طرح رچ بس گئے تھے، اور دہلی کی طبی چھاپ ان پر اتنی گہری تھی کہ اس
کے نمائندہ سمجھے جاتے تھے، طبیہ کالج بورڈ کے ممبر رہے، جید پریس ہی کے ایک حصہ

میں ذاتی مطب تھا، پریس کے قیام سے قبل اسی عمارت میں حکیم رشید احمد خاں مطب کرتے تھے۔ حکیم ذکی احمد پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد کے معالج رہے۔ راجندر پرساد کی کتاب میری کہانی میں ان کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پروفیسر مجیب، جسٹس عبدالرحمٰن (پاکستان کے پہلے چیف جسٹس) سید منیر حسن، مرزا محمود بیگ، حکیم عبدالمجید سے خاص تعلق تھا۔ نظام الدین میں مولانا الیاسؒ کی مجالس میں شرکت کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے آل انڈیا ریڈیو نے "کیا خوب آدمی تھا" کے عنوان سے تقاریر کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ حکیم صاحب نے حکیم اجمل خاں پر مقالہ پیش کیا تھا۔ یہ ریڈیائی تقاریر اسی عنوان سے طبع ہو چکی ہیں۔ ۱۷ جولائی ۱۹۷۰ء کو وفات پائی۔

حکیم ذکی احمد خاں کے بڑے بھائی حکیم رشید احمد خاں ملک کے ممتاز طبیب تھے۔ تقریباً پانچ برس حکیم اجمل خاں کی پیشکاری میں رہے۔ ۱۹۱۸ء میں دہلی سے بمبئی منتقل ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں شفاء الملک کا خطاب عطا ہوا۔ ان کے چار بیٹوں میں جاوید احمد خاں (فلم انڈسٹری) کے علاوہ حکیم مستطاب احمد حکیم استطاب احمد اور حکیم عزیز احمد طبیب ہیں۔

حکیم ذکی احمد خاں کے دوسرے بھائی حکیم عطاء الرحمٰن، حکیم حبیب الرحمٰن اور حکیم شمس الرحمٰن بھی طبیب تھے۔ یہ سب دہلی میں رہے۔ حکیم عطاء الرحمٰن کچھ عرصہ طبیہ کالج دہلی اور کچھ عرصہ طبیہ کالج بمبئی میں استاد رہے۔ شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں کی تصنیف حیات اجمل انہی کے اہتمام میں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۹۳ء میں وفات ہوئی۔ حکیم حبیب الرحمٰن نے ۱۹۸۶ اور حکیم شمس الرحمٰن نے ۱۹۶۵ء میں انتقال کیا۔

حکیم موتی رام

حکیم بھگت موتی رام کے خاندان میں مطب کا سلسلہ کئی پشتوں سے قائم تھا۔ ان کے والد حکیم بھگت رام چند اور دادا حکیم نراین داس راولپنڈی کے مشہور طبیبوں

میں تھے۔ حکیم موتی رام ۱۹۴۷ کے بعد دہلی آ گئے۔ فتحپوری میں مطب شروع کیا، اپنے کامیاب معالجہ اور دستِ شفا کی وجہ سے جلد ہی ان کا شمار دہلی کے حاذق طبیبوں میں ہونے لگا۔ مطب میں بڑا مرجوعہ رہتا تھا اور دور سے لوگ ان کے پاس علاج کے لیے آتے تھے اور شفایاب ہوتے تھے، ان کے نسخے مفردات پر مشتمل ہوتے تھے۔ مرکب دوائیں اپنے اہتمام میں تیار کراتے تھے۔ مریض کے فائدہ کا انہیں بڑا خیال رہتا تھا اور اسے وہ عبادت کا درجہ دیتے تھے ۱۹۷۴ء میں انتقال ہوا۔

حکیم صاحب بڑے مذہبی آدمی تھے، پنجاب اور سندھ کھیتر رشی کیش کے نائب صدر رہے، اس کا ہردوار میں دھرم شالہ اور رشی کیش میں دھرم شالہ اور گئو شالہ ہے، حکیم صاحب نے ہردوار میں ایک مکان بھی دان کیا تھا، وہاں ہر سال پابندی سے جاتے تھے۔ وہ سب مذاہب کا یکساں احترام کرتے تھے، ہر مذہب کے مقدس مقام کی زیارت کرتے اور کچھ نہ کچھ چندہ ضرور دیتے تھے، وہ ظاہری اور باطنی دونوں حسن سے آراستہ تھے، ان کے بشرہ سے شرافت اور نیکی کا اظہار ہوتا تھا، قدیم مشرقی اطوار کا نمونہ، سفید شیروانی اور صافہ ان کا مخصوص لباس تھا۔

حکیم صاحب کے صاحبزادہ حکیم ہربنس لال سند یافتہ لائق طبیب تھے۔ طبی کانفرنس صوبہ دہلی کے صدر رہے، ۱۳ جون ۱۹۸۸ء کو ۶۲ برس کی عمر میں وفات ہوئی تھی۔

ان کے دوسرے بیٹے حکیم اندر موہن نے جامعہ طبیہ سے ۵۶-۱۹۵۵ء میں اکمل الحکما کی سند حاصل کی تھی، فتحپوری میں مطب کا سلسلہ جاری رہا۔

حکیم خلیل الرحمٰن خاں نار

کھدر کے سفید کرتے، پاجامے، جواہر کٹ اور اجمل خانی ٹوپی میں ملبوس طویل قدوقامت، سرخ و سفید رنگت اور سفید براق ڈاڑھی کے ساتھ ہزاروں

افراد میں نمایاں نظر آنے والی شخصیت کا نام تھا حکیم خلیل الرحمن، شعروادب سے خاص دلچسپی تھی۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی (۱۸۶۷ء-۱۹۴۵ء) سے تلمذ تھا اور ان کے چہیتے شاگرد تھے، ان کے واسطے سے داغ کے سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے اور آخری زمانہ میں دبستان داغ کے نمائندے سمجھے جاتے تھے، زبان دلی کی ٹکسالی تھی، زبان کے ایسے ایسے اشعار نکالتے کہ ان کے بعد اس وصف میں صرف استاد رسا کا نام لیا جاسکتا ہے[1] حکیم صاحب نے گوپی ناتھ امن سے بھی استفادہ کیا تھا۔ جن دنوں حکیم صاحب رام لال ورما ہندی اور امن صاحب کے ساتھ نظر بند تھے تو یہ دونوں امن صاحب سے مشورہ سخن کرتے تھے، جیل میں مشاعرے بھی ہوتے تھے، ان دنوں کا حکیم صاحب کا ایک شعر ملاحظہ ہو[2]

لطف کھانے کا نہانے کا نہ پے خانے کا   یہ ہے برسات تو پھر برسات کی ایسی تیسی

حکیم صاحب شدت پسند مجاہد آزادی اور کانگریس کے سرگرم کارکن تھے، سودیشی تحریک کے زمانہ میں کھدر پہنا جو آخر تک زیب تن رہا، ملک کی آزادی کی لڑائی میں وہ جیل بھی گئے ۱۹۴۲ء میں گھنٹہ گھر چاندنی چوک میں انہوں نے گرفتاری دی تھی۔

حکیم صاحب ۱۹۵۰ء میں میونسپل کونسلر منتخب ہوتے اور مسلسل تین مرتبہ الیکشن میں کامیاب ہوتے، ۱۹۴۷ء کے زمانہ میں انہوں نے بڑا کام کیا، پل بنگش میں واقع کانگریس اور جمعیتہ العلما کے دفاتر میں گوپی ناتھ امن، مسز ارونا آصف علی، الطاف الرحمن، حکیم محمد اسمٰعیل، حافظ محمد عثمان، سکندر بخت کے ساتھ وہ اہم میٹنگوں میں شریک رہتے تھے، چوک کشن گنج میں حکیم صاحب کا مطب و رہائش تھی ۱۹۴۷ء میں کشن گنج وغیرہ کی آبادی فسادات کی وجہ سے ترک وطن کرنا چاہتی تھی۔ اپنے

---

[1] دہلی والے جلد ۲ ص ۲۸۱

[2] بہ کتی دلی ص ۱۵۵

گھروں کو چھوڑ کر بے سرو سامانی کے عالم میں آزاد مارکٹ پر لوگ پڑے ہوئے تھے حکیم صاحب نے ہر طرح انہیں آمادہ کرنا چاہا، محبت، ہمدردی، غصہ ہر حربہ استعمال کیا مگر وہ نہ مانے، مولانا حفظ الرحمٰن کے پاس گئے انہیں لے کر مولانا آزاد اور گاندھی جی سے ملے، جلسہ ہوا جس میں تینوں لیڈروں نے تقریریں کیں اور طے پایا کہ اگر چند دن حالات نہ سدھریں تو جہاں چاہیں جائیں۔ مگر جلد ہی حالات سدھرے اور علاقہ پھر آباد ہو گیا۔

۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلما کا اجلاس باڑہ ہندو راؤ میں ہوا۔ مولانا محمود الحسن کو صدارت کرنی تھی وہ نہیں آتے تو مفتی کفایت اللہ نے صدارت کی۔ برطانوی سامراج کے خلاف اس سہ روزہ جلسہ میں کئی قرار دادیں منظور ہوئیں جن میں حکومت سے عدم تعاون کی اپیل بھی شامل تھی، حکومت نے ان تجاویز کو ضبط کر لیا۔ اس اپیل کی کاپیاں گھر گھر پہنچانے کی ذمہ داری جن لوگوں نے لی ان میں نمایاں شخصیت حکیم خلیل الرحمٰن نار کی تھی۔ حکیم صاحب سادہ وضع بزرگ تھے۔ قانع، راضی برضا۔ ذاتی مطب کا سلسلہ تھا۔ لیکن ان کی سیاسی، سماجی اور فنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس پر اثر پڑتا تھا آخر تک وہی ان کی معاش کا ذریعہ رہا۔ طبی سیاسیات سے بھی انہیں بڑی دلچسپی تھی، وہ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے رکن اور بعد میں نائب صدر کے منصب پر فائز ہوتے، کانفرنس کی مجلس عاملہ کے جلسوں اور کل ہند اجلاسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے دہلی طبی کانفرنس کی صدارت کے لیے حکیم احمد جمیل شاہ قادری کے مقابلہ پر الیکشن لڑا، اور وہ دہلی طبی کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ میں جنرل سکریٹری کے الیکشن میں ان کے ساتھ کامیاب ہوا تھا۔ حکیم عبیدالرحمٰن سکریٹری منتخب ہوتے تھے اس کے بعد معرکے کے دو اور الیکشن ہوتے اور ہر الیکشن میں حکیم صاحب صدر اور میں جنرل سکریٹری منتخب ہوتا رہا۔ کانفرنس کے زیر اہتمام دہلی کے مختلف علاقوں میں میٹنگیں منعقد

لہ دہلی والے جلد ۲ ص ۲۸۱

ہوتی تھیں اور علمی وفنی مذاکروں کا سلسلہ رہتا تھا۔ اس زمانہ میں حکیم صاحب کی زیر صدارت کانفرنس کی دہلی شاخ کافی فعال اور سرگرم رہی۔ ۱۳۹۴ھ/۴/۳/۱۹۷۴ء کو وفات پائی ؎

دار فنا کو چھوڑ کے دار بقا میں آج — روح خلیل ہو گئی اب خلد میں مقیم
سال وفات کی جو ہوئی دل کو جستجو — آئی ندائے غیب ہوئی بخشش نعیم
۱۳۹۴ھ

حکیم محمود احمد خاں

حکیم محمد احمد خاں کے صاحبزادہ اور شریف منزل کا ایسا چراغ تھے جس کی روشنی میں فنی نقوش اور علمی روایت کا مطالعہ کیا جا سکتا تھا۔ طب کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے سے اپنے نامور باپ کے مطب میں بیٹھنے لگے تھے۔ طبیہ کالج میں ۱۹۳۱ء میں داخلہ لے کر ۱۹۳۵ء میں فارغ ہوتے، اول درجہ میں کامیابی کے صلہ میں طلائی تمغہ حاصل کیا۔ حکیم محمود خاں کو اپنے والد کی طرح ملکی سیاسیات سے دلچسپی نہیں تھی لیکن اخبار کے ذریعہ سیاسی رجحانات اور سیاسی تبدیلیوں سے باخبر رہتے تھے۔

وہ دہلی میں شریف خانی سلسلہ کے آخری طبیب تھے، ان کی ذات سے خاندان کا بھرم قائم تھا۔ آخر تک پابندی سے مطب کرتے رہے، طبیہ کالج بورڈ کے بھی ممبر رہے، بڑے نستعلیق، شائستہ اور اعلیٰ شریفانہ قدروں کے حامل تھے، شخصیت میں وقار تھا، وضع، لباس، رہن سہن اور نشست و برخاست ہر چیز سے قدیم مشرقی معاشرت اور خوش ذوقی کا اظہار ہوتا تھا۔

راقم سطور کی دہلی کے زمانہ قیام میں اکثر ان کی خدمت میں حاضری رہتی تھی۔ خندہ پیشانی سے ملتے اور دیر تک لطف سخن رہتا، میں نے ہمیشہ ان کے ہاں کسی نہ کسی مہمان کو پایا۔ ان کے ایک دوست ایک طرح مستقلاً قیام پذیر رہتے تھے رامپور کے ممتاز طبیب حکیم سید سلطان احمد رضوی سے خصوصی تعلق تھا، دونوں طبیہ کالج کے پرانے ساتھی تھے، ان سے بے تکلف گفتگو اور چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔

۱۹۶۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اجمل صدی کی شاندار تقریب منعقد ہوئی۔ میرے بے حد اصرار پر اس میں شرکت کے لیے آمادہ ہوئے۔ سفر میں ان کی ہمراہی رہی حبیب منزل میں نواب عبید الرحمن خاں شروانی کے ہاں قیام ہوا۔ ان سے ان کے دیرینہ خاندانی مراسم تھے، کانفرنس کی طرف سے مندوبین کو آمد و رفت کا کرایہ پیش کیا گیا تھا، حکیم محمود احمد خاں نے قبولیت سے انکار کیا اور فرمایا کہ یہ ہمارے خاندان کی روایت نہیں ہے۔ ماہنامہ الحکمت دہلی میں ان کے بعض مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ۴ جولائی ۱۹۷۵ کو یہ شمع فروزاں گل ہوئی۔ ایک فرزند مسرور احمد خاں ان کی یادگار ہیں۔

حکیم محمد شریف خاں

حکیم محمد ظفر خاں کے صاحبزادہ تھے، ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ طبیہ کالج دہلی میں تعلیم پائی۔ مطب اپنے نانا حکیم محمد احمد خاں سے سیکھا، ۱۲ برس کی عمر سے مریضوں کو دیکھنا شروع کیا تھا، امراض کی تشخیص اور ادویہ کی تجویز میں ملکہ تھا[1] حکیم محمد ظفر خاں صاحب فراش ہوئے تو انہوں نے حکیم شریف خاں کو دواخانہ ہند کا نگراں مقرر کیا، اسی کے ساتھ ان کے مطب میں بیٹھنے کی ابتدا ہوئی۔

۱۹۴۷ کے بعد جن کج کلاہوں کا ذکر زبانوں پر تھا، پرانی دہلی کی تہذیبی، تمدنی ثقافتی اور معاشرتی زندگی جن ہستیوں سے عبارت تھی ان میں ایک اہم شخصیت حکیم محمد شریف خاں کی تھی، نجابت، شرافت، اور مشرقی تہذیب کا پیکر، وضع داری حسن اخلاق، سخاوت، فیاضی، پان کھانے کی لت تھی خوش حال، خوش باش اور اشراف کی روایات کے عین مطابق زندگی کی تمام تر رنگا رنگیوں کو پورے اہتمام

---

[1] الواح الصنادید جلد ۱ ص ۳۶۶

کے ساتھ قبول کرنے والے، شعر و ادب کا رچا ہوا ذوق تھا، ہزاروں اشعار ورد زبان رہتے۔ شعر نوازی صرف مطالعہ تک محدود نہ تھی بلکہ سلسلہ شاعر نوازی تک دراز تھا جوش اور اس عہد کے کئی بڑے شعرا متعدد بار ان کے مہمان ہوئے۔ شریف منزل کے کشادہ ہال میں شعری محفلیں گرم ہوئیں اور دہلی کی سردی کے باوجود راتیں گئے تک سرد نہ ہوئیں۔ گرمی ہوتی تو وسیع صحن میں چھڑکاؤ ہوتا اور محفل جمتی اور گرمی کلام موسم کی گرمی کو مات دیتی نظر آتی۔

حکیم شریف خاں نے شریف منزل میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالتے ہی چشم حیرت سے ملک کی تاریخ کے اس نازک، اہم اور انقلابی عہد کی برگزیدہ ہستیوں کو دیکھا اور ان کی محفلوں میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔ سیاست میں داخل ہوئے اور انتخابی جنگ میں اترے تو ہر مرتبہ غریب سے غریب تر ہوتے گئے ہر انتخاب آرائی کے وقت کوئی نہ کوئی جائداد فروخت کی اور آخری انتخاب میں آبائی دواخانہ ہند سے بھی محروم ہو گئے۔ ایسی کم مثالیں ہوں گی کہ سیاسی میدان میں طالع آزمائی کے بعد دولت میں اضافہ کرنے کے بجائے آبائی املاک سے بھی ہاتھ دھونا پڑا ہو۔ وہ علاقہ کی محبوب ترین شخصیت تھے، جب گھر سے نکلتے تو اتنے سلام موصول ہوتے کہ شاید جواب دیتے دیتے ہاتھ تھک جاتا ہوگا۔

انہیں سیاست کی ضرورت نہ تھی، مگر سیاست کو ان کی ضرورت لاحق ہوئی۔ حلقہ بلی ماران سے کانگریس مسلسل شکست کھا رہی تھی، کمیونسٹ لیڈر سرلا شرما اس علاقہ کی لیڈر تھیں وہی الیکشن جیتتی تھیں۔ کانگریس کو ان کے مقابلہ کے لیے ایسی ہر دلعزیز شخصیت کی ضرورت تھی جو ذاتی اوصاف کی وجہ سے انتخاب میں فتحیاب ہو سکے۔ بیرسٹر نور الدین کی نظر انتخاب حکیم صاحب پر پڑی اور حکمت عملی کامیاب رہی۔ پہلی مرتبہ ۱۹۶۲ء میں انہوں نے کانگریس کے ٹکٹ پر کارپوریشن کے الیکشن میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد دو مرتبہ اور انتخاب میں حصہ لیا اور کامیاب ہوتے، اس طرح مسلسل تین مرتبہ جیتے، تین میں سے دو مرتبہ ایسا دور تھا کہ فضا کانگریس

مخالف تھی۔ اور بلدیہ میں کانگریس کو اقتدار حاصل نہ ہو سکا تھا۔ ان کی ممبری کے زمانہ میں کانگریس کو اقتدار تو ایک ہی مرتبہ ملا لیکن وہ اسٹینڈنگ کمیٹی کے مستقل ممبر رہے۔ شہری بس کے محکمہ ڈی ٹی یو کے وہ چیئرمین بھی رہے، طبیہ کالج بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے بھی انہوں نے خدمات انجام دیں۔

۱۹۷۹ء میں انتقال ہوا اور قبرستان مہندیان میں دفن ہوئے۔ اخبار الجمعیتہ نے ان کی موت پر لکھا تھا "حکیم صاحب کی موت سے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اہم واقعات کو جنم دینے والی شریف منزل سے ملکی و قومی سیاست کا شعور رخصت ہو گیا[1]

حکیم گوردت سنگھ الگ

پنجاب ہندوستان میں غیر مسلم طبیبوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اور وہاں یونانی معالجین کی بہت بڑی تعداد غیر مسلم اطبا پر مشتمل تھی، ان لوگوں نے طب کی جس طرح خدمت کی ہے اور طب کی علاجی روایت کو جس طرح آگے بڑھایا ہے اس کا اندازہ کچھ اس زمانہ کے طبی اخبارات و رسایل سے کیا جا سکتا ہے، ایک نئی روح اور زندگی تھی جو طب میں انہوں نے پیدا کر رکھی تھی، ان کے دم سے یونانی کا چمن اس طرح شاداب اور پر رونق تھا اور طبی سرگرمیاں وہاں اس قدر بڑھی ہوئی تھیں کہ ملک کے دوسرے صوبوں میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے، بڑی کثرت سے ان کے ذاتی اور نجی مطب قائم تھے۔ طبی اخبار اور رسالے نکلتے تھے، کانفرنسوں اور اجلاسوں کا سلسلہ رہتا تھا، اہم طبی کتابوں کی تصنیف بھی ان کے ذریعہ عمل میں آئی، ان کے قائم کردہ دواخانوں نے یونانی دوا سازی کا معیار بلند کیا اور پورے

---

[1] دلی والے جلد ۲ ص ۴۰۵ سے ۴۱۹

ملک کو یونانی مرکبات ان کے ذریعہ فراہم ہوئے۔

تقسیم ملک کے بعد پنجاب سے جو بکثرت لوگ دہلی میں آکر آباد ہوتے ان میں طبیبوں کی بھی کافی تعداد تھی، ان طبیبوں نے ۱۹۴۷ کے بعد دہلی میں طب یونانی کو سہارا دیا اور وہ جگہ پڑی کی جو بہت سے مسلمان طبیبوں کی نقل مکانی کی وجہ سے خالی ہوئی تھی اگر پنجاب سے آئے ہوئے یہ ہندو اور سکھ طبیب دہلی میں یونانی معالجہ کی اشاعت و فروغ کا ذریعہ نہ بنتے تو دہلی میں یونانی طب کی رفتار ترقی سست پڑجاتی، آزادی وطن کے بعد دہلی میں ان طبیبوں کی خدمات ہر لحاظ سے خراج تحسین پانے کی مستحق ہیں، حکیم بی این شرما، حکیم موتی لال، حکیم برج لال، حکیم خزان سنگھ، حکیم گوردت سنگھ حکیم گنگارام گاندھی، حکیم مایارام بھاردواج، حکیم ہری کشن لال، حکیم رام بھایا، حکیم مست رام شکلا، حکیم مدن موہن، حکیم ہیرالال جین، حکیم اندرسین سچدیو، حکیم جے گوپال کھنہ، حکیم جگدیش چندر شرما، حکیم سری چند گپتا، حکیم مرلی دھر ورما، حکیم امرت لال سیٹھی، حکیم اتم پرکاش، حکیم چھنارام گاندھی، حکیم ہربنس لال، حکیم مدن سروپ گپتا، حکیم منوہر لال، حکیم چینی لال سہگل، حکیم ہرچرن داس، حکیم رام آسرا مل، حکیم سائیں داس بھاٹیہ، حکیم حاذق راتے، حکیم دلیپ رائے، حکیم ہیرالال بھولا، حکیم ہرمہندر سنگھ بیجن حکیم راجندر لال ورما وہ چند نام ہیں جو مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں، ان میں سے کئی لوگ طبیہ کالج یا جامعہ طبیہ میں طب کے استاد رہے ہیں۔

حکیم گوردت سنگھ کا اصل وطن گوجر خاں تھا. طبیہ کالج دہلی کے فارغ التحصیل اور کامل الطب و جراحت تھے۔ ابتدا میں گوجر خاں میں مطب کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۴۷ کے بعد دہلی منتقل ہوئے، شروع میں ہندوستانی دوا خانہ سے وابستہ ہوئے جہاں حکیم جمیل خاں کی نگرانی میں کام کا موقع ملا، اور دوا سازی خاص کر کشتہ سازی میں مہارت پیدا ہوئی، بعد میں طبیہ کالج دہلی میں تشریح کے استاد مقرر ہوئے، حکیم صاحب کو تشریح سے خاص مناسبت تھی، وہ تشریح کے بہت اچھے استاد تھے۔ ۱۹۶۴ء میں وہ جامعہ طبیہ دہلی کے پرنسپل مقرر ہوتے، اور تیرہ برس ۱۹۷۷ تک اس منصب پر

فائز رہے، پرنسپل کی حیثیت سے ان کی انتظامی صلاحیتوں کا اظہار ہوا، وہ بڑے لائق منتظم اور اصول و ضوابط کے پابند تھے اور دوسروں کو بھی ضابطوں کا پابند دیکھنا چاہتے تھے۔ درس اور انتظامی مصروفیتوں کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی شوق رہا، تشریح و منافع الاعضا جو ان کے خاص مضمون تھے، ان پر طلبہ کی نصابی ضرورتوں کے لحاظ سے انہوں نے پانچ کتابیں لکھیں، یہ منافع الاعضا جلد اول، تلخیص التشریح اطراف (۱۹۷۰) التشریح مفصلیات (۱۹۷۴) التشریح عضلیات اور جیبی تشریح (۱۹۷۰) ہیں۔

تشریح کی عربی اصطلاحات ان کی نوک زبان تھیں، انہوں نے التشریح مفصلیات کے دیباچہ میں لکھا ہے "عربی زبان سے علم طب کا اساسی تعلق ہے۔ بایں وجہ طبی بالخصوص علم تشریح کے عربی مصطلحات کا جاننا طلبائے طب کے لیے بہت ضروری ہے اس ضرورت کے پیش نظر قانون شیخ کے حصہ تشریح (مفصلیات و عظمیات) کو اس کی اصل زبان (عربی) میں یہاں منتقل کر دیا گیا ہے" اس طرح ان کی اس اردو کتاب کی ابتدا میں قانون ابن سینا کا حصہ مفصلیات و عظمیات عربی میں نقل ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض کتابیں کاتب کے ناز و غمزہ سے بے نیاز ہیں۔ وہ بڑے صاف اور روشن خط تھے، انہوں نے خود کتابت کے فرایض انجام دیئے ہیں، ان کی ایک کتاب مخفی مجربات (۱۹۶۹) بھی ہے۔ اس میں مطب میں کام آنے والی مفید اور زود اثر دوائیں درج ہیں، یہ کتابیں ان کے قایم کردہ دار الشفا کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہیں۔

حکیم گوردت سنگھ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی مجلس عاملہ اور دوسری سرکاری و غیر سرکاری طبی کمیٹیوں کے رکن رہے، یونانی ماہر تعلیم کی حیثیت سے ان کی شخصیت مسلمہ تھی، اور ان کی رائے کا طبی حلقوں میں احترام کیا جاتا تھا۔ تشریح کے نصاب کی تیاری میں ان کا دخل رہا ہے، راجوری گارڈن میں جہاں حکیم صاحب کی رہائش تھی، دار الشفا کے ساتھ کافی دواخانہ کے نام سے ان کا مطب بھی تھا، کچھ عرصہ فالج

..میں مبتلا رہ کر ۱۹۸۲ء میں وفات پائی۔

حکیم رام لبھایا

موجودہ عہد میں دہلی کے طبی حلقوں میں گوسوامی حکیم رام لبھایا معروف شخصیت کے مالک تھے، ابتدا میں جہلم شہر میں حکیم سندر داس سے تشریح طب، میزان الطب، دار الشفا اور حکیم گرودت سنگھ سے طب کی متعدد کتابیں پڑھیں اس کے بعد ۱۹۴۷ سے قبل دہلی پہنچ کر جامعہ طبیہ سے تعلیم مکمل کی، تقسیم ملک کے بعد ڈیرہ بخشیاں ضلع راولپنڈی سے ترک وطن کر کے دہلی منتقل ہوئے، حکیم الیاس خاں کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے، ایک سال طبیہ کالج دہلی میں بطور رجسٹرار کام کیا، ۱۹۴۸ء میں جامعہ طبیہ میں لیکچرر مقرر ہوئے اور تیس برس سے زیادہ وہاں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ وائس پرنسپل اور پھر پرنسپل کے عہدہ پر فائز رہ کر ستمبر ۱۹۷۸ میں سبکدوش ہوئے ان کے بعد حکیم جمیل احمد کا پرنسپل کی حیثیت سے انتخاب عمل میں آیا، ۱۹۷۸ سے ۱۹۸۲ء تک انہوں نے ہمدرد طبی کالج میں جز وقتی استاد کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

حکیم رام لبھایا کے والد اور دادا دونوں کو رساین کا شوق تھا، جڑی بوٹیوں کی کھوج میں ان لوگوں نے کافی وقت گزارا تھا، حکیم رام لبھایا کو بھی طبی مضامین میں علم الادویہ سے خاص دلچسپی رہی، رساین، کشتہ سازی اور صیدلہ میں مہارت رکھتے تھے، دوائی پودوں کی بڑی پہچان تھی، طبی کانفرنس کے اجلاس یا دوسرے موقعوں پر جب باہر سفر میں ہوتے تو پیڑ، پودوں کو دیکھ کر رک جاتے تھے، رفقا کو ان کے نام، شناخت اور دوائی خاص کے بارے میں بتاتے اور ان کے نمونے حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، جامعہ طبیہ میں علم الادویہ کا درس ان سے متعلق تھا۔

حکیم صاحب نے ادویہ مفردہ پر دو جلدوں میں گوسوامی بیان الادویہ کے

نام سے ایک کتاب لکھی ہے، ۱۹۷۸ء میں یہ پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی، جلد ہی نظر ثانی و اضافہ کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن طبع ہوا۔ ان کی دوسری کتاب دہلی کے منتخب مرکبات ہے، یہ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ حکیم صاحب کی ایک کتاب گوسوامی گلدستہ اکسیر و رساین جس میں کشتہ سازی پر انہوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں قلم اٹھایا ہے، زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی، وہ شرح اسباب پر جدید اضافات کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ اضافہ میں شریف خانی اطبا کے معمولات خاص طور پر شامل تھے۔

حکیم صاحب اچھے یونانی معالجین میں تھے، خالص یونانی مطب کرتے تھے۔ گوسوامی فارمیسی کے تحت انہوں نے کچھ خصوصی مرکبات بھی تیار کئے تھے، ان کا گوسوامی کتب خانہ بھی تھا جس میں ان کی کتابوں کے علاوہ دوسرے مصنفین کی طبی کتابیں بھی رہتی تھیں، اردو سے ان کے شغف کا یہ حال تھا کہ وہ بنک کے دستخط بھی اردو میں کرتے تھے، وہ یونانی طبی کانفرنس صوبہ دہلی کے برسوں سکریٹری رہے، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ او[ر] پابندی سے کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں اور مجلس عاملہ کی نشستوں میں شرکت کرتے تھے، ان کا دہلی کی شہری زندگی میں نمایاں مقام تھا، مختلف مذہبی اور سیاسی انجمنوں کے رکن اور عہدہ دار تھے۔ طبیعت میں ظرافت تھی، بے تکلف دوستوں سے چھیڑ چھاڑ اور لطیف مزاح کا سلسلہ رہتا تھا، بڑے متواضع اور خلیق تھے، ضیافت کے بہانے ڈھونڈتے تھے۔ اور دل کھول کر خرچ کرتے تھے، مذہب سے گہرا تعلق تھا، تقریبا ہر سال وشنو دیوی کے درشن کے لیے جاتے تھے، اور مذہبی امور میں دلچسپی [لیتے] تھے۔

۸ جنوری ۱۹۸۵ کو وفات پائی۔

حکیم شریف الدین

حکیم منیر [الد]ین کے دو صاحبزادہ حکیم شریف الدین اور حکیم شجاع الدین تھے۔

حکیم منیر الدین نے ۱۹۲۴ میں چتلی قبر میں دواخانہ بقائی قائم کیا تھا، ۱۹۴۷ کے بعد حکیم شجاع الدین کراچی منتقل ہو گئے، حکیم شریف الدین کا دواخانہ چتلی قبر پر قائم رہا، حکیم صاحب کو طب میں حکیم امتیاز الدین سے تلمذ تھا، انہوں نے خاندانی منصب سنبھالا اور اپنے بزرگوں کے سچے جانشین ثابت ہوئے، خاندانی خصوصیات قیافہ شناسی، دقیقہ رسی فہم و فراست، اخلاق و مروت اور مریضوں کی دلجوئی ان کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

دہلی کے سماجی اور دینی حلقوں میں ان کا اعتبار قایم تھا، مختلف دینی درسگاہوں اور مسجدوں کی منتظمہ کمیٹی کے رکن اور عہدہ دار رہے، مدرسہ امینیہ کے قدیم ترین رکن[1] مسجد حسین بخش مٹیا محل، مسجد حوض والی ترکمان گیٹ اور مسجد سید رفاعی چتلی قبر کے صدر رہے[2]

بعض وجوہ سے ۱۹۴۷ میں مدرسہ حسین بخش کے حالات بہت مخدوش ہو گئے تھے میر مشتاق احمد نے اس کا بروقت سدباب کیا، یکم فروری ۱۹۴۸ کو معززین شہر کے اجتماع میں پندرہ آدمیوں پر مشتمل ایک مجلس منتظمہ بنائی گئی، اس کے ارکان میں مفتی کفایت اللہ مولانا احمد سعید، مولانا اخلاق حسین قاسمی، سلطان یار خاں وکیل اور حکیم شریف الدین بقائی وغیرہ تھے۔ کمیٹی نے حکیم شریف الدین کو صدر مقرر کیا، بعد میں مجلس منتظمہ کے اراکین بدلتے رہے۔ مگر حکیم صاحب آخر تک مدرسہ کے صدر رہے[3] ۲ جنوری ۱۹۹۱ء کو وفات پائی۔ ان کے پانچ بیٹوں میں حکیم ناصر الدین نے کراچی ہجرت کی۔ ڈاکٹر معین الدین کا جامع مسجد دہلی میں بقائی کلینک اور کلیان پوری میں بقائی ہسپتال اور ڈاکٹر عبدالرحمن کا چتلی قبر پر نیو بقائی کلینک ہے، حکیم جمیل الدین اور حکیم عزیز الرحمن

---

[1] دہلی کے قدیم مدارس و مدرس ص ۱۹۳

[2] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۱۹۲ دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۴۰

[3] دہلی کے قدیم مدارس و مدرس ص ۱۷۵

اپنے والد کے قایم کردہ دواخانہ بقائی میں مطب کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔
یہاں اس خاندان کے ایک رکن حکیم ذکاءاللہ خاں کے پڑپوتے حکیم اکرام الدین خاں کا تذکرہ بھی ضروری ہے، بحیثیت معالج انہیں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ دودمان بقائی کے دوسرے اہم افراد میں حکیم سمیع الدین اور حکیم لیاقت حسین خاں کا بھی شمار تھا۔

حکیم سراج الدین

حکیم سراج الدین (ابن حکیم فریدالدین ابن غلام معین الدین ابن حکیم نورالدین ابن حکیم ذکاءاللہ خاں) حاذق معالج اور کامیاب طبیب تھے۔ تیوسیلم پور دہلی میں نیلم دواخانہ کے نام سے انہوں نے مطب قایم کیا تھا۔ بڑا مرجوعہ رہتا تھا۔ ہاتھ میں شفا تھی خلیق، ملنسار اور ہر دلعزیز تھے، مریضوں سے ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ اور بڑے اعتماد سے علاج کرتے تھے[1]

دہلی کے قدیم گھرانوں کے معالج تھے۔ شاہد احمد نے لکھا ہے کہ "فراش خانہ والے حکیم سراج الدین کا ہمارے ہاں علاج ہوتا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں جب میرے والد بشیر الدین (خلف ڈپٹی نذیر احمد) پر فالج کا اثر ہوا تو پہلے علاج کے لیے انہی کو بلایا گیا۔ ان کے بعد حکیم بھورے میاں اور حکیم ظفر احمد خاں کا علاج ہوا"[2]

حکیم صاحب کا شمار عمائدین شہر میں تھا، آزادی سے پہلے جب دلی میں فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھی تو امن و امان برقرار رکھنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اس کمیٹی میں معززین شہر خواجہ محمد شفیع، حکیم دلبر حسن خاں بھٹی، لالہ امرناتھ، حکیم سراج الدین، پیارے لال موتی والے لالہ شنکر لال، عبدالواحد خاں، خواجہ حسن نظامی، سید عزیز حسن بقائی، حاجی ظہور الدین

---

[1] دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۱۱۹
[2] گنجینہ گوہر ص ۹۰

شامل تھے۔ ان لوگوں نے ہندو مسلم اتحاد اور بھائی چارہ کے لیے دلی کے گلی کوچوں میں جلسے کئے، میٹنگیں بلائیں اور ایک ایسا ماحول پیدا کیا کہ دلوں کی کدورت بڑی حد تک دور ہوئی [1]

حکیم صاحب کا ۱۹۷۲ء میں انتقال ہوا، ان کے بیٹے حکیم امام الدین نیلم دواخانہ میں علاجی فرایض انجام دے رہے ہیں۔

حکیم رضی الدین (ابن حکیم نور الدین) کے پوتے حکیم محمد حسین نے آنکھوں کے علاج میں بہت شہرت پائی۔ ۱۹۵۵ء میں وفات ہوئی، ان کے بیٹے حکیم محمد فضل عرف حکیم بقاوالے نے بھی اپنے بزرگوں کی طرح آنکھوں کے خصوصی معالج کی حیثیت سے نام کمایا، حوض قاضی پران کا قایم کردہ دواخانہ آنکھ کے علاج کے لیے مخصوص ہے، ۱۹۸۶ء میں حکیم محمد فضل کی وفات کے بعد ان کے دو بیٹے حکیم اقبال حسین اور حکیم صادق الامین حوض قاضی کے دواخانہ حکیم بقاوالے میں آنکھ کے علاج میں مصروف ہیں، تیسرے بیٹے حکیم مسعود کا "دواخانہ بقاوالے" کے نام سے گلی قاسم جان میں مطب قایم ہے، چوتھے بیٹے حکیم ساجد بھی خاندانی طبیب ہیں۔

اسلاف کے علم وفضل سے تہی دامنی کے باوجود دہلی میں اس خاندان کے متعدد دواخانوں کی موجودگی سے کم از کم اتنا ضرور ہے کہ طبی رونق قایم ہے اور یونانی طریقہ علاج کے ذریعہ فایدہ اٹھانے کے مواقع میسر ہیں۔

حکیم عبدالجلیل صدیقی

حکیم جمیل الدین کے چھوٹے صاحبزادے تھے، ۱۲ر رجب ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے نو برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر درسیات کی

---

[1] دہلی والے جلد ۲ ص ۴۸۲

تکمیل کی، طب میں والد ماجد سے استفادہ کیا، ہمدرد دواخانہ کی مجلس تشخیص کے برسوں صدر رہے۔اس کے بعد تقریبًا پندرہ برس طبیہ کالج دہلی میں تدریسی فرایض انجام دیے۔ اپنے والد کے قایم کردہ صدیقی دواخانہ کو بہت ترقی دی، مریضوں کی بڑی رجوعات رہتی تھی، اہتمام سے دوایں تیار کراتے تھے، ان کی ذات سے یونانی علاج کا بھرم اور طب کی افادیت کا نقش قایم تھا، مطالعہ اور تصنیف و تالیف سے دلچسپی تھی، عربی کی قدیم طبی کتابیں مطالعہ میں رہتی تھیں، ماہنامہ الحکمت جو راقم سطور کی زیر ادارت دہلی سے نکلتا تھا۔اس میں محمد بن زکریا رازی کی کتاب منافع الاغذیہ دد فع مضارہا کا ان کا اردو ترجمہ قسط وار شایع ہوا ہے، ۱۹۸۶ء میں ایک کتاب بچوں کا علاج تصنیف کی، طب یونانی میں اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے، اس میں خالص یونانی طریقہ کے مطابق تشخیص و علاج لکھا گیا ہے۔

حکیم صاحب نے شروع سے جمعیتہ العلما اور کانگریس سے تعلق رکھا اور تحریک آزادی میں حصہ لیا، ۱۹۴۲ء میں کانگریس کے جلسہ میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کے دوران کانگریس اور مسلم لیگ کے رضا کاروں میں جھگڑا ہوا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ حکیم صاحب کو گرفتار کیا گیا اور فرد جرم قایم کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ مقدمہ کی پیروی نورالدین بیرسٹر سابق میئر دہلی نے کی اور لاہور ہائی کورٹ سے باعزت بری ہوئے، طویل عرصہ تک روزنامہ الجمعیتہ دہلی کے پرنٹر اور پبلشر رہے بحیثیت پرنٹر و پبلشر مولانا محمد عثمان فارقلیط اڈیٹر اخبار کے ساتھ سزا ہونے پر دو چار روز جیل میں بھی گزارے[1] ۱۹۶۵ سے ۱۹۹۰ تک دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے، ۱۹۵۹ء میں پہلی بار اور اس کے بعد دوسری مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی۔

حکیم صاحب بڑے دلکش اور جاذب نظر تھے۔ چہرہ سے وجاہت ٹپکتی تھی

---

[1] دہلی والے جلد ۱ ص ۳۰۶

مزاج میں وقار سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ تھا، راقم سطور سے بڑا تعلق خاطر رکھتے تھے۔
جون ۱۹۹۰ کو انتقال ہوا، قبرستان بیدی پورہ میں مدفون ہیں۔ حکیم ظفر محمود اور حکیم شاہد جلیل دو بیٹے ہیں، اور دونوں کا دہلی میں مطب کا سلسلہ ہے۔

حکیم حاذق رائے

گوردوارہ روڈ پر حاذق دواخانہ کے نام سے ان کا مطب تھا۔ ملتان سے تقسیم کے بعد دہلی آئے تھے، خالص یونانی طبیب تھے، مطب میں مریضوں کی بھیڑ رہتی تھی، تقریباً ڈھائی تین سو مریض روزانہ دیکھتے تھے، پیچیدہ مزمن امراض کے لوگ کثرت سے ان کے علاج سے فیضیاب ہوتے، تشخیص میں ملکہ حاصل تھا۔ نبض اور قارورہ کے ذریعہ تشخیص مرض کرتے تھے، تقریباً ۸۰ برس سے زیادہ عمر پاکر ۱۹۹۱ء میں فوت ہوئے بڑے خلیق اور وضع دار بزرگ تھے، طبی کانفرنس میں دلچسپی لیتے تھے۔

حکیم ہری کشن لال

دہلی کے مشہور جنسی معالج تھے۔ جنسی امراض کے یونانی ماہر کی حیثیت سے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند بھی انہیں بڑی شہرت حاصل ہوئی، ان کے قائم کردہ خاندانی شفاخانہ نے جنسی امراض کے علاج کے مرکز کا درجہ اختیار کیا، باہ کے تعلق سے اس کے مخصوصی مرکبات کی ہندوستان سے باہر بھی مانگ ہوئی، خود حکیم صاحب نے یورپ کے متعدد ملکوں کا دورہ کیا اور ان کے ذریعہ وہاں یونانی علاج کا تعارف ہوا، اور یونانی مصنوعات میں لوگوں کی دلچسپی بڑھی، خاندانی شفاخانہ کی دیکھا دیکھی دہلی میں آیورویدک کے متعدد دواخانہ قائم ہوئے لیکن اس دواخانہ جیسی شہرت انہیں نہیں حاصل ہو سکی۔

یہ حکیم صاحب کی مقبولیت کی بات تھی کہ بورڈ آف آیورویدک اینڈ یونانی سسٹم آف میڈیسین دہلی کے انتخاب میں جملہ ایما سے زیادہ ووٹوں سے مسلسل کامیاب ہوتے رہے، انہوں نے تقریباً پچیس برس بورڈ کے منتخب ممبر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، ۲؍ اپریل ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوتے تھے، ۱۹۹۲ء میں وفات پائی۔

حکیم محمد عبدالرزاق

حکیم محمد عبدالرزاق ۲ فروری ۱۹۳۱ کو اورنگ آباد میں پیدا ہوتے۔ ۱۹۵۳ء میں طبیہ کالج دہلی سے ڈی آئی ایم ایس کیا، طالب علمی کے زمانہ ہی سے ہمدرد دواخانہ سے جزوقتی تعلق رہا، تکمیل تعلیم کے بعد ہمدرد دواخانہ میں مستقل ملازم ہوتے اور حکیم عبدالحمید کے طبیب بیٹی کے طور پر کام شروع کیا اور آخر میں وہاں میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر فائز ہوتے، ہمدرد نرسنگ ہوم کے منصوبہ اور اس کے قیام کے سلسلہ میں ان کی کوششوں کو دخل رہا، لیکن اس کے قیام سے قبل ۱۹۶۴ء میں وہ ہمدرد کی ملازمت سے سبکدوش کر دیتے گئے۔ یہ زمانہ ان کے لیے بڑی پریشانی کا تھا، مگر وہ بڑے حوصلہ اور عزم کے آدمی تھے، حسن اتفاق سے ۱۹۶۴ء میں مرکزی وزارت صحت میں یونانی فارماکوپیا کمیٹی کی تشکیل کی گئی اور حکیم عبدالرزاق کا سینیر ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا، وزارت صحت میں اب تک یونانی کا کوئی عہدہ قائم نہیں ہوا تھا، حکیم عبدالرزاق اس عہدہ کے لیے ہر طرح مناسب ثابت ہوتے۔ انہوں نے اپنی اہلیت اور لیاقت سے وزارت صحت میں وہ مرتبہ حاصل کیا جو ان کے ہم منصب دوسرے عہدہ داروں کو حاصل نہیں تھا، ۱۹۷۵ء میں وہ ڈپٹی ایڈوائزر یونانی مقرر ہوتے، طب یونانی کی ترقی اور فروغ کے لیے انہوں نے ہر سطح پر کوشش کی، ۱۹۶۹ء میں سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان انڈین میڈیسین اینڈ ہومیوپیتھی قائم کی گئی تھی، ۱۹۷۸ء میں اسے تقسیم کیا گیا، اور آیوروید و سدھا، یونانی، یوگا و نیچر کیور اور ہومیوپیتھی کی چار

علاحدہ کونسلیں قائم ہوئیں۔ حکیم عبدالرزاق ڈپٹی ایڈوائزر رہتے ہوئے ا، خودمختار یونانی کونسل کے مستقل ڈائریکٹر بنے۔ یونانی کونسل کی ترقی حکیم عبدالرزاق کی انتھک کوششوں کی رہین منت ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں کونسل کے یونٹ اور علاقائی اداروں کا جال پھیلایا، حیدرآباد میں ایک سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جس کی عالی شان عمارت ان کی اولوالعزمی کی گواہ ہے۔

حکیم عبدالرزاق نے نہ صرف ملکی سطح پر طب یونانی کے لیے قابل ستائش کام انجام دیے بلکہ بین الاقوامی سطح پر اسے تسلیم کرانے کی کوشش کی، ۱۹۸۷ء میں انہوں نے دہلی میں ہوٹل تاج پیلس میں سہ روزہ عالمی سیمینار منعقد کرایا۔ اس میں پچیس ممالک کے مندوبین نے حصہ لیا، اس سیمینار نے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ملکوں میں طب یونانی کے وقار میں اضافہ کیا۔ یہ سیمینار عالمی ادارہ صحت کے تعاون سے کیا گیا تھا، عالمی ادارہ صحت کے نمایندہ کی حیثیت سے انہوں نے کوریا، سری لنکا، جینوا، سعودی عرب اور امریکہ کا دورہ کیا، حکومت بنگلہ دیش کی دعوت پر وہ متعدد بار بنگلہ دیش گئے۔ انہوں نے ایران اور کویت کے سفر کئے، اور وہاں کی حکومتوں کو یونانی طب کی طرف توجہ دلانے کے لیے ایک جامع منصوبہ پیش کیا، حکیم عبدالرزاق ۱۹۸۵ء میں سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کے ممبر نامزد کئے گئے، وہ یونانی کمیٹی کے چیرمین اور کونسل کے وائس پریسیڈنٹ منتخب ہوئے، ۱۹۸۶ء میں وہ صدر جمہوریہ کے معالج مقرر کیے گئے۔ صوبہ جموں وکشمیر کی یونانی ترقیاتی کمیٹی اسی طرح بنگال اور کرناٹک کی یونانی ترقیاتی کونسلوں کے چیرمین رہے اور ان کوششوں سے ان صوبوں میں یونانی طب کی ترقی کے لیے اقدامات کیے گئے۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں وہ ایک ناخوشگوار حادثہ سے دوچار ہوئے لیکن مفاد فن کا جو منصوبہ ان کے پیش نظر تھا اس کے لیے آخر تک کوشاں رہے۔ فروری ۱۹۹۲ء میں تکمیل ملازمت کے بعد وہ کونسل سے سبکدوش ہوئے۔

فریضہ حج کی ادائیگی کے علاوہ انہیں متعدد بار عمرہ کی سعادت میسر ہوئی تھی عمرہ ہی کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب گئے تھے۔ واپسی میں دبئی میں مختصر قیام کے

دوران ۸، اپریل ۱۹۹۲ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔ تیسرے دن نعش دہلی لائی گئی اور ۱۰، اپریل کو نظام الدین قبرستان پنج پیران میں تدفین عمل میں آئی۔ حکیم عبدالرزاق کی مرتبہ کتابوں میں حکیم اجمل خاں اور حکیم شکیل احمد شمسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی اہلیہ ام الفضل نے حیدر آباد سے چار سالہ نصاب کی تکمیل کے بعد ایک سال علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر کے ۱۹۵۸ء میں بی یو ایم ایس کیا تھا، ابتدا میں ہمدرد نرسنگ ہوم میں انہوں نے طبی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسین میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدہ پر فائز ہو کر ۱۹۹۲ء میں سبکدوش ہوئیں، طبیبہ ام الفضل متعدد کتابوں کی مصنفہ ہیں، "طب یونانی میں گھریلو ادویہ اور عام معالجہ کی کتاب" ان کی اور حکیم عبدالرزاق کی بڑی مقبول کتاب ہے۔ اردو میں اس کی تین اشاعتوں کے علاوہ انگریزی، ہندی، تامل، تیلگو، پنجابی، کنڑ اور عربی میں اس کے ترجمے چھپ چکے ہیں، "طب یونانی میں برتھ کنٹرول کا تصور" کی وہ شریک مصنفہ ہیں۔

حکیم گنگا رام گاندھی

حکیم گنگا رام گاندھی اچھے یونانی معالج ہی نہیں تھے، انہیں گہرا فنی شعور بھی حاصل تھا۔ انہوں نے جہاں ہمدرد دواخانہ کی مجلس تشخیص و تجویز کے ناظم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، وہاں کامیاب نجی مطب کے ذریعہ یونانی معالجہ کی افادیت کا نقش لوگوں کے دلوں پر قایم کیا۔

حکیم صاحب کو شروع سے لکھنے پڑھنے سے دلچسپی تھی، رسالہ دولت صحت راولپنڈی اور رسالہ مشیر الاطبا لاہور کی ادارت سے وابستہ رہے، طب کے مختلف رسایل میں ان کے مضامین شایع ہوتے ہیں، ان کی کتاب "رموز علاج و تشخیص" معالجات کے سلسلہ کی عمدہ کتاب ہے، اس میں مطب و علاج کے لیے مفید تجربات پیش کیے گئے ہیں، ایک زمانہ میں طبیہ کالج بورڈ کے رکن بھی رہے تھے۔ ۱۹۸۹ سے ۱۹۹۰ تک

ایک سال طبی کانفرنس دہلی کے صدر رہے۔

حکیم صاحب بڑے وجیہہ، خوش لباس اور خوش معاش تھے۔ اکثر سفید شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ استعمال کرتے تھے۔ ان کے چہرہ اور لباس سے شرافت اور پاکیزگی نفس کا اظہار ہوتا تھا، مزاج میں وضع داری اور رکھ رکھاؤ تھا، ہر ایک سے تعلق اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے، لہجہ میں ٹھہراؤ اور وقار اور گفتگو میں علم و ادب کی چاشنی ہوتی تھی۔ آخر میں مذہب کی طرف بہت راغب ہو گئے تھے اور دنیا سے کنارہ کشی کر کے سنیاس لے لیا تھا۔ انہوں نے اپنے دو بیٹوں حکیم اندرجیت گاندھی اور حکیم امرکانت گاندھی اور ایک بیٹی طبیبہ للتا گاندھی کو بھی جامعہ طبیہ میں طب کی تعلیم دلائی تھی۔

حکیم عبدالحمید

حکیم عبدالحمید (ولادت ۱۴ ستمبر ۱۹۰۸ء) طب یونانی کا وقار اور اس کی عظمت ہیں۔ ان کے ذریعہ ملک اور بیرون ملک طب یونانی کا از سر نو تعارف ہوا ہے۔ بالخصوص بین الاقوامی سطح پر طب یونانی کو متعارف کرانے کا سہرا ان کے سر ہے، طب کی ترقی اور فروغ کے لیے انہوں نے جو اہتمامات کئے ہیں وہ ان کے فہم و تدبر، ژرف نگاہی و دانشوری کے ساتھ خلوص فن کا آئینہ دار ہیں، انہوں نے ہمدرد دواخانہ کو کاروباری ادارہ سے زیادہ فن کی خدمت اور اس کے احیا کا وسیلہ بنایا، ہمدرد اور طب یونانی دونوں کو لازم ملزوم کی حیثیت حاصل ہے۔ دواسازی کے معیار کو بلندی عطا کی اور یونانی مرکبات کی بڑے پیمانہ پر فراہمی کا نظم کیا۔ صنعت دواسازی کے فروغ میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔ انہوں نے ۱۹۳۱ء میں ہمدرد صحت نکالا اور اس کے ذریعہ، جس کی تعداد اشاعت ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی، دور دور تک یونانی طب کی آواز پہنچائی۔

۱۹۴۷ کے بعد ملک میں جو حالات رونما ہوتے اور یونانی نظام طب جس طرح

متاثر ہوا، اس کا شاید آج کے بدلے ہوئے حالات میں اندازہ نہ کیا جا سکے۔ یونانی طب کے اس ناسازگار زمانہ میں وہ اس کے ترجمان کی حیثیت سے آگے آئے، انہوں نے دوسرے رفقاء فن کے ساتھ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کو نئے سرے سے زندہ کیا۔ ۱۹۵۲ء میں وہ اس کل ہند طبی تنظیم کے صدر منتخب ہوئے اور تاحال اس منصب پر فائز ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں اس کی مجلس عاملہ کی نشستوں اور اجلاس عام کے انعقاد سے اطبا میں اعتماد اور حفاظت فن کا جذبہ بیدار ہوا، انہیں سر جوڑ کر بیٹھنے اور فنی مسائل پر غور و فکر کے مواقع حاصل ہوئے، ان کے اجتماعی ذہن اور اجتماعی کوشش سے طب کو درپیش مسایل کے حل میں مدد ملی۔ ۱۹۶۳ء میں جامعہ طبیہ کے بانی حکیم ایاس خاں کے انتقال کے بعد دہلی کی یہ دوسری طبی درسگاہ براہ راست حکیم عبدالحمید کی نگرانی میں آئی، ۱۹۷۳ء میں اسے ہمدرد طبی کالج کا نام دیا گیا۔ اور اب یہ جامعہ ہمدرد کی ایک فیکلٹی ہے۔

۱۹۸۹ء میں ان کے ذریعہ ایک دوسری مسلم یونی ورسٹی دہلی میں وجود میں آئی سرسید نے ایم اے او کالج قایم کیا تھا، جو آگے چل کر ان کی وفات کے بائیس برس بعد یونی ورسٹی بنا، اس کی حیثیت قومی یونی ورسٹی کی تھی جس کی تعمیر میں مسلمانوں کے خواص و عوام سب شریک تھے۔ جامعہ ہمدرد ایک شخص واحد کی مساعی کے نتیجہ میں قایم ہوا ہے۔ اس کے پیچھے حکیم عبدالحمید کی فکری عظمتیں اور عملی رفعتیں کار فرما ہیں، انہوں نے برسوں پہلے اس کے قیام کا منصوبہ بنایا اور نہایت خاموشی سے اس میں رنگ بھرتے رہے۔

حکیم عبدالحمید اس وقت دہلی کی شناخت، اس کی ثقافتی زندگی کا نشان اور اعلیٰ انسانی قدروں کی علامت ہیں، ان کے ہاں ذہن و فکر کی بلندی اور بالغ نظری ملتی ہے، جانفشانی اور مصمم عزم کی وہ زندہ مثال ہیں، ان کی پوری زندگی جہد و عمل سے عبارت ہے، وہ باتیں کم اور کام زیادہ کی عملی تفسیر ہیں، ان کا ایک وصف ان کی شخصیت کی دلنوازی ہے، ہر ایک سے تپاک اور خندہ پیشانی سے ملتے ہیں، کاروباری مصروفیات

کے باوجود علم و ادب اور مطالعہ و تحقیق سے انہوں نے اپنا رشتہ ابتدائی عمر سے قائم رکھا۔ وہ بہت کثیر المطالعہ ہیں، ہر قسم کی چیزیں پڑھتے ہیں۔ طب کی، سائنس کی، ادب و اسلامیات کی، تاریخ و تذکرہ کی، جدید ترین سائنسی موضوعات پر تازہ ترین اور تحقیقی رسایل کے اہم مواد سے ان کی واقفیت بعض وقت حیرت میں ڈال دیتی ہے علمی و فنی مسایل پر ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سے متعلق معتبر کتابیں اور ماخذ ان کے ذہن میں ہیں۔

حکیم صاحب کی تحریر مختصر اور جامع ہوتی ہے، وہ کم الفاظ سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملے جن میں پوری بات آجاتی ہے، یورپ اور ایشیا کے ملکوں کی متعدد بار سیاحت سے انہیں دنیا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے مشاہیر علم و ادب سے ان سے ملاقاتیں ہوئی ہیں، انہوں نے ان سب سے فائدہ اٹھایا ہے اور بہترین خوبیاں اپنی شخصیت میں جذب کر لی ہیں، وہ صحیح معنی میں جامع الصفات اور اپنی ذات سے ایک انجمن اور ادارہ ہیں، وہ بڑی کڑھی ہوئی اور طرحدار شخصیت کے مالک ہیں، ساری مصروفیتوں کے باوجود دلی کی علمی و ثقافتی تقاریب میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں اور ان کی رونق میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں، وہ بیک وقت کم گفتن، کم خوردن، کم خفتن پر عامل ہیں، وقار اور سنجیدگی کا پیکر لیکن خشونت نام کو نہیں، حسن مزاح، لطیف چھیڑ چھاڑ اور سخن دلنواز۔

حکیم عبدالحمید نے پانچویں دہائی کے آخر میں تاریخ طب کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا، ان کا قایم کردہ شعبہ تاریخ طب ہندوستان میں تاریخ طب کا پہلا شعبہ تھا۔ ادارہ تاریخ و تحقیق طب تغلق آباد اسی کی ترقی یافتہ شکل تھی، اس کی عمارت کا ۱۵ نومبر ۱۹۶۲ کو پنڈت جواہر لال نہرو نے سنگ بنیاد رکھا تھا اور محترمہ اندرا گاندھی نے ۱۹۷۰ء میں افتتاح کیا تھا، اسٹڈیز ان ہسٹری آف میڈیسین اینڈ سائنس کے نام سے ان کی زیر ادارت نکلنے والا مجلہ بین الاقوامی معیار کا حامل اور ملک میں اپنی نوعیت کا واحد رسالہ ہے، حکیم عبدالحمید کے مفاخر میں قانون ابن سینا کے

کے تنقیدی اڈیشن کی تیاری بھی ہے۔ ان کے زیر اہتمام جلد اول محرم ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱ء میں جلد دوم ۱۹۸۷ء میں اور جلد سوم کا پہلا حصہ ۱۹۹۲ء میں طبع ہوا ہے، باقی حصوں کی تنقیدی اشاعتوں کے علاوہ انگریزی ترجمہ کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ جلد اول کا انگریزی ترجمہ ۱۹۹۳ء میں چھپ چکا ہے۔ حکیم صاحب نے ابن سینا کی دوسری مشہور کتاب الادویہ القلبیہ کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا ہے۔

حکیم صاحب ستایش کی تمنا اور صلہ سے بے پروا ہو کر ہمیشہ اپنے کاموں میں مصروف رہے، لیکن انہیں جہاں پدم شری اور پدم بھوشن کے قومی اعزاز عطا کئے گئے وہاں ان کے علمی وفنی کارناموں کے اعتراف میں سوویت یونین نے انہیں ابن سینا ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

جامعہ ہمدرد، غالب اکاڈمی، رابعہ گرلس اسکول، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس اور کتنے ہی اداروں کو قائم کرنے کے علاوہ ان کا ایک بڑا کارنامہ تعلیم آباد اور ہمدرد پبلک اسکول ہے، جس میں بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا ہے اور جس کا اپنے قیام کے فوراً بعد دہلی کے معیاری اسکولوں میں شمار کیا جاتا ہے، جامعہ ہمدرد کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کے فروغ اور اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کی خوش حالی، شاندار مستقبل اور اعلیٰ ملازمتوں کے حصول کے لیے انہوں نے تعلیم آباد میں سول سروسز کے امتحان کی تیاری کا سلسلہ شروع کیا ہے، اس کے بہتر نتائج سامنے آرہے ہیں۔

حکیم صاحب کو تعمیرات کا بھی خاص ذوق ہے، عمارتوں کے نقشوں کو آخری منظوری وہ خود دیتے ہیں اور اس میں ان کے حسن ذوق کو خاص دخل ہوتا ہے۔ دلی کو انہوں نے مختلف شکلوں میں جو بہت کچھ عطا کیا ہے اس میں وہ عظیم الشان عمارتیں بھی ہیں جن سے دلی کا حسن دوبالا ہوا ہے، ان میں آصف علی روڈ پر ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کی عمارت، تعلیم آباد میں ہمدرد پبلک اسکول کی عمارتیں، ہمدرد نگر میں ۱۹۰ ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی جامعہ ہمدرد کی عمارتیں، بالخصوص شعبہ اسلامیات کی پانچ منزلہ پرشکوہ

عمارت اور ہمدرد کنونشن سنٹر دلی کی اعلیٰ تعمیرات میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔

ٹائمز آف انڈیا کے السٹریٹیڈ ویکلی نے ایک جائزہ کے ذریعہ پورے ملک سے مختلف شعبہ ہائے زندگی کی جن پچاس ممتاز ترین شخصیتوں کا انتخاب کیا تھا، ان مقتدر شخصیتوں میں حکیم صاحب بھی شامل تھے۔ ویکلی کے خصوصی شمارہ میں ان حضرات کے کارناموں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۱۹۸۱ء میں حکیم صاحب کی ۷۵ ویں سالگرہ کے موقع پر ان کی ثقافتی، تعلیمی اور فنی خدمات کا اعتراف ایک تبریک و تہنیت کی کتاب کی شکل میں کیا گیا، اردو کے مشہور محقق مالک رام نے اس کی ترتیب کے فرائض انجام دیے ہیں۔ "مجلس نذر حمید" کے صدر سعید الملک نواب احمد سعید خاں چھتاری اور اس کے اراکین میں ملک کی نامور شخصیتیں کرنل بشیر حسین زیدی، نواب عبدالرحمٰن خاں شیروانی، نواب میر اکبر علی خاں، پرنس یوسف نجم الدین، سید حامد، بردار سروپ سنگھ، خشونت سنگھ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر وغیرہ شریک تھیں۔

آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۴ء تک حکیم صاحب نے جو صدارتی خطبات عطا کئے تھے، انہیں ڈاکٹر خاور ہاشمی نے خطبات حمید کے نام سے مرتب کیا ہے، یہ خطبات اس پورے عہد کے طبی مسائل کے ترجمان ہیں اور ان کے ذریعہ حکیم صاحب کی سرپرستی میں کانفرنس نے فروغ اور ترقی طب کے لیے جو کوششیں کی ہیں ان کا تعارف سامنے آتا ہے۔

معالج کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ انہوں نے جس کثیر تعداد میں مریضوں کا معائنہ کیا ہے، یونانی طب کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ ان کے مریضوں کی تعداد کسی طرح بھی پچاس ساٹھ لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔ دکھی انسانیت کی یہ بہت بڑی خدمت ہے، جو ان سے انجام پا رہی ہے۔ مرض اور علاج میں بے شمار تجربوں نے ان میں بصیرت و ادراک کا ایسا مادہ اور انسان کو سمجھنے کا ایسا ملکہ پیدا کر دیا ہے کہ بعض وقت ان کے انکشافات اور پیش قیاسی پر حیرت ہوتی ہے

وہ اگر بزرگ کی حیثیت سے سامنے آئیں تو بہت سے لوگ اسے کھلی کرامت سمجھ بیٹھیں،
اکثر وہ زیر معائنہ شخص کے بچوں کی صحیح تعداد بتا دیتے ہیں، بعض وقت وہ اس کی
عادات، اطوار اور دوسری خصوصیات بیان کرتے ہیں جو مطابق اصل ہوتی ہے۔

حکیم صاحب کا ایک بڑا جوہر ان کی سادگی اور درویشی ہے۔ وہ الفقر فخری کا صحیح
مصداق ہیں کروڑوں روپیہ اور بے شمار آمدنی والے کاروبار اور قومی، ملی اور تعلیمی
امور پر بے دریغ خرچ کرنے کے باوجود ان کا ذاتی خرچ سو روپیہ ماہانہ سے زیادہ
کا نہیں ہے، ۱۹۶۴ میں ان کے ذاتی اخراجات ۸۷ روپیہ ماہانہ تھے، وہ ایک وقت
کھانا کھاتے ہیں، چائے انہوں نے زندگی میں کبھی نہیں پی۔ ان کے کپڑوں میں پیوند لگے
ہوتے ہیں۔ یہ پیوند وہ خود لگاتے ہیں، سوئی دھاگہ ان کے ضروری سامان میں شامل
ہیں، اپنا رومال، بنیان اور چھوٹی چھوٹی چیزیں وہ خود دھو لیتے ہیں، وقت کا ان کے
ہاں بڑا حساب ہے، ایک ایک لمحہ کی قدر کرتے ہیں اور اسے ضایع نہیں ہونے دیتے
تفریح اور محفل آرائی سے دور، ۸۷ برس کی عمر میں بھی بے تکان کام کرتے ہیں۔ دن میں
آرام کے عادی نہیں، مستقل اور مسلسل کام، منصوبہ بندی، قوت عمل اور عزم و حوصلہ کا
پیکر، ایک ہمہ جہت اور اعلیٰ انسانی اوصاف کی حامل شخصیت، تاریخ ساز اور عہد
آفریں ہیں۔

ملا واحدی جب ۱۹۵۹ء میں کراچی سے دہلی آئے تو ان کی ملاقاتیں دلی کی
اس دور کی ساری ہی قابل ذکر شخصیتوں سے ہوئیں، اپنے سفر نامہ "دلی کا پھیرا" میں
انہوں نے اس کی تفصیل پیش کی ہے۔ اطبا میں جن کا تذکرہ تعلق خاطر کے ساتھ کیا ہے
ان میں حکیم عبدالسلام زئی، حکیم مطلوب احمد، حکیم عبدالمجید، حکیم ذکی احمد، حکیم کامل
خاں، حکیم احمد جمیل شاہ قادری، حکیم عبدالحی انصاری، حکیم خلیل الرحمن نار، حکیم
اقبال احمد (ہمدم) شامل ہیں۔ یہ حضرات دلی کی سماجی اور شہری زندگی میں
امتیاز رکھتے تھے، اور ان کے دم سے اس وقت دلی پر رونق اور آبادتھی۔

دہلی کے مشاہیر علم کا طب سے تعلق

طب کا شمار ان علوم میں تھا جن کی تعلیم تکمیل درس کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ علما و صلحا اور مشاہیر علم و ادب کا طب سے تعلق رہا ہے۔ درس نظامی جن فنون کی کتابوں پر مشتمل ہے ان میں بطور ایک مضمون طب بھی شامل ہے، ان فارغین کی بہت بڑی تعداد نے اسے کسب معاش کا ذریعہ بنایا اور عملاً اس سے اپنی وابستگی رکھی، لیکن ایسے علما کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن کا اگرچہ مطب و معالجہ سے تعلق نہیں رہا، لیکن دوسرے علوم کی کتابوں کی طرح وہ نہ صرف طبی کتابوں کے درس میں منفرد سمجھے گئے بلکہ انہوں نے قدیم متون پر شرح و حواشی بھی تحریر کئے اور ان کی کتابوں کو سند و اعتبار کا درجہ حاصل ہوا۔

بیسویں صدی کے نصف اول مولانا اشرف علی تھانوی کے عہد تک علما کے طب سے گہرے تعلق کا ثبوت ملتا ہے، دہلی میں بھی ہر پڑھے لکھے اور صاحب علم سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ طبی معلومات سے ضرور بہرہ ور ہوگا۔ چنانچہ بزرگان دین کی طرح جو حصول شفا کے لیے مریضوں کو باقاعدہ نسخے لکھتے تھے، علما، شعرا اور ادبا بھی اس فن کی خاطر خواہ معلومات رکھتے تھے۔

شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی بن نور اللہ بن محمد صالح مہندس صدیقی (محمد صالح بڑے اچھے معمار تھے، جامع مسجد دہلی کی تعمیر میں وہ شریک رہے ہیں) سلسلہ چشتیہ کے مشائخ کبار میں ہیں، جمادی الثانی ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے اساتذہ سے درسیات کی تکمیل کی، حجاز کا سفر کیا حج و زیارت سے مشرف ہوئے، شیخ یحییٰ بن محمود گجراتی نزیل مدینہ منورہ سے ایک عرصہ تک ان کی خدمت میں رہ کر سلسلہ چشتیہ حاصل کیا پھر دہلی واپس آئے اور درس و افادہ میں مشغول ہوئے۔ طریقت کے ساتھ ہی اپنے وقت کے زبردست عالم اور

طبیب تھے[1]

انہوں نے شرف الدین ایلاقی (وفات ۴۵۸ھ/۱۰۶۵ء) کی کتاب الفصول الایلاقیہ کی شرح کی ہے۔ ایلاقی ابن سینا کا شاگرد تھا اور اس کی یہ کتاب کلیات قانون کا اختصار ہے۔ شرح کا ایک نسخہ رامپور میں محفوظ ہے۔

شرح ایلاقی کے علاوہ ان کی دوسری کتابوں میں تفسیر قرآن مجید، عشرہ کاملہ، کتاب الرد علی الشیعہ، تکسیر سواء السبیل، کشکول، المرتقع فی الرقی، مجموع المکاتیب وغیرہ ہیں۔ ربیع الاول ۱۱۴۱ھ ۱۷۲۸ء کو دہلی میں سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کا مزار جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان زیارت گاہ عام ہے[2]

شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم ایک دفعہ ایک گاؤں میں تشریف لے گئے۔ وہاں کے لوگوں نے ایک قریب المرگ مریض کا قارورہ دکھایا۔ آپ نے فوراً نسخہ لکھ کر حوالہ کیا، اس مجلس میں ایک غیر مسلم طبیب بھی حاضر تھا۔ شیخ کی یہ کیفیت دیکھ کر اس نے کہا کہ آپ نے بیماری کی تشخیص کی ہے کہ نہیں، شیخ نے مسکرا کر فرمایا یہ ایک عورت کا قارورہ تھا اور یہ فلاں مرض میں مبتلا ہے اور اس کے یہ احوال ہیں، طبیب بولا یہ مسئلہ طب میں کہاں لکھا ہے۔ فرمایا طب کی کتابوں میں نہیں اس کا نام فراست ہے[3]

شاہ ولی اللہ نے اپنے والد گرامی شاہ عبدالرحیم سے مختلف علوم کی جو کتابیں سبقاً سبقاً پڑھی تھیں اور جن کی فہرست کا ذکر شاہ صاحب نے اپنی ایک قیمتی تصنیف میں کیا ہے ان میں علم طب کی کتاب موجز القانون بھی ہے، جسے انہوں نے نصاب کے ایک مضمون کے طور پر پڑھا تھا[4]

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۲۴۲

[2] قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین ص ۱۵۷

[3] حیات ولی ص ۱۸۹

[4] حیات ولی ص ۲۲۷

خود شاہ ولی اللہ نے اپنے والد شاہ عبد الرحیم (۱۱۳۱-۱۰۵۳ھ/۱۹-۱۷۱۸-۱۶۴۴ء)
کے مدرسہ کے لیے جو نصاب تجویز کیا تھا اور جس کا ذکر الجزء اللطیف میں کیا ہے اس کے
مضامین میں طب شامل تھی۔ اس نصاب میں ہر فن کی ایک اہم کتاب داخل کی گئی تھی۔
طب میں موجز القانون کا درس دیا جاتا تھا[1]

شاہ رفیع الدین قانون کے درس میں یکتا سمجھے جاتے تھے۔ دور دور سے طلبہ ان کی
خدمت میں پہنچتے تھے، حکیم بدر الدین سہسوانی جیسے فاضل اور حاذق طبیب نے ان
سے قانون پڑھا تھا[2] مولوی شبیر محمد نے جو شاہ اسمٰعیل شہید کے ہم سبق تھے، تعلیم سے
فراغت کے بعد دہلی میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور حکیم غلام حسین خاں کے
مکان پر مقیم ہوئے۔ ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں وفات پائی[3]

مولوی سید احمد حسن دہلی کے معزز سادات سے تھے۔ حدیث اور فقہ شمس العلما
مولوی سید نذیر حسین محدث سے پڑھا علم طب بھی بالاستیعاب حاصل کیا تھا۔
شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد کے بڑے داماد تھے۔ قرآن مجید پر ایک بسیط حاشیہ بنام
احسن الفوائد کے علاوہ اردو میں احسن التفاسیر سات جلدوں میں لکھی، حدیث میں دو
کتابیں تنقیح اللغات فی تخریج احادیث المشکوٰۃ اور ابن حجر کی بلوغ المرام کا حاشیہ موسوم
بہ بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام عربی میں تصنیف کیں[4]

میر پنجہ کش کے استاد مولانا غلام محمد مفتی قلمی دہلوی تھے۔ انہوں نے فارسی
عربی اور انشاپردازی کی تعلیم حکیم قدرت اللہ قاسم سے پائی تھی۔ راقم تخلص تھا۔ لکھنؤ میں
حکیم مرزا محمد عتیق سے علم ادب حاصل کیا۔ طب میں بھی دخل تھا۔ ۱۸۲۳ یا ۱۸۲۴ء لکھنؤ

---

[1] دہلی کے قدیم مدارس و مدرس ص ۱۱۸ بحوالہ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ص ۱۴۲
[2] نزہۃ الخواطر جلد ۷ ص ۹۶
[3] دہلی کے قدیم مدارس و مدرس ص ۱۳۶
[4] واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۲۱۴

میں واقع ہوئے۔ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہندوستان میں خوش نویسوں کا تذکرہ فارسی میں لکھا۔ یہ تذکرہ مولوی ہدایت حسین مدرس پریسیڈنسی کالج کے حاشیہ کے ساتھ ۱۹۱۰ء میں طبع ہوا ہے۔[1]

شیخ ابراہیم ذوق نے بھی طب کی تحصیل کی تھی، کچھ عرصہ مطب بھی کیا۔[2] بشیرالدین احمد نے بھی طب سے ان کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے علم طب خوب حاصل کیا تھا۔[3] طب میں حکیم میر فیض علی ان کے استاد تھے، اور وہ انہی کا علاج بھی کرتے تھے۔ آزاد نے لکھا ہے کہ ایک دن میں موجود تھا، نوکر نے آکر کہا کہ آج میر فیض علی کا انتقال ہوا۔ بار بار پوچھا اور ایسا اضطراب ہوا کہ اٹھ کر ٹہلنے لگے، کچھ سوچ کر دفعتہً بولے کہ ہائے میر فیض علی، مجھ سے کہا کہ دیکھو تو یہی تاریخ ہے، حساب کیا تو عدد برابر تھے۔[4] (۱۲۶۶ھ)

امام بخش صہبائی جو درسیات کے زبردست فاضل تھے اور فارسی کتب کی تدریس میں بے مثل سمجھے جاتے تھے، شاہ جہاں آباد میں ان کی فارسی دانی کا بڑا غلغلہ تھا۔ ان کے دامن فیض سے سیکڑوں طلبہ نے استفادہ کیا، فارسی شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا بڑا مرتبہ ہے۔ بجز فارسی کے اردو میں شعر نہیں کہتے تھے۔ انہوں نے جہاں عربی و فارسی کی تحصیل کی وہاں طبی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ کریم الدین کی شہادت ہے کہ وہ طب میں دست قدرت رکھتے تھے۔[5]

صاحب طبقات شعرائے ہند پر دہلی کے علمی و طبی ماحول کا اثر تھا کہ انہوں نے دہلی میں قیام کر کے باقاعدہ طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔[6] اسپنجر پرنسپل مدرسہ دہلی اور

---

[1] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۱۷۳

[2] آب حیات ص ۴۴۶

[3] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۵۴۸

[4] دیوان ذوق ص ۲۲

[5] طبقات شعرائے ہند ص ۴۱۴ [6] ایضاً ص ۴۶۱

سکر بڑی سوسائٹی اردو کے حکم سے انہوں نے جہاں متعدد کتابیں اردو میں ترجمہ کیں ان میں ایک ڈاکٹری کتاب کا ترجمہ بھی تھا، یہ ترجمہ انہوں نے عربی سے اردو میں کیا تھا اصل میں وہ عربی ترجمہ والی مصر محمد علی شاہ کے حکم سے فرانسیسی زبان سے کیا گیا تھا، اور ۱۲۵۰ھ ۱۸۳۴ء میں چھپا تھا۔ انہوں نے اسے ۱۸۴۷ء میں عربی سے اردو میں منتقل کیا[1]

دہلی کے مشہور بزرگ مولانا عبد السلام نیازی کو طب پر بہت مہارت تھی، اور وہ اس فن میں حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں کے شاگرد تھے[2]

دہلی میں مشاعروں کی طرح داستان گوئی کا سلسلہ بھی رہتا تھا اور مشہور داستان گو قصے اور کہانیاں سناتے تھے۔ میر کاظم علی جنہوں نے قصہ کو داستان بنایا، بادشاہ کو روزانہ داستان سنایا کرتے تھے، انہی کاظم علی کے بھانجہ اور شاگرد میر باقر علی تھے باقر علی دہلی کے رئیسوں اور امیروں کے دیوان خانوں کی زینت بنتے۔ سیٹھ چنا مل، حکیم اجمل خاں، نواب فیض احمد خاں اور نواب ننھے خاں کے دیوان خانوں میں داستان سناتے تھے۔ حیدر آباد، بھوپال، پٹیالہ اور دوسری ریاستوں میں داستان سنانے بلائے جاتے تھے[3]

میر باقر علی نے ہر طرح کی وسیع معلومات بڑی محنت سے حاصل کی تھیں، ہر علم کا انہوں نے باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ استادوں سے باقاعدہ سیکھا تھا۔ آخری عمر میں طب پڑھنے کا شوق ہوا، باقاعدہ طبیہ کالج میں جا کر لیکچر سنتے تھے۔ طبیب بننے کے لیے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ داستان میں علمی رنگ پیدا ہو جائے کیونکہ طب اسلامی کے نصاب میں فلسفہ، ریاضی، ادب، نفسیات، منطق، فلکیات وغیرہ تقریباً سارے علوم کم و بیش

---

[1] طبقات شعرائے ہند ص ۴۷۳

[2] دلی والے جلد ۱ ص ۲۷۵

[3] ایضاً جلد ۲ ص ۳۶۸

داخل ہیں[1]

حکیم اعجاز احمد دہلوی کا کہنا ہے "جب دلی میں طبیہ کالج کھلا تو ہم نے بھی وہاں داخلہ لیا۔ میر باقر علی کی عمر اس وقت ساٹھ پینسٹھ سال کی ہوگی وہ بھی باقاعدگی سے کالج آتے اور ہم لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر طب پڑھتے تھے۔ یہی نہیں انہوں نے امتحان دیا اور فارغ التحصیل ہونے کی سند بھی حاصل کی۔ انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی باقری بیگم کو بھی طبیبہ بنایا وہ طبیہ کالج کی سند یافتہ تھیں"[2]

میر باقر علی گنجینۂ علم تھے۔ ایک ذرا چھیڑیے گھنٹوں بے تکان بولیں گے۔ اسی وصف پر خواجہ حسن نظامی نے انہیں مقرر کائنات کا خطاب دیا تھا۔ محمد فیروز دہلوی کا کہنا ہے "ایک مرتبہ شریف منزل میں حکیم اجمل خاں کے دیوان خانے میں حکیم صاحب کے احباب جمع تھے۔ میرے نانا صاحب کا بیان ہے کہ میر باقر علی اپنے مخصوص انداز میں ہر لفظ کے معنی اور استعمال بتا رہے تھے۔ اچانک حکیم صاحب نے کہا میر صاحب یہ ہن برسنا کیا محاورہ ہے، روزمرہ نہ جانے کتنی بار ہم کہتے ہوں گے لیکن یہ کبھی نہیں سوچا کہ ہن کیا ہے۔ میر صاحب نے نہایت شائستگی سے جواب دیا مسیح الملک آپ کے صدقہ جاؤں میں تو آپ کی خاک پا بھی نہیں، عرض کرتا ہوں ہن ایک سونے کا سکہ ہے جو قطب شاہی بادشاہوں کے زمانہ میں چلتا تھا اور سونے کے سکوں میں سب سے چھوٹا ہوتا تھا۔ عالمگیر نے جب دکن کا قصد کیا تو دلی کے البیلوں نے جانے انکار کیا۔ مگر چونکہ یہ افواہ مشہور ہوگئی تھی کہ دکن میں ہن برسا ہے۔ اس لالچ سے سب بادشاہ کے ساتھ ہولئے۔ پھر کسی نے پوچھا میر صاحب یہ خط طغرا کیا بلا ہے، میر صاحب مسکرائے اور بولے طغرا ایک جانور تھا پرندہ کا نام ہے، جس کی ہم شکل طغرا لکھا جاتا ہے اور یہ بیروں کی مثال ہوتا ہے۔ لفظ طغرا کی ط کو زبر سے پڑھیں تو یہ ملے ہوئے کے معنی دیتا ہے یہ خط ایک پیچیدہ خط ہے جس کو بادشاہ اکثر اپنے فرمانوں میں استعمال کرتے تھے۔

---

[1] دلی کی عجیب ہستیاں ص ۵۲

[2] دلی والے جلد ۲ ص ۲، ۳

میر باقر کا ۱۹۲۸ء میں انتقال ہوا،[1]

دہلی کے حال کے شاعر استاد رسا جو دہلی اسکول کے کلاسیکی شعرا کی آخری صف سے تعلق رکھتے تھے، طب کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کا پورا نام حکیم سید رفیق احمد رسا تھا۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو فوت ہوئے[2]

دہلی میں اس وقت ڈاکٹر تنویر احمد علوی اس روایت کے حامل اور اس سلسلۃ الذہب کی اہم کڑی ہیں، انہوں نے جہاں دارالعلوم دیوبند سے عربی درسی کتابیں پڑھیں وہاں بھوپ اندر طبیہ کالج پٹیالہ سے سند فراغت حاصل کی۔ ان کا شمار اردو کے مشہور محققین اور ناقدین میں ہے، اور متعدد علمی و تحقیقی کتابوں کی تصنیف کا انہیں اعزاز حاصل ہے۔

اردو شاعری میں طب کی سرایت کا یہ عالم ہے اور اس میں طبی اثرات اس قدر رچے ہوتے ہیں کہ وہ شعرا جن کی طب سے کتابی واقفیت نہیں تھی اور جن کا بظاہر اس فن سے کوئی تعلق نہیں رہا، ان کے کلام میں بھی بکثرت طبی اصطلاحیں روایتی طور پر ملتی ہیں، اگر شعرائے اردو کے ان اشعار کو جمع کیا جاتے تو ان کے ذریعے بڑی حد تک طب کی مشہور اصطلاحات سامنے آسکتی ہیں، داغ نے امیر مینائی کی وفات پر جو قطعہ کہا تھا اس کے شعر ہیں[3]؎

کیا کہوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں ۔۔۔ کیا لکھوں تفصیل امراض کثیر
مبتلائے حدت صفرا و تپ ۔۔۔ مورد آزار اسہال و زحیر

ذوق نے کہا ہے؎

تا اطبائے زماں کو ہووے علم طب کے ساتھ ۔۔۔ غور نبض و فکر بحران، نخر الوان و قوام

---

[1] دہلی والے جلد ا ص ۱۶۲
[2] دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۴۴۲
[3] خمخانہ جاوید جلد ا ص ۴۲۷

ناخن وحکاک، الاذع رغوہ وثاقب تنقیل | جب تلک امراض مہلک کا اطبا میں ہو نام
کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم | نبض کی جانوش حنظل دیوے افیون کا مزا
نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ھوالشافی طبیب | کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو ہے بالکل شفا

غالب اور طب

غالب ان شعرا میں ہیں جن کا طب اور طبیبوں سے گہرا تعلق رہا ہے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا، اسلامی نظام تعلیم کے تحت علم طب کی واقفیت ہر تعلیم یافتہ انسان کے لیے ضروری تھی، غالب کی تصانیف اور دوسرے ذرایع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طب کی مشہور کتابوں سے بخوبی واقف تھے[۱] مالک رام نے لکھا ہے ''مرزا غالب کی تعلیم سے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں، ان کی تحریروں میں ہیئت نجوم منطق، فلسفہ، طب، موسیقی اور تصوف کی اصطلاحیں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان علوم میں سے بعض پر گہری نظر رکھتے تھے[۲]

عبدالرزاق راشد مددگار معتمد فینانس دولت آصفیہ حیدرآباد نے ۱۶ فروری ۱۹۳۶ء کو غالب کے حالات کے متعلق جو تقریر لاسلکی کے ذریعہ سے نشر کی تھی اس میں انہوں نے انکشاف کیا تھا کہ ڈاکٹر سید قاسم (پتھر گھٹی حیدرآباد) کے کتب خانہ کی کتابیں دیکھتے وقت طب کی ایک کتاب میری نظر سے گزری، جس کا نام ذخیرہ دولت شاہی ہے۔ اس کتاب کی تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ۲ جمادی الاول ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء کو مصنف نے احمد شاہ بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کی تھی۔ ۶ رمضان کو اسے شاہی کتب خانہ میں داخل کرنے کا حکم ہوا۔ کتاب سے معلوم ہوتا ہے

---

[۱] غالب نامہ ص ۱۵

[۲] ذکر غالب ص ۲۱

کہ یہ غالب کے مطالعہ میں بھی رہی ہے۔ کتاب پر بادشاہ کی مہر کے علاوہ غالب کی
بھی مہر ہے، جس میں غالب کے نام کے علاوہ یہ شعر درج ہے ؎

رضینا قسمت الجبار فینا لنا علم وللجھال مال

یہ پتہ نہیں چل سکا کہ یہ کتاب غالب کے پاس کیونکر پہنچی۔ لیکن اکثر صفحات کے حاشیوں
پر غالب کی تحریریں موجود ہیں۔ بعض میں مصنف سے اختلاف کیا ہے، بعض میں
اس کی معلومات پر اضافہ کیا ہے۔ کہیں کسی مرض کا حال لکھا ہے، کہیں دوا کے استعمال
کے ساتھ پرہیز کے لیے اغذیہ کے نام لکھے ہیں۔ اگر حاشیوں کی تمام تحریروں کو
یکجا کر دیا جائے تو فن طب کا ایک رسالہ ہو جائے[1] فن طب سے غالب کی واقفیت
کے بعض شواہد ان کے خطوں میں بھی ملتے ہیں، لیکن عبد الرزاق کی نظر بر میں احمد شاہ
بادشاہ کا نام یا ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء کی تاریخ میں سے کسی ایک کو غلط ماننا ضروری ہو گا۔
۱۲۳۷ھ میں اکبر شاہ ثانی بادشاہ تھے۔ احمد شاہ محمد شاہ کی وفات پر ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۸ء
میں تخت نشین ہوا تھا۔[2]

غالب کے اشعار میں طب کی اصطلاحیں جس کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ ان
کی مثالیں پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، صرف ایک قطعہ لکھنا چاہوں گا ؎

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوتے

دوسرے شعر میں مسہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل بیان کی ہے جن میں اطبا چلنے
پھرنے کو منع کرتے ہیں۔ یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے۔

غالب نے اپنے خطوط میں اپنے مرضی احوال کی تفصیل جس انداز میں پیش کی
ہے اس سے بھی ان کی طبی واقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ منشی نبی بخش حقیر کو مارچ

---

[1] روزنامہ صحیفہ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۳۶ء

[2] غالب غلام رسول مہر ص ۴۷ و ۴۸

۱۸۵۱ء میں لکھتے ہیں "مجھ کو بھی بہ سبب فصل بہار کے ہیجان خون ہے۔ احتراق کے شدائد بہ نسبت اور دنوں کے زیادہ ہیں، لازم یوں تھا کہ شاہترہ پیتا اور مسہل لیتا مگر کچھ نہیں لے سکا، صرف فصد باسلیق پر قناعت کی اور آدھ سیر خون لے لیا۔"

۹ مارچ ۱۸۵۲ء کو لکھتے ہیں "آگے ایک قولنج کا دورہ تھا اب وجع الصدر شروع ہو گیا ہے" مرزا تفتہ کو ۲۴ مئی ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں "قولنج اور پھر کیسا قولنج شاید کہ پانچ پہر نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا آخر عصارہ ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا۔۔۔۔ گلاب اور املی کا پنا اور آلو بخارہ کا افشردہ اس پر مدار رہا۔" انوار الدولہ شفق کو ۱۵ فروری ۱۸۶۴ء کو لکھتے ہیں "نہ پینس نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ ان سب سے بدتر ایک صورت پُر کدورت یعنی احتراق کا مرض۔" میر غلام بابا خاں کو لکھتے ہیں "پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرہ، ضعف بصارت، ضعف دماغ، ضعف دل، ضعف معدہ" ایک اور خط میں لکھتے ہیں "پاؤں کا ورم حد سے زیادہ گزر گیا ہے مادہ تحلیل کے قابل نہ نکلا، کھولن شروع ہو گئی ہے۔"

غالب کو طب سے اس حد تک شغف تھا کہ انہوں نے خود مختلف بیماریوں کے لیے نسخے تجویز کیے ہیں۔ تفتہ کے نام ایک خط میں منشی نبی بخش کو نسخہ تجویز کرتے ہوئے لکھا ہے "ہمارے شفیق منشی نبی بخش صاحب کو کیا عارضہ ہے کہ جس کو تم لکھتے ہو مار الجبن سے بھی نہ گیا، ایک نسخہ "طب محمد حسین خانی" میں لکھا ہے اور وہ بہت بے ضرر اور بہت سود مند ہے مگر اثر اس کا دیر میں ظاہر ہوتا ہے وہ نسخہ یہ ہے کہ پان سات سیر پانی لیویں۔ اور اس میں سیر ڈیڑھ تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر ملا دیں اور اس کو جوش کریں اس قدر کہ چہارم پانی جل جاوے اس کو پئیں۔ نیز بدل کی حاجت پڑے، وہ بھی اسی پانی میں پئیں۔ روز جوش کروا کر چھنوا کر رکھ چھوڑیں، برس دن میں اس کا فائدہ معلوم ہو گا[1] نواب علاء الدین خاں علائی کو لکھتے ہیں "میاں ایسے

---

[1] تفتہ اور غالب ص ۵۳

موقع میں رائے اطبا میں خلاف کم واقع ہوتا ہے، مرض مشخص، دوا معین، سوء مزاج ساذج نہیں، مادی ہے اور مادہ بارد ہے۔ کوئی طبیب سوائے تنقیہ کے کچھ تدبیر نہ سوچے گا۔ تنقیہ میں سوائے مخرجات بلغم اور کچھ تجویز نہ کرے گا۔ تجویز ہے کہ دو دن کے بعد تنقیہ خالص ہو اور ایارج کا مسہل دیا جائے۔[1] نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں "سنا میں نے کہ پھر اس کو دست آنے لگے، صاحب اندیشہ نہ کرو، جوں جوں یہ بڑھتا جائے گا اور حرارت اس کے مزاج میں آتی جائے گی، ووں ووں یہ حالت رفع ہوتی جائے گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ، اصل خیری، جوارش عود و جوارش مصطگی بنوا رکھو، نہ ہر روز بلکہ گاہ گاہ اس کو چٹا دیا کرو اور خورشہائے ناگوار منع کیا کرو۔"[2]

ایک خط میں لکھتے ہیں "گرمی کا موسم ہے میں جانتا ہوں ان دونوں کو زہر مہرہ کا استعمال مفید ہوگا۔ کبھی کبھی شربت نیلوفر میں گھس کر پلا دیا کریں اور چاٹ لیا کریں بھائی لڑکوں کا گھر ہے۔ شربت نیلوفر، شربت بنفشہ، عرق نعناع کی سکنجبین، عرق کاسنی، عرق بادیان، اسی طرح کی چیزیں گھر میں تیار کر رکھیں۔"[3] انہیں ایک اور خط میں لکھا ہے "نیم کی پتیاں تم پیتے ہو خوب کرتے ہو، یہ کہ اس کو کھا کر ایک بیسنی ٹکیا گھی ڈال کر کھاتے ہو یہ ترکیب عامیانہ ہے۔ ہاں یہ مسلم کہ چنے کی روٹی ان امراض میں اگر غذا ٹھہرا لی جائے اور ایک مدت تک یہ طریق بندھ جائے تو بہت نافع ہے، میں ایک بات تمہیں اور بتاتا ہوں، تم نیم کی مستی پیا کرو، یعنی بعضا نیم رستا ہے اور اس میں سے ایک رطوبت نکل کر جم جاتی ہے اسے نیم کی مستی کہتے ہیں، سبیل اس کی یہی ہے کہ دو پیسے بھر سے شروع کرو اور پانچ ماشہ بڑھاتے جاؤ، جب پانچ تولہ پر آ جاؤ تو ٹھہر جاؤ، بھلا زیادہ نہیں تو بیس دن تو پانچ پانچ پیسہ بھر پیو، پرہیز بدستور

---

[1] غالب کے خطوط جلد ا ص ۳۸۲

[2] ایضاً جلد ۳ ص ۱۰۹۳

[3] ایضاً ص ۱۰۹۷ و ۱۰۹۸

بشنتر چنے کی روٹی کھایا کرو، دوا پی کر مکیا کھانی زاید ہے، چنے کی روٹی کے ساتھ وقت غذا کے گھی بقدر برداشت طبع کھاؤ۔ کیما، توری، خرفہ کا ساگ، بھتوے کا ساگ، کھیرا، ککڑی جس کا قلیہ مرغوب ہو کھاؤ، دیکھو تو یہ ترکیب موافق آتی ہے یا نہیں۔[1]

گوپال تفتہ کو نبی بخش کے بارے میں لکھا ہے۔

"منشی نبی بخش صاحب کو کیا عارضہ ہے کہ جس کو تم لکھتے ہو ماء الجبن سے بھی نہ گیا ایک نسخہ طب محمد حسین خانی میں لکھا ہے اور وہ بہت بے ضرر اور بہت سود مند ہے، مگر اس کا اثر دیر میں ظاہر ہوتا ہے، وہ نسخہ یہ ہے کہ پانی سات سیر پانی لیویں اور اس میں سبز بچھے تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر ملا دیں اور اس کو جوش کریں اس قدر کہ چہارم پانی جل جاوے۔ پھر اس باقی پانی کو چھان کر، کوری ٹھلیاں میں بھر رکھیں اور جب باسی ہو جاوے اس کو پئیں، جو غذا کھایا کرتے ہیں، کھایا کریں، پانی دن رات جب پیاس لگے، یہی پئیں، نبر بد کی حاجت پڑے اسی پانی میں پئیں۔ روز جوش کروا کر چھنوا کر رکھ چھوڑیں، برس دن میں اس کا فایدہ معلوم ہوگا۔[2]

نواب کلب علی خاں والی رامپور کو لکھتے ہیں، "خدا جانے اور طبیب کیا سمجھے ہوں گے کہ کیا تھا میرے نزدیک بہ اشتراک معدہ و قلب یہ مرض طاری ہوا تھا۔ اب آپ کو حفظ صحت کے واسطے گاہ گاہ نارجیل دریائی و جدوار کا استعمال ضرور ہے اور معجون طلائی عنبری تقویت قلب میں مجوزہ حکیم بیر علی خاں مغفور ہے، ورق طلا، عنبر اشہب، عرق کیوڑہ، قند، کثرت اجزا اس ترکیب خاص میں ناپسند، کثیر ال جزا ادویہ نہیں ہیں مفرح بوعلی سینا، خمیرہ مروارید، خمیرہ گاؤ زبان عنبری، ماء اللحم غیر منشی جس میں طیور کے گوشت اور ادویہ مفرحہ مقوی حرارت و برودت میں معتدل، گاہ گاہ سکنجبین دو گلاب پی لیا کیجئے، غذا میں گوشت طیور اکثر بیضہ نیم برشت اکثر، لیکن یہ خیال رہے کہ بیضہ مرغ و لحم طیور

---

[1] غالب کے خطوط جلد ۳ ص ۱۱۲۱

[2] ایضاً جلد ۱ ص ۲۳۰

ایک جلسہ میں تناول نہ فرمائیے. بکری کے گوشت کے ساتھ بیضہ مرغ جائز اور لذیذ اور مرغوب۔ پودینہ کا عرق، چھوٹی الائچی کا عرق ہمیشہ دوا خانہ میں موجود رہے۔ عطریات کے استعمال میں مبالغہ، بعد غذا مباشرت سے پرہیز، شوربائے پاچہ گوسفند مائدہ خاص پر موجود رہے[1] اپنے زمانہ کے طبیبوں سے غالب کے گہرے مراسم تھے حکیم احسن اللہ خاں، حکیم محمود خاں، حکیم غلام اللہ خاں، حکیم غلام رضا خاں، حکیم غلام مرتضیٰ خاں، حکیم محمد حسن خاں، حکیم غلام نجف خاں، حکیم رضی الدین خاں، حکیم سلیم خاں، حکیم آغا جان عیش، حکیم مومن خاں، حکیم امام الدین خاں، حکیم منجھلے (حکیم حسام الدین) وغیرہ سے ان کے خصوصی تعلق کا ان خطوط ہی سے اظہار نہیں ہوتا جو ان میں سے بعض کے نام ہیں. بلکہ دوسروں کے خطوط میں بھی جگہ جگہ ان کا ذکر پھیلا ہوا ہے، غالب نے نواب علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں دہلی کے ان طبیبوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ,, نظری میں یکتا حکیم امام الدین خاں وہ ٹونک، عملی میں چالاک حکیم احسن اللہ خاں وہ کرولی (قرولی) رہے حکیم محمود خاں وہ ہمسایہ دیوار بہ دیوار، حکیم غلام نجف خاں وہ دوست قدیم، صادق الولا، حکیم بقا کے خاندان میں دو صاحب موجود تیسرے حکیم منجھلے،،[2]

منشی بہاری لال مشتاق کا حکیم محمود خاں اور حکیم غلام رضا خاں دونوں کی خدمت میں آنا جانا تھا، اسی واسطے سے وہ غالب کے پاس پہنچے اور شاگرد ہوئے. حکیم محمود خاں کے ہفتہ وار اکمل الاخبار میں مشتاق نے کاتب اور اڈیٹر کے فرائض انجام دیے تھے[3]

غالب حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں تقریباً دس برس رہے. حکیم محمد حسن خاں حکیم غلام مرتضیٰ خاں کے عزیزوں میں تھے. غالب نے مجروح اور علاء الدین خاں کے

---

[1] غالب کے خطوط جلد ۱ ص ۱۲۱۸

[2] ایضاً ص ۳۸۳

[3] تلامذہ غالب ص ۲۵۹

نام خطوط میں وہاں رہنے کا ذکر کیا ہے[1]۔

غدر کا زمانہ دہلی والوں کے لیے بڑی مصیبت اور آزمائش کا تھا۔ شریف خانی طبیبوں کی وجہ سے دہلی کے بہت سے لوگوں کی طرح غالب کو بھی اس سخت دور ابتلا میں بہت فائدہ پہنچا۔ حکیم غلام مرتضیٰ خاں برادر حقیقی حکیم محمود خاں مہاراجہ پٹیالہ کے ہاں طبیب خاص تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے فتح دہلی میں انگریزوں کی مدد کی تھی اور شریف منزل کی وجہ سے بلی ماران کے لیے طے کیا تھا کہ اس کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ ۱۸ دسمبر کو مہاراجہ کے سپاہی اس کی حفاظت کے لیے پہنچ گئے تھے۔ غالب تفتہ کو لکھتے ہیں "حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں رہتا ہوں۔ دیوار بہ دیوار حکیموں کے گھر ہیں جو راجہ نرندر سنگھ والی پٹیالہ کے ملازم ہیں۔ راجہ نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بوقت غارت دہلی یہ لوگ محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں"[2]

"جب دو دن اس طرح بے آب و نان گزر گئے تو تیسرے روز خوش قسمتی سے مہاراجہ پٹیالہ نے حکیم محمود خاں کے خاندانی مکانوں کی حفاظت کے لیے جو سپاہی بھیجے تھے وہ آ پہنچے۔ لوگوں کو جان کا ڈر تھا، وہ کم ہوا تو انہوں نے پانی کے لیے استمداد کیا۔ چنانچہ ابلیس بازار کے سرے تک جانے کی اجازت ملی اور گھر سے ایک ایک دو دو آدمی خم و سبو اٹھائے پانی کی تلاش میں نکلے۔ لیکن میٹھے پانی کے کنویں دور تھے اور وہاں تک جانا موت کو دعوت دینا تھا۔ ناچار ایک نمکین کنویں سے پانی بھر لاتے اور اس سے پیاس کی آگ بجھاتے"[3]

مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں کی وجہ سے مرزا کا گھر تو لوٹ سے محفوظ رہا، لیکن جو

---

[1] غالب غلام رسول مہر ص ۹۵

[2] ایضاً ص ۲۷۱

[3] ایضاً ص ۱۲۱

زیورات اور قیمتی چیزیں ان کے گھر سے کالے شاہ صاحب کے تہ خانہ میں بھجوادی گئی تھیں وہ فتح مند فوج نے کھود نکالیں۔

۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ کو غالب کے بھائی مرزا یوسف نے بڑی کس مپرسی کے عالم میں انتقال کیا۔ مرزا کی حالت اس وقت قابل رحم تھی۔ ایک تو بھائی کی موت کا صدمہ، پھر میت کا انتظام بہت مشکل تھا، نہ کفن کے لیے کپڑا ملتا تھا، نہ مردہ نہلانے کے لیے مردہ شو اور نہ قبر کھودنے کے لیے گورکن۔ اس کے علاوہ اگرچہ فتح دہلی کو ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا شہر میں دو تین آدمیوں کا دوش بدوش چلنا ہی ناممکن تھا۔ شہر سے باہر میت لے جانے کی ہمت کیسے پڑتی۔ لیکن مرزا کے ہمسایوں نے مرزا کی بے کسی پر رحم کیا اور تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہاں بھی حکیم محمود خاں کے مکانوں کی حفاظت کے لیے آئے سپاہی مرزا کے کام آئے۔ پٹیالہ کے سپاہیوں میں سے ایک آدمی آگے آگے چلا اور اس طرح قریب کی مسجد میں دفن کیا۔[1]

شریف خانی خاندان کے تین افراد حکیم محمود خاں، حکیم غلام مرتضٰی خاں اور حکیم غلام اللہ خاں کو مہاراجہ نرندر سنگھ والیٔ پٹیالہ سے ملازمت کا تعلق تھا، حکیم محمود خاں تو دہلی میں رہتے تھے لیکن دوسرے دونوں بھائی پٹیالہ میں مقیم تھے۔ مرزا دس برس تک اس خاندان کے پڑوس میں رہے تھے اور ان کے آپس میں گہرے تعلقات تھے۔ ان حضرات نے کوشش کی کہ مرزا اگر پٹیالہ چلے جائیں تو وہاں اطمینان سے رہیں گے۔ مرزا جانے پر رضامند ہو گئے۔[2] کلیات فارسی میں مہاراجہ نرندر سنگھ کی مدح میں جو قصیدہ ہے وہ غالباً اسی زمانہ میں لکھا گیا تھا۔[3] ان کے خط بنام حکیم غلام نجف خاں سے معلوم ہوتا ہے کہ تنہائی اور بےکسی کے خیال سے وہ پٹیالہ نہیں گئے۔

---

[1] غالب ص ۱۲۴ و ۱۲۵

[2] ذکر غالب ص ۱۰۱

[3] کلیات غالب فارسی، قصیدہ ۵۹ ص ۳۳۷

حکیم غلام نجف خاں دوجانہ چلے گئے تھے۔ غالب کو بھی بلایا کہ یہاں آجایئے۔ غالب نے جواب دیا کہ ٹکٹ کے بغیر باہر نکلنا غیر ممکن ہے۔ پھر میں کیونکر آؤں، دہلی آنے جانے پر پابندی تھی اور انگریزوں نے ٹکٹ چھپوائے تھے جو قیمت سے ملتے تھے اور جن کے بغیر کوئی آجا نہیں سکتا تھا[1]

منشی شیونرائن آرام مالک مطبع مفید خلائق آگرہ نے اخبار آفتاب عالمتاب نکالا تھا اور غالب سے خریدار مہیا کرنے کی استدعا کی تھی۔ یہ ستمبر ۱۸۵۸ء کا زمانہ تھا مرزا نے تفتہ کو لکھا، "ان دنوں میں میرے محسن حکیم احسن اللہ خاں آفتاب عالمتاب کے خریدار ہوئے ہیں[2]۔ منشی شیونرائن کو بھی لکھا تھا، "مسلمان امیروں میں تین آدمی حسن علی خاں نواب حامد خاں، حکیم احسن اللہ خاں، سوان کا یہ حال کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ معہذا یہاں کی اقامت میں تذبذب، خدا جانے کہاں جائیں کہاں رہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں نے آفتاب عالمتاب کی خریداری کرلی ہے"[3]

اس پریشانی کے عالم میں بھی حکیم صاحب نے اخبار کی خریداری قبول کی یہ غالب سے تعلق کے ساتھ ان کے شغف علم اور ذوق کی بات تھی۔

انتقال سے پہلے جیسے ہی غالب بے ہوش ہوئے فوراً حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں کو اطلاع دی گئی۔ انہوں نے تشخیص کی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ تمام کوششیں اور علاج کئے گئے مگر بے سود۔ انہیں ہوش نہیں آیا، اگلے دن ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو انتقال ہوا، انتقال کے وقت حکیم محمود خاں، حکیم غلام مرتضیٰ اور حکیم احسن اللہ خاں موجود تھے[4] بعض لوگوں نے شیعہ مسلک کے مطابق تجہیز و تکفین کرنی چاہی، مگر نواب

---

[1] غالب ص ۲۸۳

[2] تفتہ اور غالب ص ۱۰۴

[3] غالب ص ۲۸۱

[4] احوال غالب ص ۸۷

ضیاء الدین احمد خاں اور حکیم محمود خاں نہیں چاہتے تھے، دونوں صاحبوں کا دہلی میں بہت اثر و رسوخ تھا، خصوصاً حکیم محمود خاں کا، مرزا کی شیعیت اور تفضیلیت کسی سے مخفی نہ تھی لیکن ان دونوں کے سامنے کوئی دم نہ مار سکا اور تمام رسوم اہل تسنن کے طریقہ پر ادا ہوئیں۔[1]

غالب نے اگرچہ تاریخ گوئی سے اپنی عدم دلچسپی کا اظہار کیا ہے لیکن ان کے کلام میں متعدد قطعات تاریخ موجود ہیں، ان تاریخوں میں حکیم احسن اللہ خاں کی حویلی کے دروازہ اور حمام کی فارسی تاریخوں کے علاوہ حکیم سلیم خاں دہلوی کی فارسی کتاب تکشیف الحکمت (تالیف ۱۲۷۸/۱۸۶۱ء) پر اردو میں ان کا ایک قطعہ تاریخ ہے[2]

سلیم خاں کہ وہ ہے نور چشم واصل خاں
حکیم حاذق و دانا ہے وہ لطیف کلام

تمام دہر میں اس کے مطب کا چرچا ہے
کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام

ادے فضایل علم و ہنر کی افزایش
ہوئی ہے مبدأ عالم سے اس قدر انعام

کہ بحث علم میں اطفال ابجدی اس کے
ہزار بار فلاطون کو دے چکے الزام

عجیب نسخہ نادر لکھا ہے اک اس نے
کہ جس میں حکمت و طب ہی کے مسئلے ہیں تمام

نہیں کتاب ہے اک منبع نکات بدیع
نہیں کتاب ہے اک معدن جواہر کام

کل اس کتاب کی سال تمام میں جو مجھے
کمال فکر میں دیکھا خرد نے بے آرام

کہا یہ جلد کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے
لکھا ہے "نسخہ تحفہ" یہی ہے سال تمام

۱۲۷۹ء

غالب کی تصانیف سے طبیبوں کا جو تعلق رہا اور ان کے سلسلہ میں جس دلچسپی کا انہوں نے اظہار کیا، غالب اور اطبا کے رشتہ کے مطالعہ میں وہ بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔

---

[1] ذکر غالب ص ۱۳۳ و ۱۳۴

[2] تکشیف الحکمت، ص ۱۸۸

مہر نیم روز : مرزا ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے تھے انہوں نے امیر تیمور سے ہمایوں تک کے حالات قلمبند کر لئے تھے کہ بہادر شاہ نے حکم دیا کہ تاریخ دنیا کے آغاز سے لکھی جائے اور آیندہ کے لیے احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کو ان کی مدد اور مشورہ کے لیے مقرر کر دیا۔ اب تک مرزا خود ہی کتب تاریخ سے واقعات کا انتخاب کرتے اور انہیں فارسی میں لکھتے رہے تھے۔ اس نئے حکم کے بعد انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ واقعات کا اقتباس و انتخاب کا کام حکیم صاحب موصوف اپنے ذمہ لیں اور اردو مسودہ تیار کر کے میرے پاس بھیج دیا کریں۔ میں اسے فارسی میں منتقل کر دوں گا۔ اس پر حکیم احسن اللہ خاں نے ابتدائے آفرینش عالم و ظہور آدم سے لے کر چنگیز خاں تک کے حالات پر مشتمل مضمون مہیا کر دیا۔ اب کتاب دو حصوں میں تقسیم کی گئی۔ پوری کتاب کا نام پر تو ستان اور پہلے حصہ کا نام مہر نیم روز ہوا۔ اس میں آغاز روزگار سے ہمایوں تک کے حالات لکھے گئے، دوسرے حصہ میں اکبر سے بہادر شاہ تک کے حالات نسبتاً تفصیل سے قلمبند ہوں۔ اس حصہ کا نام ماہ نیم ماہ تجویز کیا، لیکن کام ہمایوں کے حالات تک پہنچ کر رک گیا۔ کیونکہ نہ حکیم احسن اللہ خاں نے اردو مسودہ بھیجا نہ مرزا اسے فارسی میں منتقل کر سکے۔ تیمور سے ہمایوں تک کا مضمون مارچ ۱۸۵۲ء میں ختم ہو چکا تھا۔ جب مضمون حکیم احسن اللہ خاں نے بھیجا تو مرزا نے اس کے شروع میں ایک نئے دیباچہ کا اضافہ کیا اور اس کو فارسی جامہ پہنایا۔ یہ کام بھی جون ۱۸۵۲ء میں ختم ہو چکا تھا، اس کے بعد حکیم صاحب کو عدم فرصت کی وجہ سے تاخیر ہوئی، کسر صرف اتنی تھی کہ چنگیز خاں سے امیر تیمور تک کے حالات لکھے جائیں تاکہ تاریخ کا پہلا حصہ مکمل ہو جائے بارے خدا خدا کر کے مہر نیم روز اگست ۱۸۵۴ء میں ختم ہوئی، اور ۱۸۵۵ء میں فخر المطابع دہلی سے چھپی۔[1]

---

[1] ذکر غالب ص ۱۴۸ تا ۱۵۰

پنج آہنگ : پنج آہنگ کے دیباچہ میں مرزا علی بخش نے لکھا ہے کہ حکیم رضی الدین حسن خاں بہادر نے تحریک کی کہ مرزا کی فارسی تحریروں کو ضرور جمع کیا جائے [۱]

حکیم رضی الدین کی اس تحریک کے علاوہ پنج آہنگ کی تصحیح وترتیب اور طباعت ایک دوسرے طبیب کی مرہون منت ہے. یہ پہلی مرتبہ مطبع سلطانی دہلی سے ۴ اگست ۱۸۴۹ء ۱۳ رمضان ۱۲۶۵ میں حکیم غلام نجف خاں بہادر کی تصحیح وترتیب اور اہتمام سے چھپی تھی [۲]

اردوئے معلیٰ : ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو مرزا کے خطوط کا مجموعہ اردوئے معلیٰ مرزا کے دوست حکیم غلام رضا خاں کے مطبع اکمل المطابع سے چھپ کر شایع ہوا. اس سے ۲۱ روز قبل ۱۵ فروری کو مرزا کا انتقال ہو چکا تھا.

عود ہندی : مرزا کے خطوط کا دوسرا مجموعہ عود ہندی پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی میرٹھ سے مرزا کی وفات سے ۴ ماہ قبل ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو حکیم غلام مولیٰ قلق میرٹھی کی تقریظ کے ساتھ شایع ہوا [۳]

مثنوی ابر گہر بار : ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں مرزا نے حکیم غلام رضا خاں کے اصرار پر انہیں مثنوی ابر گہر بار الگ سے چھاپنے کی اجازت دی. حالانکہ یہ کلیات میں شامل تھی یہ نسخہ اکمل المطابع دہلی سے شایع ہوا. مثنوی کے اس اڈیشن میں ۴۲ صفحے ہیں. بعد میں یہ دوسرے کلام کے ساتھ سبد چین کے عنوان سے اگست ۱۸۶۷ ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ میں مطبع محمدی سے شایع ہوئی [۴]

مآثر غالب :- شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن اخوندزادہ احسن ڈھاکہ کے پاس غالب

---

[۱] ذکر غالب ص ۱۴۵

[۲] ایضاً ص ۱۴۷

[۳] ایضاً ص ۱۴۸

[۴] ایضاً ص ۱۵۸ و ۱۵۹

کے چند فارسی خطوط تھے جو انہوں نے کلکتہ اور ڈھاکہ کے بعض دوستوں کے نام لکھے تھے۔ قاضی عبدالودود نے یہ خط حکیم صاحب کے کتب خانہ سے حاصل کئے اور بعض اور تحریروں اور مفید حواشی کے ساتھ ماثر غالب کے نام سے انہیں شایع کیا۔[1]
غالب پر طبیبوں کے کاموں میں لطایف غالب (۱۹۰۴ء) حکیم محمد حسن حاذق، جہان غالب (۱۹۶۶ء) حکیم کوثر چاندپوری، بیبر غالب (۱۹۶۹ء) حکیم ابوالحسن بیدل فاروقی غالبیات کے سلسلہ کی قابل ذکر کتابیں ہیں۔ غالب کے طبیب شاگردوں کا تذکرہ بھی یہاں دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

۱۔ احسن۔ حکیم مظہر احسن خاں رامپوری
۲۔ اخگر۔ حکیم فتحیاب خاں رامپوری
۳۔ بیمار۔ حکیم محمد مراد علی
۴۔ جوہر۔ حکیم محمد معشوق علی خاں شاہجہاں پوری
۵۔ ذکی۔ حکیم اشفاق حسین مارہروی
۶۔ رنج و طبیب۔ حکیم محمد فصیح الدین میرٹھی
۷۔ شوکت۔ نواب یار محمد خاں بھوپالی
۸۔ شہاب۔ حکیم شہاب الدین خاں رامپوری
۹۔ صوفی۔ حکیم محمد علی نجیب آبادی
۱۰۔ طرزی۔ حکیم سید قطب الدین دلاور علی جعفری ہاپوڑ
۱۱۔ فناو جمالی۔ حکیم سید احمد حسن سہسوانی
۱۲۔ فوق۔ ڈاکٹر مرزا محمد جان اکبرآبادی
۱۳۔ محمود۔ حکیم محمد محمود الحق دہلوی
۱۴۔ نیر۔ حکیم محب علی کاکوری

---

[1] ذکر غالب ص ۱۶۲

غالب اکاڈمی : حکیم عبدالحمید، خواجہ حسن نظامی اور بعض دوسرے ارباب علم وادب نے غالب سوسائٹی کی بنیاد رکھی، جو مرزا غالب کے مزار کی درستی کے علاوہ ایک غالب ہال بھی بنانا چاہتی تھی۔ غالب کے احاطہ مزار کے پاس ایک قطعہ زمین تھا، جسے حکیم حاجی عبدالحمید (خازن غالب سوسائٹی) نے اپنے پاس سے معقول قیمت دے کر خریدا اور غالب سوسائٹی کے حوالہ کر دیا، ایک اور قطعہ زمین بیگم حکیم محمد واصل خاں (برادر کلاں مسیح الملک حکیم اجمل خاں) نے حکیم محمد احمد خاں کی سفارش سے عطا فرمایا[1]

حکیم عبدالحمید بعد میں غالب سوسائٹی کے صدر بنے اور ان کے زیر اہتمام غالب کے مزار سے متصل غالب اکاڈمی قائم کی گئی، اس کی عالی شان عمارت حکیم صاحب نے تعمیر کرائی۔ ۲۱ فروری ۱۹۶۹ء کو غالب صدی کے موقع پر اس کا افتتاح عمل میں آیا۔

غالب اکاڈمی کا غالب پر اعلیٰ تحقیقی کاموں کی وجہ سے ملک کے مؤقر اداروں میں شمار ہے۔ غالب پر بعض اہم تصانیف کی اشاعت یہاں سے عمل میں آئی ہے۔ ہر سال یوم غالب کی تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے، یہ دہلی کی ثقافتی سرگرمیوں کا بھی مرکز ہے، آئے دن اس میں علمی، ادبی اور شعری نشستیں منعقد ہوتی ہیں اور اہل علم جمع رہتے ہیں، غالب کی طب اور طبیبوں سے دلچسپی اور غالب سے طبیبوں کے تعلق کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، یہ اکاڈمی اس شاندار اور دلکش روایت کا ایک حصہ اور ایک طبیب کے ذوق علم وادب اور غالب نوازی کی آئینہ دار ہے۔

دہلی میں عطاری کی روایت

طبابت کی طرح دہلی میں عطاری کی بھی ایک روایت رہی ہے، عام طور پر

---

[1] غالب ص ۳۵۹

طبیب صرف نسخے لکھنے پر اکتفا کرتے تھے۔ مفرد یا مرکب دوائیں ان کے مطبوں میں نہیں ملتی تھیں، اس کی وجہ سے عطاری نے فروغ پایا۔ جس کثرت سے دہلی میں طبیبوں کے مطب تھے اسی کثرت سے عطار خانے بھی قایم تھے۔ عموماً عطاری کا سلسلہ ایک خاندانی پیشہ کے طور پر رائج تھا۔ یہ پیشہ کچھ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہ تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس سے وابستہ تھے۔ یہ عطار عموماً پڑھے لکھے، شایستہ اور نستعلیق ہوتے تھے، حاذق اور نامور طبیبوں سے وابستگی کے سبب ان کی صحبتیں انہیں میسر آتی تھیں۔ شعر و ادب سے ان کے لگاؤ کی بہت سی مثالیں ہیں۔ بعض شاعر عطاروں کا تذکرہ یہاں شوق سے پڑھا جائے گا۔

شاکر

دہلی میں عطاری کے پیشہ سے وابستہ تھے، دہلی کے مشہور شاعر عبدالرحمٰن خاں احسان سے تلمذ تھا، کریم الدین کا بیان ہے کہ "میں نے ان کو مشاعرہ میں جو میرے مکان میں ہوتا تھا، دیکھا ہے، عمر ان کی بالفعل قریب پینتس برس کی ہوگی"[۱]

۱۲ رجب ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء کو کریم الدین کے ہاں مشاعرہ میں انہوں نے جو شعر پڑھے تھے وہ کریم الدین نے نقل کئے ہیں، اس بیان کی رو سے ان کی پیدائش ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء کے آس پاس قرار پاتی ہے۔

کریم الدین کے ہاں ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء کے اس مشاعرہ میں جو دوسرے شعرا شریک تھے ان میں امام بخش صہبائی (طبقات شعرا ص ۴۱۵) مرزا قادر بخش موزوں (ایضاً ص ۴۰۲) مرزا نصیر الدین قناعت (ایضاً ص ۴۰۲) حیدر علی وفا (ایضاً ص ۴۰۳) راحت دہلوی (ایضاً ۴۰۶) یوسف تمکین (ایضاً ص ۴۱۱) صبا دہلوی (ایضاً ۴۱۱) نثار دہلوی (ایضاً ص ۴۱۲)

---

[۱] طبقات شعرائے ہند ص ۴۰۱

یکتا دہلوی (ایضاً ص ۴۱۳) صابرؔ دہلوی (ایضاً ص ۴۱۷) مرزا کریم الدین رسا (ایضاً ص ۴۲۲) نیاز احمد جوشش (ایضاً ص ۴۳۰) قاضی محمد سعید بدایونی (ایضاً ص ۴۴۰) قابل ذکر ہیں۔
صاحب خمخانہ جاوید نے بھی عبد الرحمٰن خاں احسان کے اس عطار شاگرد کا ذکر کیا ہے[۱]

امین الدین امین

قاضی (خواجہ) محمد امین الدین خاں امینؔ نجیب الدولہ کے زمانہ میں دہلی کے قاضی القضاۃ تھے اور مرزا جہاندار شاہ کی سرکار میں دواخانہ کے داروغہ تھے۔ اپنے زمانہ کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ مصحفی کے ہم عصر تھے اور اس کے اکثر مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے[۲] کریم الدین نے اسے مصحفی کا پڑوسی بنایا ہے اور لکھا ہے کہ ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۹ء میں دار الشفا بادشاہی کے داروغہ تھے اور خوش کلام اور نامور شاعر تھے[۳]

کون آتا ہے یہ کس کے پاؤں کی آواز ہے ؎ ہر صدائے پا میں جس کی سو طرح کا ناز ہے

میر صادق علی صادق

میر صادق علی خاں صادقؔ پٹنہ کے باشندہ تھے، اور شاہ دہلی کے دواخانہ میں مامور تھے۔ اسپرنگر نے قائم کے حوالہ سے ان کا تذکرہ کیا ہے[۴]

---

[۱] خمخانہ جاوید جلد ۴ ص ۴۲۹

[۲] ایضاً جلد ۱ ص ۴۴۸

[۳] طبقات شعرائے ہند ص ۳۲۵

[۴] یادگار شعرا ص ۱۶

جعفر علی حسرت

مرزا[1] جعفر علی حسرت ولد ابوالخیر اپنے زمانہ کے مشاہیر شعرا میں تھے، شاہ جہاں آباد کے رہنے والے تھے[2] شیفتہ اور باطن کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ عطاری حسرت کا آبائی پیشہ تھا[3] یہ کچھ عرصہ تک مرزا جہاندار شاہ کی ملازمت میں رہے۔ دیوانہ کے شاگرد تھے۔

حسرت دہلی سے لکھنو منتقل ہوئے انہوں نے والد کے انتقال کے بعد عطاری کی دوکان پر بیٹھنا شروع کیا اور کچھ عرصہ اپنے والد کا پیشہ جاری رکھا۔ نخاس بازار میں ان کی عطاری کی دوکان تھی، لیکن بعد میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء میں انتقال کیا، کچھ قصیدے اور اردو غزلوں کا ایک دیوان چھوڑ گئے[4]

حسرت نے ایک طویل مدت تک مشق سخن کی۔ شاگردوں کی تعداد کثیر ہے، ان کے شاگردوں میں نواب محبت خاں خلف نواب حافظ الملک رحمت خاں اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ انہوں نے شعرا کی اپنے زمانہ میں جس طرح سرپرستی کی ہے وہ اس دور کے کسی امیر کے ہاں نہیں ملتی ہے، نواب محبت خاں کے بارے میں مصحفی نے لکھا ہے کہ وہ زیور فضل و کمال و حلم و حیا سے آراستہ اور علم آداب و طریق سلوک و تہذیب اخلاق میں یکتا تھے[5] شاگردوں کا بھی سلسلہ تھا میر ضیاء الدین عبرت نے ان سے

---

[1] ،، میرزا بقول شورش۔

[2] گلشن ہند ص ۸۴

[3] گلشن بے خار ص ۵۶ گلستان بے خزاں ص ۶۸

[4] متصل اکبری دروازہ، تذکرہ ہندی ص ۸۲

[5] یادگار شعرا ص ۶۱ (بحوالہ سرور دمشقی) [6] تذکرہ ہندی ص ۲۲۱

کسب سخن کیا تھا[1]

حسرت کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔ ان میں خواجہ حسن (تذکرہ ہندی ص ۸۰ گلشن بے خار ص ۵۹) مرزا احمد علی فیض (گلشن بے خار ص ۱۶۰ تذکرہ ہندی ص ۱۸۴) نواب شمس الدولہ قسمت (تذکرہ ہندی ص ۱۹۶) وحشت (گلشن بے خار ص ۲۳۲ تذکرہ ہندی ص ۲۳۳) بینوا (یادگار شعرا ص ۴۱) شجاعت اللہ خاں ثابت (یادگار شعرا ص ۴۹ تذکرہ شعرائے اردو ص ۴۶) قلندر بخش جرأت (یادگار شعرا ص ۵۱ تذکرہ شعرائے اردو ص ۵۲) میر قدرت اللہ خصلت (یادگار شعرا ص ۸۲) قمری لکھنوی (گلشن بے خار ص ۱۶۰) محمد بیگ قناعت لاہوری (یادگار شعرا ص ۱۴۰) گداز (یادگار شعرا ص ۱۴۴) مدحت لکھنوی (گلشن بے خار ص ۱۷۴) قابل ذکر ہیں۔

میر حسن نے حسرت کو فصحائے زماں اور جواہر معانی سے آراستہ لکھا ہے۔ بہ وسیلہ فن شاعری حسن علی خاں بہادر کی سرکار میں سرفراز رہے[2] حسرت کے بیٹے ارمان بھی شاعر تھے[3] صاحب گلشن بے خزاں نے ارمان کو دیار شرق کے مشاہیر میں شمار کیا ہے[4]

حکیم عبدالرحیم

ہندوستانی دواخانہ سے وابستہ رہ کر جنہوں نے اپنی تمام زندگی اور قوت عمل اس کے لیے وقف کی ان میں ایک حکیم عبدالرحیم تھے۔ یہ مدرسہ طبیہ کے مستند تھے

---

[1] گلشن بے خار ص ۱۳۲

[2] تذکرہ شعرائے اردو ص ۶۰

[3] گلشن بے خار ص ۲۲

[4] گلستان بے خزاں ص ۱۷

فن دوا سازی کے ماہر اور صیغہ مفردات و مرکبات پر زبردست عبور رکھنے والے تھے۔ ابتدائی عمر سے آخر تک دواخانہ کی خدمات میں سرگرم کار رہے اور مشاہرہ کی طرف سے بے پروا[1]

میر ضیاء الحسن

میر ضیاء الحسن سر سید احمد خاں کے قریبی رشتہ دار تھے، ابتدا سے ہندوستانی دواخانہ کے دوا ساز رہے ان کی عطاری کی ذاتی دوکان تھی، اسے بند کر کے دواخانہ کی ملازمت اختیار کی تھی۔ نواب اکبر علی خاں نے انہیں دواخانہ میں رکھوایا تھا، ۳۰-۳۲ برس دواخانہ میں ملازم رہے[2]

بشیر الدین احمد نے بلی ماران کے دو مشہور عطاروں جمال الدین اور فیض الحسن کا ذکر کیا ہے جو بلی ماران میں رہتے تھے۔ مرزا سنگین بیگ نے کوچہ رحمٰن میں پنساریوں اور عطاروں کی دوکانوں کی موجودگی کا لکھا ہے[3] یہ محلہ، بلی ماران سے جہاں طبیبوں کی کثرت تھی، قریب ہی واقع ہے۔

حکیم میر انوار احمد

دہلی میں دوا سازی کو بطور فن ترقی دینے میں بہت نمایاں شخصیت میر انوار احمد

---

[1] حیات اجمل (رشید احمد) ص ۱۰۸

[2] ایضاً ص ۱۱۱

[3] سیر المنازل ص ۱۴۱

کی ہے۔ ان کے والد میر فخرالدین ادویہ کی تیاری میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ حکیم محمود خاں، حکیم اجمل خاں اور خاندان شریفی کے دیگر اطبا کی خاص دوائیں ان کے ہاں تیار ہوتی تھیں، میر فخرالدین کے بعد یہ خدمت ان کے صاحبزادہ میر انوار کی طرف منتقل ہوئی۔

میر انوار احمد کو فن دواسازی خصوصاً فن اکسیر اور کشتہ سازی کے دشوار کام میں ماہر خصوصی ہونے کا درجہ حاصل تھا۔ طب یونانی کی دواؤں کو نئے لباس سے آراستہ کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے، ہندوستانی دواخانہ نے یونانی دواسازی کی اصلاح و ترقی کے سلسلہ میں جو خدمت انجام دی ہے وہ بڑی حد تک ان کی کاوشوں کی رہین منت ہے۔ شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں نے لکھا ہے "طب قدیم کے شعبہ ادویات میں سب سے نمایاں کام حکیم اجمل خاں کے معتمد اور تربیت یافتہ میر انوار احمد کے معمل میں ہوا، جہاں خاص دوائیں ہندوستانی دواخانہ کی تیار ہوا کرتی تھیں، میر صاحب نے ایک طبعی استعداد اس فن کی مبدأ فیاض سے پائی ہے، اور حاذق الملک کے شرف صحبت اور سالہا سال کی مشق و مہارت نے ان کو اس درجہ پر پہنچایا کہ ان کے معمل کی بنی ہوئی دوائیں یورپ کی ترقی یافتہ دواسازی کا نمونہ ہندوستان میں پیش کرنے لگیں [1]"

میر انوار احمد حکیم اجمل خاں کے بڑے معتمد اور خاص آدمی تھے، حکیم صاحب کے خاص مجربات اور ہندوستانی دواخانہ کی وہ تمام خاندانی دوائیں جو راز میں رکھنے کی ہوتی تھیں انہی کے ہاں تیار ہوتی تھیں، حکیم اجمل خاں کے مطب میں ان کی دواؤں کا صندوقچہ بہت اہمیت رکھتا تھا، اس کے منتظم بھی میر انوار احمد تھے، وہی صندوقچہ پر بیٹھتے تھے اور ہزاروں روپیہ مہینہ کی دوائیں مفت لوگوں کو تقسیم کرتے تھے۔

میر صاحب ذاتی طور پر بہت فیاض، سیر چشم اور داد و دہش کے آدمی تھے، وہ اپنے

---

[1] حیات اجمل ص ۱۰۲ (رشید احمد)

پاس سے بھی دواؤں کی بڑی مقدار بلاقیمت تقسیم کرتے تھے۔ اجمل خاں کے مطب میں بلاقیمت تقسیم ہونے والی دواؤں میں ان کا حصہ ہوتا تھا۔ جواہر مہرہ، حب جواہر کشتہ طلا اور دوسری قیمتی دوائیں ملنے والوں کو خوشی سے دیا کرتے تھے، حکیم اجمل خاں کا انتہائی ادب واحترام کرتے تھے۔ بڑے نستعلیق شایستہ اور مہذب آدمی تھے۔ دیانت واخلاق کی عام شہرت تھی۔

۱۹۳۶ء میں آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں اس زمانہ کے وائسرائے لارڈ ولنگڈن کو الوداع کہنے دہلی آئے تو حکیم میر انوار احمد کے دواخانہ میں بھی قدم رنجہ فرمایا اور ان کے مرکبات دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ حیدرآباد میں اس دواخانہ کی شاخ کے قیام کی تجویز کو انہوں نے پسند کیا، اور قیام دہلی ہی کے زمانہ میں اپنے دست مبارک سے حکیم میر انوار احمد کو ایک مکتوب کے ذریعہ دواخانہ کے قیام کی صورت میں ہر ممکن مدد کا یقین دلایا۔ نظام کا یہ مکتوب میں نے خود ان کے صاحبزادہ حکیم میر بصیر احمد کے پاس دیکھا ہے۔ وہ بعینہ نقل ہے:"دہلی ۱۲، مارچ ۳۶ء دواخانہ کی ادویہ (یہ مشکل مرکبات ومفوبات)، جو پیش کی ہیں اور جس عقیدت کے ساتھ ان کو تیار کیا تھا اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

یہ سن کر مجھے مسرت حاصل ہوئی کہ تم ارادہ رکھتے ہو کہ تمہارے دواخانہ کی ایک شاخ حیدرآباد میں بھی قایم ہو جائے، لہذا جب یہ وجود میں آجائے گی تو مجھے یقین ہے کہ میری گورنمنٹ اس کی حوصلہ افزائی کرے گی۔ بایں خیال کہ یہ بہت عمدگی اور احتیاط سے تیار کی جاتی ہیں۔ جو خود ادویہ کے رنگ وروغن سے ظاہر ہے، اور دوسری طرف پبلک کو اس سے بہت فایدہ پہنچے گا کہ خود ریاست حیدرآباد میں ایک عظیم الشان یونانی دواخانہ قایم ہو رہا ہے اور جس کی اسکیم پر غور کرنے کے لیے مشاہیر حکما کی کمیٹی حال میں ہوئی تھی، بہرحال "سالیکہ نیکوست از بہارش پیدا"، دکھائی دے رہا ہے، اور میں یونانی ادویہ کا دلدادہ ہوں" فقط آصف سابع۔

چنانچہ ۱۹۳۶ء میں حکیم میر انوار احمد حیدرآباد منتقل ہو گئے اور وہاں اپنا دواخانہ

قایم کیا، یکم صفر ۱۳۵۵ھ (۲۳ اپریل ۱۹۳۶ء) کو ریاست کے چیف سکریٹری نواب کاظم یار جنگ نے نظام کی جانب سے ذریعہ فرمان دواخانہ کا نام "مخزن ادویہ مجیدیہ" رکھا۔ اور ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۶ نظام نے بنفس نفیس اس کا افتتاح کیا۔ میں یہاں چیف سکریٹری کا خط بھی نظام کی طب یونانی سے دلچسپی کے پیش نظر نقل کرتا ہوں، "بخدمت شریف جناب حکیم انوار صاحب دہلوی۔ آپ کو تحریر کرنے کے لیے سرکار کا جو حکم ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

" مجھے یہ معلوم ہونے پر مسرت ہوئی کہ تم اپنے ارادہ کے مطابق اپنے دواخانہ کی شاخ حیدرآباد میں بھی قایم کرنے کی غرض سے یہاں آتے ہو تاکہ یہاں کی مخلوق خدا کو عمدہ ادویہ میسر ہوں، کیونکہ پبلک کو تمہاری تیار کردہ ادویہ پر کامل بھروسہ ہے اس لیے کہ تم نے حکیم اجمل خاں صاحب سے تجربہ حاصل کیا ہے اور ایک زمانہ میں ان کے دست راست سمجھے جاتے تھے، جس کی تصدیق حکیم مقصود علی نے کی ہے اور یہی وجوہ کی بنا پر میں تمہارے کارخانہ کی افتتاح یکم آذر سنہ فصلی آیندہ کو کروں گا جو میرے پوتے مکرم جاہ کی پیدائش کی تاریخ ہے اور دواخانہ کا نام مخزن ادویہ مجیدیہ رکھوں گا کیونکہ میرے پوتے کا عرفی نام مجیدی پادشاہ ہے جو کہ خلیفہ کے نام سے لیا گیا ہے جو کہ رشتہ میں حقیقی نانا ہوتے ہیں۔ اور تمہارے دواخانہ کے لیے کافی گرانٹ مقرر کرنے کے متعلق کارروائی کی جاتے گی، جس وقت یہاں کے شفاخانہ جات کی تنظیم کا مسئلہ طے پاتے گا اور سرکاری صدر یونانی شفاخانہ کی افتتاح میں آیندہ ماہ رجب میں کرنے والا ہوں جو کہ میری پیدائش کا مہینہ ہے "

ریاست حیدرآباد کے خاتمہ کے بعد حکیم میر انوار احمد دہلی واپس آئے، کرنل بشیر حسین زیدی طبیہ کالج اور ہندوستانی دواخانہ کے دہلی ایڈمنسٹریشن کے زیر انتظام آنے کے بعد چیرمین مقرر ہوتے تو انہوں نے ہندوستانی دواخانہ کو جو تقسیم ملک کے بعد تباہی کا شکار ہو گیا تھا از سر نو ترقی دینے کا کام شروع کیا اور اس کے لیے میر انوار احمد کی خدمات حاصل کیں، اور کام کے پہلے مرحلہ میں ان سے

کئی ہزار روپیہ کی مصنوعات نیلام کرا کے دواخانہ کے لیے خریدیں ان مصنوعات کے معائنہ کے لیے زیدی صاحب نے علی گڑھ سے شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب کو بلایا۔ وہ حکیم محمد اسلم صدیقی کے ہمراہ دہلی گئے اور میر صاحب کے تیار کردہ مرکبات کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا۔[1]

۱۹۵۷ء میں میر انوار احمد نے وفات پائی۔ ان کے بیٹے میر بصیر احمد بھی کامیاب دواساز ہیں، اور انہیں یہ ہنر خاندان سے ورثہ میں ملا ہے، عمر کی آخری منزلوں میں ہیں اور صاحب فراش ہیں۔

عطار برادری

طبیبوں کے متعدد خانوادوں کی طرح دہلی میں آج بھی ایک عطار برادری موجود ہے اس کے جد اعلیٰ حکیم محمد عطار تھے۔ جن کا سلسلہ نسب عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیق سے ملتا ہے حکیم محمد عطار نے دہلی میں دواساز کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کیا، ان کے صاحبزادہ حکیم عبدالقادر عطار نظام حیدرآباد کے ہاں دواسازی کی خدمت پر مامور رہے، ادویہ کی تیاری میں انہیں بڑا ملکہ حاصل تھا، ان کے بیٹے حکیم قابل عطار تھے۔ فن دواسازی میں ان کا ثانی نہیں تھا، صیدلہ و فنکلیس کے ماہرین میں ان کا شمار ہے، دہلی کا مشہور کوچہ قابل عطار ان کے نام کی یاد دلاتا ہے، ان کی اولاد میں اکثر لوگ فن دواسازی میں مہارت پیدا کر کے اس پیشہ سے وابستہ ہوئے، اور عطار برادری وجود میں آئی۔ بشیر الدین احمد نے لکھا ہے کہ کوچہ رحمٰن کے قریب کوچہ قابل عطار ہے۔ جو کسی صاحب فن عطار کی یاد دلاتا ہے۔[2] یہاں انہوں نے قابل عطار کو اسم کے بجائے توصیفی معنی میں سمجھا ہے۔

---

[1] شفاء الملک نقوش و تاثرات ص ۳۱

[2] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۲۳۸

اس برادری میں حکیم رضی الدین کے صاحبزادوں حکیم عزیز الدین اور حکیم حبیب الدین نے بڑی شہرت حاصل کی، حکیم عزیز الدین کے بیٹے حکیم محمد مظہر نے قدیم دواخانہ کے نام سے بلی ماران میں دواخانہ قایم کیا، کافی بڑی عمر میں انہوں نے جامعہ طبیہ میں داخل ہوکر وہاں سے بی آئی ایم ایس کیا تھا، راقم سطور کے شاگرد تھے۔ اب ان کے بیٹے حکیم محمد عدیل یہ دواخانہ چلا رہے ہیں۔

حکیم رضی الدین کے برادر نسبتی حکیم حاجی ممتاز الدین نے فراش خانہ میں مشہور دواخانہ بڑے اہتمام سے قائم کیا، ان کے بعد ان کے صاحبزادہ حکیم مصباح الدین نے اسے سنبھالا، حکیم مصباح الدین بڑے شایستہ نستعلیق اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ مطب کا سلسلہ بھی رہتا تھا، آج کل ان کے بیٹے حکیم فیروز الدین دواخانہ کے نگراں ہیں۔ حکیم مصباح الدین کے بھائی حکیم محمد نقی کا کراچی میں مشہور پریس ہے۔

حکیم ممتاز الدین کی بیوی کے چار بھائیوں حکیم اعجاز الدین حکیم منعم الدین حکیم حفیظ الدین اور حکیم قیام الدین نے علاحدہ علاحدہ دواخانے قایم کئے، حکیم حفیظ الدین کے بیٹے حکیم محمد انیس اور حکیم انور انیس کا بلی ماران میں شمسی دواخانہ ہے۔

حکیم رحیم الدین بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے صاحبزادہ حکیم فضل الدین ممتاز طبیب تھے، انہوں نے ۱۹۵۱ء میں کٹرہ ہدو میں صدر دواخانہ قایم کیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے حکیم فیاض الدین نے اسے ترقی دی، آج کل حکیم فیاض الدین کے دوسرے بھائی حکیم شباب الدین اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔

حکیم فیاض الدین کے تیسرے بھائی حکیم ارباب الدین نے ۱۹۸۳ء میں صدر لیبارٹریز کے نام سے کٹرہ ہدو میں ایک یونانی فارمیسی قایم کی ہے، حکیم فیاض الدین کے بیٹے افتخار الدین بھی اس لیبارٹری سے وابستہ ہیں، حکیم رحیم الدین کے دوسرے بھائی حکیم غفور الدین اور حکیم محمد حفیظ الدین کے بھی الگ دواخانہ تھے۔

اسی برادری کے ایک رکن حکیم حمید الدین نے بلی ماران میں یونانی دواخانہ قایم کیا تھا جو اب ان کے بیٹے حکیم ممتاز الدین کی نگرانی میں چل رہا ہے۔

چند مشہور جراح

عطاری کے علاوہ دہلی میں جراحی کا بھی ماہرانہ سلسلہ رہا ہے، حاذق معالجین کی طرح ماہر جراح بھی وہاں ہمیشہ موجود رہے، ان کی مہارت اور مشاقی کے بہت سے واقعات ہیں۔ ان کے پاس مرہم، ضماد، روغن، شیاف، بتی وغیرہ کے کامیاب نسخے ہوتے تھے اعمال جراحت، نشتر، فصد، پچھنا، سینگی، داغ دینے اور جونک لگانے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ جوڑوں کو بٹھانے، ٹوٹی ہڈی جوڑنے اور خراب سے خراب متعفن زخموں کو صاف کرنے اور ٹھیک کرنے کے بڑے گر انہیں معلوم تھے۔ ان کا پیشہ بھی خاندانی تھا۔ عطاروں کی طرح ان میں بھی صاحب حیثیت اور صاحب ذوق ہوتے ہیں۔

بندرابن جراح

عہد اکبری میں جہاں درگ مل، چندرسین، بھیروں اور بہار جیو جیسے ماہر جراح تھے، وہاں شاہ جہاں کے زمانہ سلطنت میں بندرابن جراح بہت ماہر اور نامور جراح کیا جاتا تھا، بادشاہ تک اس کی رسائی تھی۔ ۱۱ رجب ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء کو شاہ جہاں کو حرارت کے ساتھ پیچش اور حبس بول کی تکلیف ہوئی تو بندرابن کے علاج سے اسے فائدہ ہوا اور پیشاب کھل کر آنے لگا لیکن کمزوری بہت تھی، بالآخر یہی علالت شاہجہاں کی موت کا باعث ہوئی[1]

---

[1] اطبائے عہد مغلیہ ص ۶۳ بحوالہ تاریخ ہندوستان جلد ، ص ۲۴ د عمل صالح جلد ۳ ص ۳۴۹

بندہ علی جراح

حکیم الممالک علی نقی خاں کا بیٹا تھا۔ دہلی میں پیدا ہوا۔ مگر مرشد آباد چلا گیا تھا، اور وہاں بہت ماہر جراح خیال کیا جاتا تھا۔ امرا کا معالج رہتا تھا، صولت جنگ (وفات ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۵ء) کا بھی اس نے علاج کیا تھا۔[1]

متر سین ناگر

نیکو سیر ولد محمد اکبر ولد اورنگ زیب کے متوسلین میں تھا۔ ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۸ء میں محمد اکبر نے بغاوت کی تو عالمگیر نے نیکو سیر کو جو شیر خوار تھا اکبر آباد کے قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ اسے متر سین کی امداد ہی سے رہائی نصیب ہوئی تھی، اس نے امیر الامرا حسین علی کے زخم کا بھی علاج کیا تھا، نیکو سیر کی طرف داری ہی کی بنا پر ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء میں مارا گیا، زخموں اور بعض بیماریوں کے علاج میں شہرت حاصل تھی۔[2]

سید فضل علی

سید فضل علی بن میر شاکر علی بن میر کرم علی شاہ جہاں آبادی نے ڈاکٹر پاٹن سے گیارہ برس طب اور جراحی سیکھی تھی۔ یہ دہلی سے لکھنو منتقل ہو گئے تھے، وہاں نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں جراحت میں بڑی شہرت پائی۔ مفید الاجسام کے نام سے ان کی ایک کتاب

---

[1] اطبائے عہد مغلیہ ص ۶۲ بحوالہ سیر المتاخرین ص ۸۲۳

[2] ایضاً ص ۱۶۹ بحوالہ منتخب اللباب جلد ۳ ص ۸۳۷

ہے۔ طب یونانی میں جراحت کے لیے مستعمل دواؤں کا یہ اچھا مجموعہ ہے۔

غلام ناصر جراح

ان کے بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے، لیکن ایک زمانہ سے دہلی میں آباد تھے۔ غلام ناصر دہلی میں پیدا ہوئے، جراحی آبائی پیشہ تھا، یہ حافظ رمضانی جراح کے بیٹے تھے اور خود ذی لیاقت اور اچھے جراح تھے[1] اس فن میں انہیں بڑی مہارت تھی[2] بہادر شاہ ظفر کے ہاں طبقہ جراحان میں داخل تھے، قدرے تحصیل طب بھی کی تھی، مؤدب اور ظریف تھے۔ گلشن بے خار کی تصنیف کے وقت ان کے انتقال کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا، اردو میں شعر کہتے تھے[3]

ایک دم نہیں ہے اس بت خورشید رو کو چین — پھرنے میں جیسے کوکب سیار گرم ہے
جراح ٹانک دینے میں مت کر درنگ تو — اس واسطے کہ زخم مرے یار گرم ہے

ولی محمد طبیب

دہلی میں جراحی کا کام کرتے تھے۔ ذوق کے شاگرد تھے، طبیب تخلص تھا۔[4]

پورن سنگھ پورن

طبیبوں کی علمی صحبت، ارتباط اور مذاق شعر و ادب سے عطاروں اور جراحوں کی طرح

---

[1] یادگار شعرا ص ۱۵ بحوالہ تذکرہ قایم

[2] گلستان سخن ص ۱۸۶

[3] عمدہ منتخبہ ص ۱۹۰ [4] یادگار شعرا ص ۱۱۱ (بحوالہ ذکا)

طب ہندی کے ماہر۔ن بھی متاثر ہوتے بغیر نہیں رہے۔سنسکرت اور کتب ہنود میں مہارت کے ساتھ فارسی اور اردو ادب وشاعری سے ان کا تعلق رہا۔ایسے ہی صاحب ذوق لوگوں میں پورن سنگھ پورن تھے دہلی کے قدیم کایستھ خاندان سے تعلق تھا۔ سعادت یار خاں رنگین کے شاگرد تھے، علم سنسکرت میں استعداد کامل اور طبابت ہندی میں مہارت تمام رکھتے تھے۔ فارسی میں بھی بقدر ضرورت روشن سواد تھے۔ اردو میں اشعار ہیں[۱] سخن شعرا کی تصنیف یعنی ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء سے ۱۰-۱۸ برس قبل یعنی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء کے آس پاس انتقال کیا[۲]

تلسی رام صمیم دہلوی

طب ہندی میں ماہر اور مجربات ویدک کے وسیلہ سے اکثر امراض مزمنہ کے ازالہ پر قادر تھا خصوصاً کشتہ ہائے فلزات کے استعمال میں بڑی مہارت اور علاج جذام اور وجع مفاصل وغیرہ کی تدبیر میں خاص ملکہ رکھتا تھا۔ فارسی سے بقدر ضرورت آگاہ اور کتب ہنود خصوصاً فن موسیقی کی پوتھیوں سے بڑا واقف کار اور صاحب انتباہ تھا[۳] ستار بجانے میں جواب نہیں تھا اردو میں شعر کہتا تھا[۴]

دلی کی طبی عمارتیں اور آثار

دارالشفا: عہد سلطنت کے دلی کے شفاخانوں اور طب اور طبیبوں سے متعلق

---

[۱] گلستان سخن ص ۱۶۴

[۲] سخن شعرا ص ۷۹

[۳] گلستان سخن ص ۳۲۳ [۴] سخن شعرا ص ۲۸۶

عمارتوں کے مقام و آثار کا پتہ نہیں ہے، لیکن شاہجہاں آباد کی پہلی طبی عمارت دارالشفا ہے جس کی تاریخ شاہجہاں آباد کی تاریخ کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔

شاہ جہاں آباد کے قیام کے وقت جہاں ۱۶ اکتوبر ۱۶۵۰ء/۱۰۶۰ھ میں جامع مسجد کی بنیاد رکھی گئی، وہیں تخمیناً ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء ہی میں جامع مسجد کے غربی دونوں کونوں میں شمال کی طرف دارالشفا اور جنوب کی طرف دارالبقا کی دو عمارتیں بھی تعمیر ہوئیں، دارالبقا مدرسہ تھا جس میں معقول و منقول کی تعلیم ہوتی تھی، اور دارالشفا میں مریضوں کا علاج کیا جاتا تھا[1] بادشاہ کی طرف سے طبیب مقرر تھے، اور بیماروں کو بلا قیمت دوائیں ملتی تھیں۔ سرسید نے اپنے زمانہ میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ اب وہ کارخانہ نہیں رہا، بادشاہزادوں نے اس پر مکان بنا لیے ہیں اور رہتے ہیں[2] ان میں شیش محل بعد تک موجود رہا[3]

۱۸۵۷ سے پہلے ان عمارتوں کی حالت خراب و خستہ ہو چکی تھی، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی پاداشں میں انگریزوں نے یہ دونوں عمارتیں منہدم کرادیں اور میدان بنادیا[4] اس طرح یہ دارالشفا جو شاہجہاں آباد کے ساتھ شروع ہوا تھا، شاہ جہاں آباد کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

دارالشفائے یونانی

دہلی میں انگریزی عمل دخل کے بعد شروع سے بدیسی حکومت کی پالیسی صنعت

---

[1] سیر المنازل ص ۱۸

[2] آثار الصنادید ص ۲۸۳

[3] انتخاب ذکار اللہ ص ۹۵

[4] واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۱۱۳

وحرفت کی طرح دیسی علوم کی موافقت میں نہیں تھی، دیسی طبوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا، مغربی علوم اور مغربی طب کی طرف ہندوستانیوں کو راغب کرنے کے لیے ہر سطح پر کوششوں کے باوجود زبردست مزاحمت کا سامنا تھا، طب مغرب کی اشاعت میں سب سے بڑی مشکل طب یونانی تھی، جو ایک بہت جاندار نظام طب کے طور پر صدیوں سے ہندوستان میں رائج تھی، اور یہاں کے لوگوں کا اس پر گہرا اعتماد تھا چنانچہ یہ اسی کا اثر تھا کہ دہلی میں انگریزی عملداری کی ابتدا میں ایک یونانی شفا خانہ کھولنا ضروری سمجھا گیا، یہ شفاخانہ دہلی کی جس تاریخی عمارت میں قایم کیا گیا تھا اس کی تھوڑی تفصیل اس لیے بھی ضروری ہے کہ دہلی کی تعلیمی اور ثقافتی زندگی سے اس کا گہرا رشتہ جڑا ہوا ہے۔

اجمیری دروازہ کے باہر اینگلو عربک اسکول اصل میں مدرسہ غازی الدین خاں تھا جسے غازی الدین خاں فیروز جنگ[1] نے ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء میں بنوایا تھا، اسی مدرسہ میں ۱۸۲۵ء میں حکومت نے ایک علوم مشرقی کا کالج قایم کیا[2] یہ دلی کالج کے نام سے موسوم ہوا اس کے مدرس اول مولوی رشید الدین خاں تھے، جن کے شاگرد مولانا مملوک علی نانوتوی کے فیضان درس سے سیکڑوں نے استفادہ کیا، سرسید احمد خاں، ذکاءاللہ، ڈپٹی نذیر احمد جیسی نامور شخصیتیں یہاں سے نکلیں، یہ کالج اس عمارت میں ۱۸۴۲ء تک رہا۔ ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج نئے اصول پر قایم کیا گیا اور کشمیری دروازہ میں رزیڈنسی کی اس عمارت میں منتقل ہوا جس میں پہلے سرکاری کالج تھا۔ یکم اپریل ۱۸۷۷ء میں

---

[1] غازی الدین خاں فیروز جنگ ثانی خلف نظام الملک آصف جاہ مورث اعلیٰ نظام دکن، ۱۷۴۸ء میں وفات پائی۔

[2] مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق اورینٹل کالج کی ابتدا ۱۸۲۵ء میں نہیں ۱۷۹۲ء میں ہوئی تھی۔ (مرحوم دلی کالج ص ۱۲)

دلی کالج ختم ہوا[1] لیکن مدرسہ غازی الدین کی عمارت علوم مشرقی کے کالج کی تفویض میں رہی، جو طلبہ بورڈنگ ہاؤس کے کام آتی تھی۔ اور ایک علوم مشرقی کا کالج بطور بڑے کالج کی شاخ کے یہاں چندہ سے کھولا گیا، اس کے بعد یہ عمارت پرنسپل سے لے کر اس میں ضلع کلکٹر نے ۱۸۵۷ سے پہلے ایک یونانی دواخانہ کھولا، جس کا نام دارالشفائے یونانی رکھا۔ مغلیہ عہد کے پہلے شفاخانہ دارالشفا کی طرح یہ شفاخانہ، نہ صرف دہلی میں بلکہ ہندوستان کے کسی بھی حصہ میں پہلا یونانی شفاخانہ تھا جو انگریزی حکومت کے ہاتھوں قائم ہوا، اس شفاخانہ میں ایک طبیب مقرر تھا، دوائیں بلا قیمت دی جاتی تھیں اور طلبہ کے کمروں میں مریض رہا کرتے تھے[2] غدر ۱۸۵۷ کے تین سال بعد تک بھی یونانی شفاخانہ یہاں رہا۔ ۱۸۶۰ء میں یہ عمارت پولس کو مل گئی۔ فروری ۱۸۹۰ء میں پولس سے خالی کرا کے یہ عمارت پھر مدرسہ کو دی گئی ہے[3] آگے چل کر اس مدرسہ کو کالج بنانے میں دہلی کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی کوششوں کا خاص حصہ ہے۔

یہاں دہلی میں پہلے ایلوپیتھی ہاسپٹل کا تذکرہ کرنے میں حرج نہیں ہے۔ جامع مسجد سے اسپلینڈ روڈ پر ۱۸۶۸ء میں سول ہاسپٹل (صدر شفاخانہ سرکاری) کی عالیشان اور بہت وسیع عمارت سنگ سرخ کی مغلیہ طرز پر بنائی گئی۔ اس کا صدر دروازہ پائے والوں کے بازار کی طرف تھا، دہلی میں یہ ایلوپیتھی کا پہلا سرکاری ہسپتال

---

[1] ۱۸۷۷ء میں دلی کالج ٹوٹنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کی اہمیت بڑھ گئی اور دلی کالج کا عملہ بھی وہیں منتقل کیا گیا (یادگار غالب ص ۲۸) مگر دہلی کالج کے لیے کوششیں جاری رہیں، ۱۹۲۲ء میں یہ اینگلو عربک کالج کے نام سے قائم ہوا، ابتدا میں انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم تھی بعد میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کلاسیں شروع ہوئیں، ۱۹۴۷ تک اس کا نام اینگلو عربک کالج رہا ۱۹۴۸ سے پھر اس کا نام دلی کالج ہو گیا۔

[2] دہلی کے قدیم مدارس و مدرس ص ۱۲۸

[3] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۵۰۱

تھا۔ ۱۹۰۲ء میں اسی ہسپتال میں عورتوں کے لیے لیڈی ڈفرن ہاسپٹل قائم کیا گیا۔[1]

وکٹوریہ زنانہ ہسپتال ۱۹۰۶ء میں قایم ہوا۔[2]

کیمبرج مشن جو ۱۸۵۰ء میں کوئنز روڈ کی ایک عالی شان عمارت میں قائم تھا، اس کے زیر اہتمام ۱۸۶۴ء میں ایک زنانہ شفاخانہ کھولا گیا، ۱۸۸۴ء میں شفاخانہ کے لیے چاندنی چوک میں ایک شاندار عمارت تیار کی گئی، جس میں بعد میں بنک آف بنگال کھلا، اور شفاخانہ تیس ہزاری کے میدان میں مٹھائی کے پل کے پاس اپنی نئی عمارت میں منتقل ہوا۔[3]

۱۹۱۲ء میں لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج کے قیام کی تحریک شروع ہوئی نواب سلطان جہاں بیگم والیہ ریاست بھوپال نے تیس ہزار اور پھر بیس ہزار روپیہ کے دوگراں قدر عطیے دیے، فروری ۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ نے کالج کا اور ۱۹۱۷ء میں لیڈی چیمسفورڈ نے ہسپتال کا افتتاح کیا، یکم ستمبر ۱۹۱۵ سے اس کالج کا پنجاب یونی ورسٹی سے الحاق ہوا تھا۔[4]

۱۹۱۹ء میں واقعات دارالحکومت کی تصنیف کے وقت تک دہلی میں انگریزی علاج کی تمام سہولتوں کے باوجود یہ حال تھا کہ مصنف واقعات نے لکھا ہے "دلی والے زیادہ تر یونانی علاج کے معتقد ہیں اور میرے خیال میں انگریزی دواخانوں سے بھی زیادہ مرجوعہ یونانی حکیم صاحبوں کا ہے"[5]

انجمن اشاعت علوم

جدید مغربی علوم کی دیسی زبانوں میں تدریس وتعلیم میں سب سے اہم مسئلہ ان

---

[1] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۱۸۱

[2] ایضاً ص ۱۳۹

[3] ایضاً ص ۲۵۱

[4] ایضاً ص ۱۲،۹،۸، [5] ایضاً ص ۱۸۱

زبانوں میں ان علوم کی کتابوں کی عدم دستیابی کا تھا۔ چنانچہ اس امر کی شدید ضرورت محسوس کی گئی کہ ان علوم کی بنیادی اور اچھی کتابیں دیسی زبانوں میں منتقل کی جائیں۔ اس کے لیے ایجوکیشنل کمیٹی کے نام سے ۱۸۲۵ء میں دہلی میں ایک سوسائٹی قایم کی گئی۔ اس سے قبل اسکول بک سوسائٹی کے زیر اہتمام بھی کافی کتابوں کے ترجمے کئے گئے تھے۔ لیکن وہ کتابیں صرف اسکول کے نصاب سے تعلق رکھتی تھیں،

دلی میں ۱۸۴۳ء میں ایک اور سوسائٹی "ورناکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی"، "انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی" قائم کی گئی اس کا مقصد ترجمہ با جدید کتب کی تالیف کے ذریعہ دیسی زبانوں کو ترقی دینا اور ان میں مفید علوم منتقل کرنا تھا، اردو کو علمی زبان بنانے کی یہ پہلی سعی تھی جو خاص اصول اور قاعدہ کے مطابق عمل میں آئی، سوسائٹی کے تراجم اور تالیفات میں درسی کتابوں اور سائنسی، سماجی، تاریخی، ادبی و مذہبی کتابوں کے علاوہ طب کی درج ذیل کتابیں شامل تھیں [1]

۱۔ علم و عمل طب (عربی سے ترجمہ)

۲۔ حفظان صحت

۳۔ عضویات (منافع الاعضا)

۴۔ تذکرہ حکما

۵۔ رسالہ طب

۶۔ رسالہ جراحی

۷۔ حکماء یونان

۸۔ رسالہ طب (دیگر)

اس سوسائٹی کا قیام اگرچہ مسٹر بٹروس کی مساعی سے عمل میں آیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر اے اسپرنگر نے اسے بہت آگے بڑھایا، یہ پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے اور

---

[1] مرحوم دلی کالج ص ۱۳۷

اسٹنٹ سرجن بنگال سروس تھے، اور مسٹر بروس کی جگہ دلی کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا تھا۔ یہ عربی زبان و ادب کے عالم تھے، دلی کے مسلمان شرفا اور اہل علم میں انہوں نے جلد اثر پیدا کر لیا۔ شہر میں وہ بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، انہوں نے شاہان اودھ کے کتب خانہ کی فہرست بھی تیار کی تھی۔

اطبا کی یادگار عمارت

دہلی میں اطبا کی یادگار جو عمارتیں ہیں، ان کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

چھتہ حکیم آغا جان: کلاں محل سے آگے گلی راجان کے پاس واقع اس چھتہ میں حکیم صاحب اور ان کے اعزہ واقربا رہتے تھے۔ اب نہ وہ چھتہ رہا نہ وہ مکین۔ ایک محلہ کی حیثیت ہوگئی ہے۔ بشیرالدین احمد نے چھتہ کا ایک عبرت خیز واقعہ یہ لکھا ہے کہ "اس چھتہ کا ایک لداوی دروازہ تھا۔ اس کی حالت بہت مخدوش ہوگئی تھی۔ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں میونسپلٹی نے اس کو گروایا، چھت اس قدر مضبوط تھی کہ ٹوٹتی نہ تھی اور کدالوں کے منہ پھرے جاتے تھے، عبدالعزیز نامی ایک صاحب ادھر سے گزرے ان کی جو شامت آئی، شیخی میں آکر مزدوروں سے کہنے لگے "ارے میاں تماشہ بنا رکھا ہے۔ لاؤ مجھے کدال دو میں آغا جان کا سرتوڑ دوں"، کدال لے اوپر چڑھ گئے، ایک دو کدال لگائی ہوں گی، چھتہ کا ایک حصہ آن پڑا۔ عبدالعزیز کا نیچے کا دھڑ اس میں ایسا بے طور پھنسا کہ کسی سے بن نہ پڑا کہ انہیں نکال سکیں۔ بلیاں، سامان لانے میں دیر ہوگئی۔ کئی گھنٹہ وہ معلق رہا اور دم نکل گیا۔ گئے تھے حکیم آغا جان کا سرتوڑنے اور خود دام اجل میں گرفتار ہو گئے۔[1]

کمرہ حکیم بوعلی خاں: ۱۸۵۷ء میں لال قلعہ کے اطراف انگریزوں نے جو محلے اور بازار منہدم کرائے ان میں فیض بازار بھی تھا۔ یہ بازار شہر کے شمال کی جانب دہلی دروازہ سے لال قلعہ کے نیچے تک تھا۔ اس میں حکیم بوعلی خاں کا کمرہ بھی تھا جس کو نواب دبیرالدولہ خواجہ زین العابدین احمد خان بہادر مصلح جنگ نے خرید لیا تھا۔[2]

---

[1] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۱۷۲، دہلی کی یادگار شخصیتیں ص ۴۵ [2] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۴۱

گلی حکیم بقا: چاوڑی بازار میں ہے۔ اس کا دوسرا راستہ حوض قاضی پر نکلتا ہے۔ یہ گلی حکیم بقا خاں سے منسوب ہے اور یہاں ان کے خاندان کے جو طبیب رہتے تھے وہ سب آنکھوں کے علاج کے لیے مشہور تھے۔ آج بھی اس میں اس خاندان کے لوگ آباد ہیں[1]۔ شاہ جہاں کے زمانہ میں دلی میں چھتیس محلے تھے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں جن محلوں کا اضافہ ہوا ان میں کوچہ روح اللہ خاں اور کٹرہ سپہ دار خاں کے علاوہ کوچہ بقاء اللہ اور کوچہ قابل عطار بھی تھے[2]۔

کوچہ قابل عطار: کوچہ رحمٰن کے قریب واقع ہے۔ ۱۸۵۷ء میں یہ تباہی میں آیا تھا[3]۔

گلی حکیم جی: چوڑی والان میں واقع ہے[4]۔ ۱۹۱۹ء میں اس میں حکیم احمد علی خاں دوجانہ والے مطب کرتے تھے۔

مدرسہ طبیہ و زنانہ شفاخانہ: اسی محلہ چوڑی والان میں حویلی ڈپٹی محمد سلطان خاں میں مدرسہ طبیہ تھا، جسے حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں نے قائم کیا تھا، اور یہیں حویلی منشی کبیر علی تحصیلدار میں حکیم اجمل خاں کا قائم کردہ زنانہ شفاخانہ اور مدرسہ دائیان تھا[5]۔

مکان حکیم قاسم علی: بازار سیتارام میں مکان حکیم قاسم علی خاں پوربے والے کا صاحب واقعات دارالحکومت نے اس محلہ کی قابل ذکر عمارتوں میں شمار کرایا ہے[6]۔

حکیم قاسم علی خاں حکیم محمود خاں کے شاگرد تھے، اور دلی کے اچھے طبیبوں میں ان کا شمار تھا، ۱۹۱۹ء سے کچھ پہلے انتقال ہوا، ان کے بعد ان کے صاحبزادہ حکیم ہاشم علی خاں نے وہاں مطب شروع کیا، پوربے والے اس وجہ سے مشہور ہوتے کہ ان کے بزرگوں نے ایک محلہ

---

[1] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۱۸۷

[2] عالم میں انتخاب دلی ص ۱۴ [3] غالب نے اس کی بربادی کا ذکر کیا ہے۔ خطوط جلد ۲ ص ۶۸۵

[4] دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۷

[5] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۱۸۸

[6] ایضاً ص ۱۹۱

بسایا تھا جس میں زیادہ تر بوریے والے رہتے تھے[1]

کٹرہ حکیم محسن خاں: دہلی دروازہ کے قریب کوچہ تاراچند میں یہ کٹرہ تھا، حکیم بدرالدین خاں کے ذیل میں امتحان الالبا میں حکیم محسن خاں کا ذکر کیا گیا ہے[2]

کوچہ حکیم حامد خاں: فراش خانہ میں گلی چاہ شیریں یا کوچہ حکیم حامد خاں ہے۔ اسی کوچہ میں حکیم بدرالدین خاں کا مکان اور مطب تھا۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادہ حکیم شجاع الدین خاں اس میں مطب کرتے تھے[3]

گلی حکیم نعیم بیگ: کوچہ فولاد خاں میں واقع ہے[4]

ہمدرد دواخانہ: لال کنواں میں اندر تک اس کی وسیع عالیشان عمارتوں کا سلسلہ ہے، انہی عمارتوں میں ایک شفاء الملک حکیم رضی الدین خاں کا دولت کدہ شفا منزل تھا۔ اسی سے متصل حکیم غلام کبریا عرف حکیم بھورے خاں کا بڑا دواخانہ تھا، اس میں اب شمع دواخانہ واقع ہے۔ شمع دواخانہ کے قریب ہمدم دواخانہ کی عمارت ہے، یہ دواخانہ حکیم عبدالمجید کے ماموں حکیم نور احمد نے قایم کیا تھا، اب یہ ان کے صاحبزادہ حکیم اقبال احمد کی سرپرستی میں ہے حکیم اقبال احمد دہلی کے موجودہ طبیبوں میں صاحب امتیاز ہیں اور ایک عرصہ سے آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی سکریٹری شپ کے فرایض انجام دے رہے ہیں۔

شریف منزل: بلی ماران میں شریف خانی اطبا کا مسکن، متعدد عالی شان عمارات کا مجموعہ، اس کا تذکرہ علاحدہ سے کیا گیا ہے، اسی کے سامنے حکیم اجمل خاں کے ۱۹۰۴ء میں قائم کردہ ہندوستانی دواخانہ کی عمارت ہے جو ۱۹۱۰ء میں تعمیر کی گئی تھی۔

مرزا سنگین بیگ نے دہلی کی تاریخی اور اہم عمارتوں کے بیان میں نامور طبیبوں کی

---

[1] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۱۹۲

[2] امتحان الالبا لکافتہ الاطبا ص ۲۱۹

[3] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۱۹۶

[4] دلی کی یادگار ہستیاں ص ۱۴

حویلیوں اور مکانوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ انزا ہمبیرم خاں سے ذرا آگے بڑھ کر دو راستے ہیں ایک فیض بازار کی طرف جاتا ہے، دوسرے راستہ پر حکیم محسن خاں کی حویلی تھی[1] چھتہ لعل میاں یعنی دہلی دروازہ کے قریب حکیم فضل علی خاں، حکیم فیض علی خاں کی حویلی[2] دریبہ کلاں کے قریب نواب شرف الدولہ کی مسجد کے نزدیک حکیم میر علی ابن حکیم میر حسن کا مکان[3] دریبہ خرد میں حکیم رکن الدین خاں کی حویلی اور اسی سے متصل مالی واڑہ میں حکیم اجیت سنگھ کا مکان تھا[4] اسی طرح حکیم غلام علی خاں، حکیم میاں جان، حکیم ذکاراللہ، حکیم قدرت اللہ، حکیم عزت اللہ، حکیم ثناراللہ، حکیم بوعلی خاں، حکیم بقا خاں، حکیم نامدار خاں حکیم کامدار خاں کی حویلیوں کا اس میں ذکر کیا گیا ہے۔ بشیرالدین احمد کے ہاں دوسری طبی یادگاروں کے علاوہ چرخے والان میں حکیم نواب جان کے مکان کا بھی تذکرہ ہے[5]

طبیبوں کی تعمیر کردہ مساجد و مندر

۱۔ مسجد پیرجی: بارہ دری شیر افگن، قدیم مسجد ہے۔ اسے حکیم محمود خاں کے بزرگوں نے بنوایا تھا[6]

۲۔ مسجد جامن والی: متصل کلاں محل۔ قدیم مسجد ہے۔ حکیم مینا نے بنوائی تھی۔ بعد میں اس کی از سر نو تعمیر ہوئی ہے[7]

---

[1] سیر المنازل ص ۲۸
[2] ایضاً ص ۲۸
[3] ایضاً ص ۳۰
[4] ایضاً ص ۴۰
[5] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۲۴۰
[6] ایضاً ص ۳۱۰ [7] ایضاً ص ۳۱۱

۳۔ مسجد حکیم جی: میٹھے کنویں کی گلی فراش خانہ۔ قدیم چھوٹی مسجد ہے۔[1]

۴۔ مسجد حکیم آغاجان: چھتہ حکیم آغاجان، کوچہ فولاد خاں، پھول کی منڈی۔ قدیم مسجد ہے۔ اسے اہتمام علی خاں کوتوال برادر فولاد خاں نے بنوایا تھا۔ یہ شاہ جہاں کے دربار کا امیر تھا۔ ۱۰۵۶ھ ۱۶۴۶ء میں فوت ہوئے۔ بعد میں حکیم آغا جان نے اضافہ کیا ہوگا اسی لیے ان کے نام سے مشہور ہوئی۔[2]

۵۔ مسجد حکیم شریف خاں: بلی ماران۔ حکیم شریف خاں نے تعمیر کرائی تھی۔ یہ مسجد دومنزلہ ہے اس کے نیچے دوکانیں ہیں۔ حکیم صادق خاں کے زمانہ کا مسجد کے پیش طاق پر یہ کتبہ ہے[3]

شکر خدا بسعی محمد شریف خاں شد طرح مسجدے کہ بود کعبۂ صفا

برخاست چوں ندائے مؤذن خطیب عقل گفتا بجوے سال وے از خانۂ خدا ۱۲۶۱

۶۔ مسجد حکیم مہر علی شاہ: کچا باغ۔ حکیم مہر علی شاہ کی بنائی ہوئی قدیم مسجد ہے۔ صحن مسجد میں کئی قبریں حکیم صاحب کے خاندان کے لوگوں کی ہیں۔ ان میں ایک قبر حکیم صاحب کے مرشد شاہ عبد اللطیف کی ہے۔ قبر کا کتبہ ہے[4]

چو رفت از جہاں شاہ عبد اللطیف ازیں واقعہ خستہ دل شد امیر

بتاریخ آن گفت ہاتف ز آہ علیمؔ سلیمؔ لطیفؔ خبیر

۷۔ مسجد حکیم نامدار خاں و حکیم کامدار خاں: کوچہ چیلان میں ہے[5]

۸۔ مسجد حکیم بو علی خاں: مسجد روشن الدولہ (قاضی زادوں کی مسجد) کے پیچھے سے ترا ہا بیرم خاں کو جو راستہ جا رہا ہے اس پر حکیم بو علی خاں کی مسجد اور حویلی واقع ہے

---

[1] واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۳۱۳

[2] ایضاً ص ۳۱۳

[3] ایضاً ص ۳۱۳

[4] ایضاً ص ۳۱۴

[5] سیر المنازل ص ۲۷

مسجد کی پیشانی پر ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء کا کتبہ نصب ہے[1]

مرتب کرد مسجد، بو علی خاں　　　پے طاعات ارباب معانی
ملایک سال تاریخش بگفتند　　　بنا شد مسجد اقصیٰ ثانی ۱۲۲۶

۹۔ مسجد حکیم سید قدرت اللہ خاں: بلبلی خانہ میں ہے۔ دروازہ کی پیشانی پر یہ کتبہ مرقوم ہے[2]

چو نو گشت این معبد دلکشا　　　بتائید لطف امام الوریٰ
خطیب خرد گفت از سال او　　　زہے مسجدے پر نور خدا ۱۲۰۹

۱۰۔ مسجد متصل حوض قاضی: عہد مغلیہ کی چھوٹی سی مسجد ہے۔ حکیم بقا اللہ کی بنوائی ہوئی دو منزلہ اوپر مسجد نیچے دو کانیں، دس سیڑھیوں کا زینہ ہے[3]

۱۱۔ مسجد حکیم امجد علی: کشن گنج میں حافظ غلام رسول خاں ویرآن نے زمین خرید کر بہ اعانت مسلمانان اسے تعمیر کرایا تھا۔ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں ان کے پوتے حکیم حاجی امجد علی آنریری مجسٹریٹ نے باضافہ زمین نہایت خوبصورت اور شاندار مسجد از سر نو بنوائی۔ غلام رسول ویرآن ذوق کے شاگرد اور پایہ کے شاعر تھے۔ موجودہ دیوان ذوق ویرآن کے قوی حافظہ کا نمونہ ہے جو انہوں نے اپنی یاد سے لکھوایا ہے۔ ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء میں فوت ہوتے۔ ان کی یادگار حکیم امجد علی کا شمار اپنی نیک نفسی اور خلق کی وجہ سے مشاہیر شہر میں تھا[4]

۱۲۔ مسجد ہمدرد نگر: حکیم عبدالحمید بانی جامعہ ہمدرد نے ہمدرد نگر میں بنوائی ہے۔ ۱۹۸۱ء میں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔

---

[1] سیر المنازل ص ۳۳
[2] ایضاً ص ۲۶
[3] واقعات دار الحکومت جلد ۲ ص ۳۳۷
[4] ایضاً ص ۵۰۹

۱۳۔ مندر حکیم اجیت سنگھ اور جیون سنگھ: مالی واڑہ، چھتہ مدن گوپال میں تقریباً ۱۸۰۰ء کا تعمیر کردہ ہے۔ یہ حکیم اجیت سنگھ کی بیٹی تھانی کا بنایا ہوا ہے۔ جیون سنگھ حکیم صاحب کا داماد تھا۔ ۱۹۱۰ء کے قریب بچھواس کا نگراں تھا جوان کی چوتھی پشت میں تھا[1]

[1] واقعات دارالحکومت جلد ۲ ص ۳۶۱

شجرہ خاندان شریفی

ملا علی قاری

ملا علی داؤد

حکیم فاضل خاں — حکیم اجمل خاں اول

حکیم واصل خاں

ان کا سلسلہ دوسرے صفحہ پر درج ہے

حکیم بقا خاں

حکیم وفا خاں

حکیم محمد ذکا خاں — حکیم محمد لقا خاں

حکیم حمزہ علی — حکیم وارث علی خاں

حکیم رستم علی — حکیم فضل علی — حکیم تراب علی خاں — حکیم برکت علی خاں

حکیم امیر علی (لاولد) — حکیم مہر علی — حکیم احمد علی خاں

حکیم ولایت علی — حکیم ولایت حسین — حکیم فیض علی

حکیم الطاف حسین — حکیم شریف حسین — حکیم احمد حسین — حکیم محمد حسین

حکیم لطیف حسین خاں — حکیم احمد حسین خاں — حکیم رحمت اللہ — حکیم حبیب اللہ خاں — حکیم امیر اللہ خاں

حکیم واحد حسین — حکیم التماس حسین — حکیم وحید اللہ — حکیم سعید اللہ — حکیم احسان اللہ

حکیم شاہد حسین

اشتیاق حسین — انتظام حسین — مختار حسین — امتیاز حسین — حکیم عبید اللہ — حکیم محمد اللہ — حکیم احمد اللہ — حکیم انوار اللہ

لاتون حسین

حکیم فاضل خاں

حکیم واصل خاں
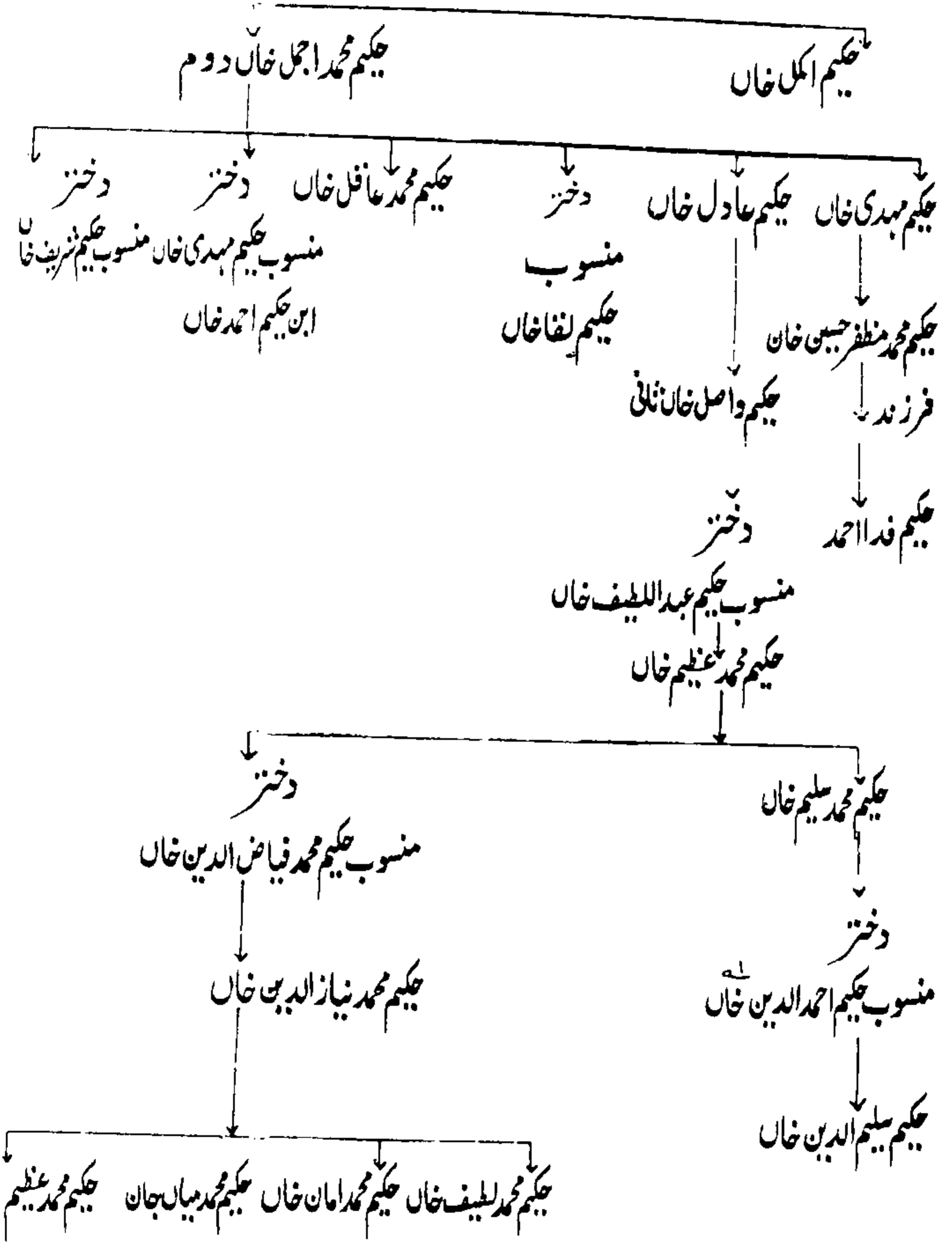
[1] حکیم احمد الدین حکیم عزیز الدین خاں کے بیٹے اور حکیم محمد امان کے پوتے تھے، حکیم محمد امان، حکیم محمد واصل خاں کے داماد حکیم عبداللطیف خاں کے بڑے بھائی تھے ۔

حکیم واصل خاں
حکیم محمد اجمل خاں دوم
(ان کا سلسلہ دوسرے صفحہ پر درج ہے)
حکیم محمد اکمل خاں
حکیم محمد شریف خاں
حکیم محمد سعید خاں
حکیم حسین بخش خاں
حکیم حسن بخش خاں
حکیم عبدالحکیم
حکیم محمد اشرف خاں
حکیم شرف الدین خاں
لاولد
حکیم صادق علی خاں
حکیم امام بخش خاں
حکیم مشرف خاں
حکیم بنر علی خاں
حکیم اسد علی مضطر
حکیم منور خاں
دختر
منسوب حکیم نزاب علی خاں
حکیم عبدالحی
حکیم تجمل حسین
حکیم قائم حسین
حکیم عبدالاحد
ان کے متبنی
حکیم عبدالوحید
حکیم عبداللہ محمد خاں
حکیم عبدالرحمٰن
حکیم عبدالکریم
حکیم عبدالقادر

حکیم محمد شریف خاں
حکیم جیبن بخش خاں
حکیم حسی بخش خاں
حکیم صادق علی خاں
حکیم محمد اشرف خاں
حکیم شرف الدین خاں
حکیم امام بخش خاں
حکیم غلام محمد خاں
حکیم غلام محمود خاں
حکیم غلام مرتضیٰ خاں
حکیم احمد سعید خاں
حکیم غلام رضا خاں
حکیم غلام کبریا خاں
حکیم محمود سعید خاں
حکیم حامد سعید خاں
حکیم غلام اللہ
حکیم غلام نبی
حکیم عبدالعزیز
حکیم غلام رسول
حکیم غلام مصطفیٰ خاں
دختر
منسوب حکیم اجمل خاں
حکیم عبدالحمید خاں
حکیم عبدالصمد خاں
حکیم عزیز الرحمٰن
حکیم محمد واصل خاں
حکیم عبدالمجید خاں
حکیم محمد اجمل خاں مسیح الملک
حکیم محمد احمد خاں
حکیم ظفر احمد خاں
حکیم محمد جمیل خاں
حکیم محمود احمد خاں
حکیم مجید احمد خاں
حکیم محمد نبی خاں
حکیم احمد نبی خاں
حکیم محمد شریف خاں
حکیم بشیر احمد خاں

حکیم محمد شریف خاں
حکیم صادق علی خاں
حکیم غلام محمود
حکیم غلام محمد خاں
حکیم غلام مرتضیٰ
حکیم عبد العزیز
حکیم غلام نبی
حکیم غلام اللہ
حکیم غلام رسول
دختر
حکیم عبد النبی خاں
حکیم عبد الرشید خاں
حکیم عبد الغنی
حکیم غلام کبیر
حکیم زکریا خاں
حکیم احمد کبیر
یوسف کبیر
فرزند
حکیم عبد الرحیم
ڈاکٹر عبد العلیم
حکیم محمد اکمل
اولاد نرینہ نہیں تھی
حکیم ابو الفضل
حکیم ابو الفیض
لاولد
حکیم ابو الحسن
محمد محمود خاں

حکیم محمد شریف خاں
حکیم حسین بخش (عرف حکیم شیّخن خاں)
حکیم خواجہ جان
حکیم آغا جان
حکیم مرزا جان
حکیم نواب جان
حکیم غفار خاں
حکیم فاضل خاں
حکیم نصیر خاں
حکیم احمد جان عرف قاسم جان
حکیم محمد حکیم
حکیم حبیب اشعر
حکیم ہاشم جان کیف
حکیم محمد لئیق خاں
حکیم محمد بشیر خاں
حکیم عاقل خاں
حکیم کامل خاں
دختر
منسوب ابوالحسن
حکیم محمد نظیر
حکیم محمد ظہیر
حکیم محمد نصیر
حکیم محمد ضمیر
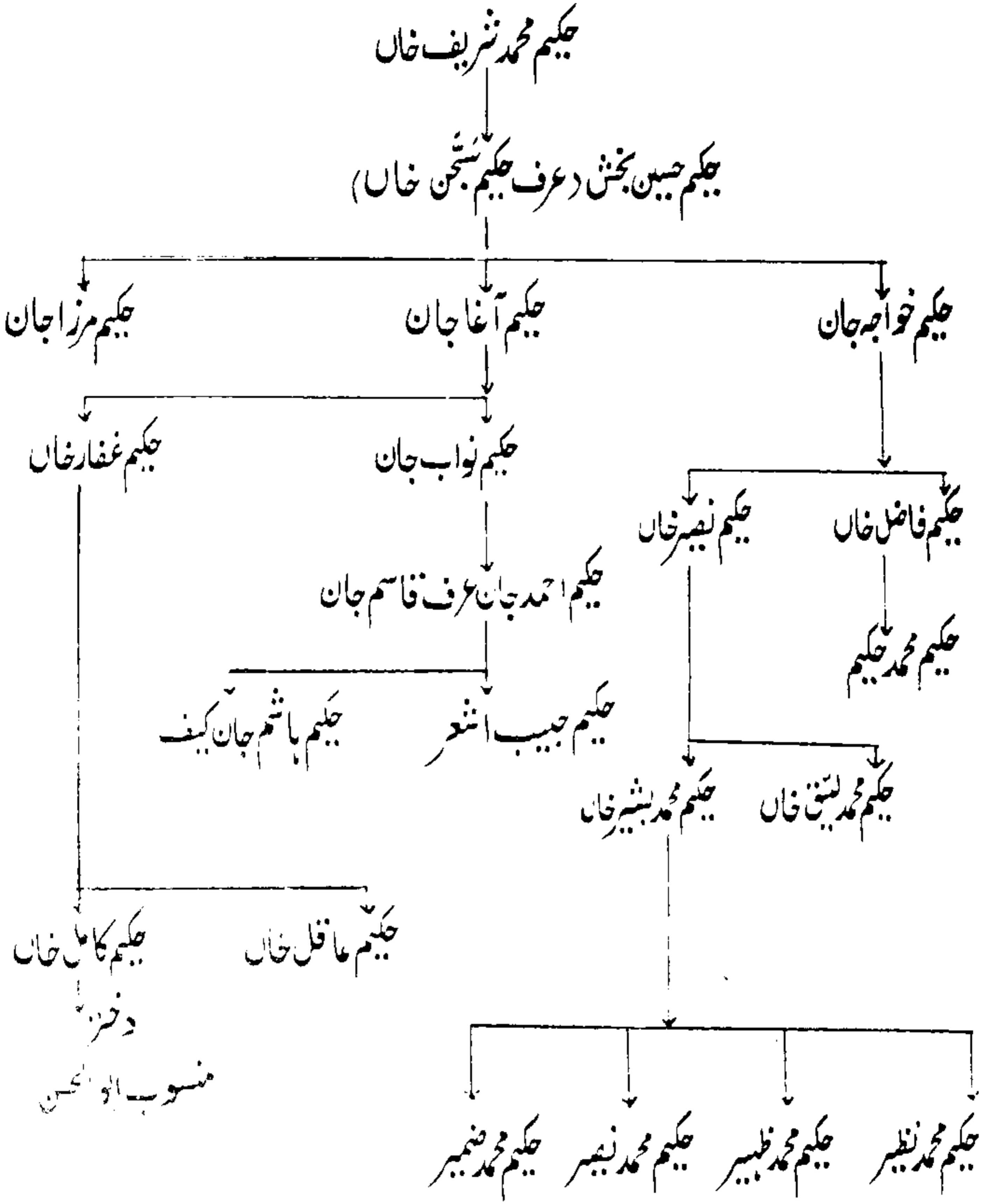
شجرہ خاندان بقائی

کتابیات

آب حیات۔ محمد حسین آزاد۔ عکسی اڈیشن۔ اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۶
آثار الصنادید۔ سرسید احمد خاں۔ سنٹرل بک ڈپو دہلی ۱۹۶۵
۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ۔ عبداللطیف۔ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۸
احوال غالب۔ مختار الدین احمد۔ دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۵۳
اخبار الاخیار۔ شیخ عبدالحق، اردو ترجمہ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۳
اخبار الصنادید۔ حکیم نجم الغنی۔ جلد ۲ نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۸
اسرار شربانیہ۔ حکیم عبدالوہاب انصاری۔ مجبوب المطابع دہلی ۱۹۲۷
اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر، زبیر صدیقی کلکتہ یونی ورسٹی ۱۹۵۹
اطبائے عہد مغلیہ۔ حکیم کوثر چاند پوری۔ ہمدرد کراچی ۱۹۶۰
الواح الصنادید، عطاء الرحمٰن قاسمی مطبوعہ دہلی ۱۹۸۹
امتحان الالباب لکافۃ الاطبا۔ اردو ترجمہ حکیم بدرالدین خاں۔ مطبع مصلح المطابع دہلی ۱۹۰۰
انتخاب ذکاءاللہ۔ اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۳
انتخاب یادگار۔ امیر مینائی۔ تاج المطابع ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹
انشائے مومن۔ حکیم مومن خاں۔ مطبع سلطانی دہلی ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴
اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری۔ ولیم بیل۔ لندن ۱۸۹۴
بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۸۶۷
باغ معانی، نقش علی۔ مرتبہ عابد رضا بیدار۔ پٹنہ اشاعت دوم ۱۹۹۲
بزم تیموریہ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ اعظم گڑھ ۱۹۴۸
بزم خوش نفساں۔ شاہد احمد دہلوی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۵

بزم سخن وطور کلیم۔ سید علی حسن و نورالحسن خاں۔ آرٹ پریس پٹنہ ۱۹۶۸
بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ، خواجہ حسن نظامی، جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۴
پروانہ چراغ مزار خود یم ما۔ مرتبہ شعیب اعظمی، جمال پریس دہلی ۱۹۷۵
تاریخ روابط پزشکی ایران و پاکستان۔ حکیم نیر واسطی۔ راولپنڈی ۱۹۷۴
تاریخ صحافت اردو، امداد صابری جلد ۱۹۵۳،۱ جلد ۱۹۵۳،۲ جلد ۳ ۱۹۶۵، جلد ۴
یونین پریس دہلی ۱۹۷۴
تاریخ فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۸۶۲
تاریخ محمدی۔ معتمد خاں۔ مرتبہ امتیاز علی عرشی جلد ۲ حصہ ۱، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۰
تالیف شریفی۔ حکیم شریف خاں، اکمل المطابع دہلی ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳
تحفۃ الانساب۔ مصباح احمد صدیقی امروہہ ۱۹۹۲
تذکرہ اطباء عہد عثمانی۔ حکیم شفا حیدر آبادی مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۵۲
تذکرہ چمنستان شعرا، لچھمی نراین شفیق۔ تلخیص عطا کاکوی۔ آرٹ پریس پٹنہ ۱۹۶۸
تذکرۃ الخواجگان۔ حکیم احسان اللہ خاں گوبار ۱۹۴۱
تذکرہ ریختہ گویان۔ فتح علی گردیزی۔ مرتبہ عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۳
تذکرہ شعرائے اردو۔ میر حسن۔ اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵
تذکرہ علمائے ہند۔ رحمٰن علی، نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۴
تذکرہ مسیح الملک۔ حکیم محمد حسن قرشی۔ منیر الاطبا لاہور ۱۹۲۸
تذکرہ ہندی، غلام ہمدانی مصحفی، اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵
تفتہ اور غالب۔ محمد ضیاء الدین انصاری۔ غالب اکادمی نئی دہلی ۱۹۸۴
تکشیف الحکمت۔ حکیم محمد سلیم خاں۔ نول کشور لکھنؤ ۱۸۸۵
تلامذہ غالب۔ مالک رام۔ مرکزی تصنیف و تالیف نکودر سنہ ندارد
تزک جہانگیری۔ جہانگیر بادشاہ۔ مرتبہ سرسید احمد خاں غازی پور ۱۸۶۳
الثورۃ الہندیہ باغی ہندوستان۔ فضل حق خیرآبادی ترجمہ عبدالشاہد خاں شروانی

مدینہ بجنور ۱۹۴۷

چراغ دہلی۔ مرزا حیرت۔ اردو اکادمی دہلی ۱۹۸۷

جامعہ کی کہانی۔ عبدالغفار۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۵

حکیم اجمل خاں۔ حکیم کوثر چاندپوری۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۷۳

حکیم آغا جان عیش اور ہریانہ کے مشاہیر۔ بلجیت سنگھ مطہر۔ کابا پبلی کیشنز بہادر گڑھ ہریانہ ۱۹۸۱

حیات اجمل۔ حکیم رشید احمد خاں۔ جید پریس دہلی ۱۹۳۷

حیات اجمل۔ قاضی عبدالغفار، انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۵۰

حیات سکندری۔ دفتر تاریخ بھوپال۔ مطبع شمسی آگرہ ۱۹۱۸

حیات کرم حسین۔ حکیم سید ظل الرحمٰن، لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ ۱۹۸۳

حیات ولی۔ ابو محمد رحیم بخش۔ افضل المطابع دہلی سنہ ندارد

خاندان شریفی۔ حکیم عبدالرحیم خاں۔ مشاہیر الاطبا نمبر دہلی اپریل ۱۹۴۰

خمخانہ جاوید۔ لالہ سری رام جلد ا مطبع نول کشور لاہور ۱۹۰۸ جلد ۲ دہلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۱۱ جلد ۳ دہلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۱۷

داستان غدر۔ ظہیر دہلوی۔ مطبع کریمی لاہور

دریائے لطافت، سید انشا۔ ترجمہ دتاتریہ کیفی مرتبہ عبدالحق اورنگ آباد ۱۹۳۵

دستور الفصاحت۔ حکیم احمد علی یکتا۔ ہندوستان پریس رامپور ۱۹۴۳

دلی کا پھیرا۔ ملا واحدی۔ انجمن کتاب گھر کراچی ۱۹۵۹

دلی کا سنبھالا، خواجہ محمد شفیع دہلوی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۳۸

دلی کی آخری بہار، راشد الخیری، عصمت بک ڈپو دہلی ۱۹۴۳

دلی کی تہذیب۔ انتظار مرزا۔ اردو اکادمی دہلی ۱۹۸۷

دلی کی عجب ہستیاں، اشرف صبوحی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۹

دلی والے۔ صلاح الدین دو جلد، اردو اکادمی دہلی ۱۹۸۸

دہلی کی آخری شمع۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، اسٹار بک ڈپو کلکتہ سنہ ندارد
دہلی کے قدیم مدارس و مدرس۔ امداد صابری۔ کوہ نور پریس دہلی ۱۹۷۷
دہلی کی یادگار شخصیتیں، امداد صابری جمال پریس دہلی ۱۹۸۷
دہلی کی یادگار ہستیاں، امداد صابری، جمال پریس دہلی ۱۹۷۲
دیوان ذوق مرتبہ محمد حسین آزاد۔ علیمی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۳۳
ذکر غالب۔ مالک رام۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۵۵
رسالہ جودیہ۔ ابن سینا، مرتبہ حکیم سید ظل الرحمٰن۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۷۱
رسائل مسیح الملک۔ ترجمہ محمد رضی الاسلام ندوی مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۹۱
رقعات عالمگیری۔ مطبع مصطفائی لکھنو ۱۲۶۲ھ/۱۹۴۵ء
رموز حکمت، حکیم عبدالرحیم جمیل۔ اقبال اسٹیم پریس گجرات، پنجاب سنہ ندارد
رموز الاطبا۔ حکیم فیروز الدین لاہور جلد اول ۱۹۱۵ جلد دوم ۱۹۲۴
روز روشن۔ مظفر حسین صبا گوپاموی۔ مرتبہ عطا کاکوی۔ آرٹ پریس پٹنہ ۱۹۶۸
رؤسائے با اختیار و نامی خاندان پنجاب، کرنل چارلس فرانسیس۔ اردو ترجمہ مطبع اسلامیہ
لاہور ۱۸۹۴
ریاض الفصحا۔ غلام ہمدانی مصحفی، اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۵
سخن شعرا۔ عبدالغفور نساخ، اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۲
سرگذشت مجاہدین۔ غلام رسول مہر۔ کتاب منزل لاہور ۱۹۵۶
سیرت اجمل، حکیم جمیل خاں، ہندوستانی دواخانہ دہلی
سیرت فیروز شاہی۔ مصنف نامعلوم، مخطوطہ مخزونہ خدا بخش لائبریری پٹنہ
سیر المنازل، مرزا سنگین بیگ مرتبہ شریف حسین قاسمی، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۸۲
شفاء الملک، نقوش و نازات، حکیم محمد اسلم صدیقی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۵
طب اسلامی برصغیر میں، خدا بخش لائبریری پٹنہ ۱۹۸۸
طب فیروز شاہی۔ مرتبہ حکیم سید ظل الرحمٰن ہمدرد جامعہ ہمدرد نئی دہلی ۱۹۸۷

طبقات شعرائے ہند۔ کریم الدین، اردو اکاڈمی لکھنو ۱۹۸۳
عالمگیر نامہ۔ محمد کاظم، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۸۶۸
عالم میں انتخاب دلی۔ مہیشور دیال۔ اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۳
علی گڑھ کے طبی مخطوطات، حکیم سید ظل الرحمٰن، خدا بخش پٹنہ ۱۹۸۴
عمدہ منتخبہ۔ میر محمد خاں سرور، ادبی پرنٹنگ پریس بمبئی ۱۹۶۱
عمل صالح۔ محمد صالح کنبوہ، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲
غالب۔ غلام رسول مہر، خواجہ پریس دہلی سنہ ندارد
غالب کے خطوط (چار جلد) مرتبہ خلیق انجم۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۸۴ تا ۱۹۹۳
غالب نامہ۔ شیخ محمد اکرام۔ سورت ۱۹۳۶
قانون ابن سینا اور اس کے شارحین ومترجمین۔ حکیم سید ظل الرحمٰن۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ۱۹۸۶
قرابادین ذکائی، حکیم ذکاء اللہ خاں، مطبع رائے بھوانی پرشاد دہلی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴
کلیات غالب، نول کشور پریس لکھنو ۱۸۷۲
کیٹلاگ آف پرشین مینسکرپٹ ان دی لائبریری آف انڈیا آفس، ایتھے ہرمین، جلد ۱
آکسفورڈ ۱۹۰۳
کیٹلاگ آف عربک اینڈ پرشین لٹریچر۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ
آیرلینڈ، اسٹوری، سی۔ لندن ۱۹۷۱
گلستان بے خزاں۔ قطب الدین باطن، اردو اکاڈمی لکھنو ۱۹۸۲
گلستان سخن، مرزا قادر بخش صابر، اردو اکاڈمی لکھنو ۱۹۸۲
گلشن بے خار، مصطفی شیفتہ، اردو اکاڈمی لکھنو ۱۹۸۲
گلشن ہند، مرزا علی لطف، اردو اکاڈمی لکھنو ۱۹۸۲
گل عجائب، اسد اللہ خاں تمنا اورنگ آبادی، اردو اکاڈمی لکھنو ۱۹۸۵
گنجینۂ گوہر۔ شاہد احمد دہلوی۔ مکتبۂ اسلوب کراچی ۱۹۶۲
گنجینۂ سلیمانی۔ مظفر حسین خاں سلیمانی، مسلم یونی ورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۲۷

لال قلعہ کی ایک جھلک، حکیم ناصر نذیر فراق۔ علمی پریس دہلی ۱۹۴۶

لباب الالباب۔ نورالدین محمد عوفی۔ بریل لائیڈن ۱۹۰۶

لیکچروں کا مجموعہ، ڈپٹی نذیر احمد، مرتبہ بشیرالدین احمد۔ جلد ا مفید عام اسٹیم پریس آگرہ ۱۹۱۸

مآثر عالمگیری۔ محمد ساقی مستعد خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۸۷۱

مآثر الکرام۔ غلام علی آزاد بلگرامی۔ دخانی پریس لاہور ۱۹۱۳

مآثر الامراء۔ شاہ نواز خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۸۹۵

مآثر المسیح۔ ابرار حسین فاروقی۔ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۶

مجمع النفایس۔ سراج الدین علی خاں آرزو۔ مرتبہ عابد رضا بیدار پٹنہ اشاعت دوم ۱۹۹۲

مجموعہ نغز۔ حکیم میر قدرت اللہ خاں قاسم۔ دو جلد۔ ترقی اردو بورڈ دہلی ۱۹۷۳

مختصر سیر ہندوستان۔ حکیم وحید اللہ۔ مطبع دبدبہ جعفری آگرہ سنہ ندارد

مخزن الشعرا۔ نورالدین فایق۔ اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۵

مخزن نکات۔ قیام الدین قایم چاندپوری۔ اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۵

مرات الاشباہ۔ اردو ترجمہ محمد ارتضیٰ خاں مطبع مرتضوی دہلی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸

مرقع دہلی۔ درگاہ قلی مرتبہ خلیق انجم۔ ثمر آفسیٹ پرنٹرس نئی دہلی ۱۹۹۳

مرحوم دہلی کالج۔ عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۳

مزارات اولیائے ہند۔ محمد عالم شاہ فریدی (دو جلد) جان جہاں پریس دہلی ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱

المشاہیر۔ فیض احمد۔ نامی پریس میرٹھ ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸

معارف جمیل۔ آزاد انصاری۔ شمس الاسلام پریس حیدرآباد ۱۹۳۸

منتخب التواریخ۔ عبدالقادر بدایونی۔ نول کشور لکھنؤ ۱۲۸۴ھ/ ۶۶

مومن اور مطالعہ مومن۔ عبادت بریلوی۔ خواجہ پریس دہلی ۱۹۷۵

میخانہ درد۔ حکیم ناصر نذیر فراق۔ جید برقی پریس دہلی ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵

نذر حمید۔ مالک رام۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۱

نزہتہ الخواطر۔ حکیم سید عبدالحی حسنی جلد ۵۔۶۔۷۔ ۸ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۹۵۵ تا ۱۹۷۰
نقش حیات۔ حسین احمد مدنی (جلد ۲) الجمعیتہ پریس دہلی ۱۹۵۴
نکات الشعرا۔ میر تقی میر۔ اردو اکاڈمی لکھنو ۱۹۸۴
واقعات دارالحکومت۔ بشیرالدین احمد (تین جلد) عکسی اڈیشن اردو اکاڈمی دہلی ۱۹۹۰
وفار حیات۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ مسلم یونی ورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۲۵
ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ مناظر احسن گیلانی۔ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۴۶
ہفت اقلیم۔ امین احمد رازی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۹۶۷
یادگار شعرا۔ اسپرنگر، ترجمہ طفیل احمد۔ اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۵
یادگار ضیغم۔ عبداللہ خاں ضیغم۔ مطبوعہ ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶
یادگار غالب۔ الطاف حسین حالی، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۸۶
یہ تھی دلی۔ طالب دہلوی۔ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۷۵
یہ دہلی ہے۔ سید یوسف بخاری۔ اشاعت اول مکتبہ جہاں نما دہلی ۱۹۴۴ دوم ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۳

اجمل میگزین دہلی فروری ۱۹۳۶ (جلد ۳ نمبر ۲)
اردو سہ ماہی غالب نمبر کراچی ۱۹۶۹
ایوان اردو نئی دہلی جون ۱۹۸۸
جامعہ ملیہ میگزین دہلی ۱۹۶۷
عمدۃ الاخبار بھوپال جلد ۱ شمارہ ۱۵۔ ۲۸ جون ۱۸۷۱
یادگاری مجلہ علم الادویہ پر پہلا قومی سیمینار اعظم گڑھ ۱۹۹۳